

PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222901

UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. 191 P. 2. 0.

Accession No. 614

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

مستعار لے کر ان سے استفادہ کیا گیا۔ بعض اخباروں کے صرف متفرق پرچے ہی ہاتھ آسکے، میں سمجھوں گا میری محتات سپہل ہوئی اور میری کوشش مقبول ہوئی اگر کسی بہتر و سایل اور قابلیت کے اہل وطن کو اس سے اس موضوع کو آگے لے جانے کا شوق پیدا ہو جائے۔ ہمارے ملک میں کوئی کتب خانہ اردو کے صحایف و جرائد یعنی موقت الشیوع لترویجہ کا نہیں۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی صاحب یا منظم جماعت ایک ایسا کتب خانہ قائم کرنے کا عزم بالجزم کریں۔

آج کل سنہ ۱۹۳۴ ع ہے۔ میں نے جو نصف صدی کی قہد لگائی ہے اس میں سنہ ۱۸۸۳ ع تک کے اخبار آتے ہیں۔ اس لئے میرا دل بہت کڑھا جب مجھے سنہ ۱۸۸۵ ع اور اس کے بعد کے اخباروں کو اس مضمون سے خارج کرنا پڑا۔ یہ زمانہ نسبتاً حال کا ہے اس کے تاریخی کوائف فراہم کرنے میں اتنی دقتوں کا سامنا نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی اہل ہمت یا یہ ناچیز ہی کبھی یہ خدمت بھی انجام دے سکے۔ اب اردو صحافت کی مختصر اور اجمالی تاریخ کے ساتھ اکثر اخباروں سے اقتباس مع ان کی تاریخ اجرا وغیرہ کے پیش کئے جاتے ہیں۔ امید کہ ہماری صحافت کے باغ کے رنگارنگ گل بوٹوں کی سیر سے آپ معظوظ ہوں گے۔ اور معترف ہوں گے کہ اس دور دراز کے زمانے میں اور اُس کم مائیگی اور بے سروسامانی کے باوجود سلاف نے واقعی صحافت کی داد دی۔

اب تک کی تحقیقات سے یہ پایا جاتا ہے کہ سنہ ۱۸۳۵ ع میں شمالی ہند کی دفتری زبان فارسی سے اردو ہوئی اور سنہ ۱۸۴۲ ع سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے لگیں۔ اردو کا پہلا اخبار جیسا کہ اب تک دریافت ہوا ہے سنہ ۱۸۳۶ ع میں

دہلی سے جاری ہوا - اس کا نام تھا 'اردو اخبار' یہ اخبار شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے نکالا اور سنہ ۱۸۵۷ ع تک خوب چلتا رہا۔ اس اخبار نے پرچے اب بہت ہی کمباب ہیں۔ علی نقطہ نظر سے اردو اخبار اور اس کے مطبع کو اشاعت خیالات تربیت راع عامہ اور طباعت کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل ہے - ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۴۳ ع کے 'سراج الاخبار' سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن دنوں یعنی سنہ ۱۸۳۳ ع میں مولوی محمد باقر نے ایک اور اخبار بھی نکالا تھا جس کا نام 'مظہر حق' تھا۔ اس کا ذکر سراج الاخبار کی مذکورہ اشاعت میں "خبر اخبار جدید" کے عنوان کے نیچے آیا ہے - یہ اخبار 'مظہر حق' اردو میں تھا۔ اس کی عمر کی مدت معلوم نہ ہو سکی —

اردو کے دوسرے اخبار کا نام 'سید الاخبار' ہے - یہ اخبار سر سید احمد خاں مرحوم کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے سنہ ۱۸۳۷ ع میں دہلی سے نکالا تھا۔ لیکن عین شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ اخبار کچھ دن سر سید احمد خاں نے چلایا لیکن پھر وہ اور کاموں میں مصروف ہو گئے اور اخبار بند کر دیا گیا۔ ۱۴ اگست سنہ ۱۸۴۳ ع کے 'سراج الاخبار' سے پایا جاتا ہے کہ کم سے کم اس تاریخ تک یہ اخبار زندہ تھا - 'سراج الاخبار' آپ کو معلوم ہے قلعہ کا فارسی اخبار اور بادشاہ دہلی کا ایک قسم کا روزنامہ تھا - اس کی اشاعت مذکورہ میں ایک خط ابوالقاسم کی طرف سے شایع ہوتا ہے جو اس نے سراج الاخبار کے مہتمم یعنی اڈیٹر سید اولاد علی کو بھیجا تھا - یہ اس تلمیح پر روشنی ڈالتا ہے - (ترجمہ ملاحظہ ہو) :-

" بندہ گنہگار ابوالقاسم کا القاسم سید اولاد علی صاحب کی

خدمت میں یہ ہے کہ میر سید محمد خاں بہادر جو مطبع

’سیدالاحبار‘ کے مالک اور بزرگ اور بزرگ زادہ ہیں آپ کی تصویر دیکھ کر غریب خاتہ پر تشریف لائے - اور فرمانے لگے کہ میں نہیں جانتا کہ عبدالغفار خان نے کس اخبار میں خدام مہتمم ’گیتی نما‘ کی شان میں بے ادبی سے لکھا ہے - یہ اسی سے دریافت کیا جائے - اور اگر اخباروں کے لکھنے پر ایسا گمان کیا جائے تو اس میں سید عبدالغفور کا قصور نہیں کیونکہ ’سیدالاحبار‘ کا طرز ایسا نہیں ہے“ —

اس سے یہ صاف ثابت ہو گیا کہ سنہ ۱۸۴۳ ع کے اگست تک سید محمد خاں اور ان کا ’سید اخبار‘ زندہ تھے - دوسری بات یہ پائی جاتی ہے کہ اسی زمانے میں کوئی اخبار ’آئینہ گیتی نما‘ کے نام سے بھی نکلتا تھا اور غالباً اس کا مالک یا سرپرست شاہی خاندان کا کوئی ممبر تھا جس کی شان میں کہیں گستاخانہ کلمے لکھ گئے تھے - کیونکہ اس خط میں یہ الفاظ آئے ہیں :- ”در کدام اخبار نسبت بہ خدام مہتمم آئینہ گیتی نما کلمہ سوء ادبی نوشتہ اند“ - اس سے واضح ہوتا ہے کہ آئینہ گیتی نما کا مہتمم خاص ممتاز حیثیت رکھتا تھا —

سمجھنے اور سمجھانے کی آسانی کی غرض سے زمانہ زیر سلوک کو میں

نے تین حصوں پر تقسیم کیا ہے :-

۱ - ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک

۲ - سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک

۳ - سنہ ۱۸۷۰ ع سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک

کوشش ہو گی کہ ہر عہد کے بعض نامی اخباروں سے جستہ جستہ اقتباس

پیش کیے جائیں - جو نوعیت اور موضوع کی قید سے آزاد ہوں گے - ہر

دور کے آخر میں تبصرے کی طور پر مختصر نوٹ دئے جائیں گے تاکہ آپ کو رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

تاکہ مغالطہ کا محل باقی نہ رہے یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ کئی اخبار اپنے ماسبق کے ہنگام بھی ہیں۔ قدیم 'اردو اخبار' کی نسبت آپ ابھی سن چکے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۷ ع میں بلد ہوا۔ اسی نام کا ایک اخبار دہلی ہی سے ۱۸۷۱ ع میں نکلتا شروع ہوا۔ اس کا نام بھی 'اردو اخبار' ہی تھا دہلی کے اضافہ کے ساتھ۔ یعنی "اردو اخبار دہلی"۔ یہی حال 'سٹیر ہند' وغیرہ ناموں کا ہے۔

اردو کا تیسرا اخبار 'فوائد الناظرین' ہے۔ یہ اخبار ریاضی کے مشہور عالم اور محقق و موجد ماسٹر رام چندر نے سنہ ۱۸۴۶ ع میں دہلی سے نکالا۔ اس میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مقامات وغیرہ کے نقشے بھی ہوتے تھے جو اب تک اور کہیں معدوم تھے۔ اس کی ایک جلد میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ اخبار ماسٹر صاحب کے مطبع دارالعلوم دہلی میں چھپتا تھا۔ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس میں نقشہ اور سائنٹیفک مضامین کے علاوہ بعض علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دستی تصویریں بھی ہوا کرتی تھیں اور ان امور کے لحاظ سے اس اخبار کو اولیت کا امتیاز حاصل ہے۔

اسی سنہ ۱۸۴۶ ع میں ایک اور اخبار دہلی سے جاری ہوا اس کا نام 'قرآن السعدین' تھا۔ گوالیار کے معزز و مشہور کرنل سر کھلاس نرائین ہاکسر کے دادا پلڈت دھرم ناراین (بعد میں رائے بہادر سی۔ ایس۔ آئی) مولانا صہبائی کے تلمیذ رشید نے یہ اخبار نکالا تھا جو بارہ برس تک چلتا رہا۔

موجودہ وسائل تحقیق کی رو سے اردو کا پانچواں اخبار 'اسعد الاخبار' ہے۔ اس کی اشاعت ۷ مئی سنہ ۱۸۲۷ع سے شروع ہوئی۔ آگرہ سے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ کوئی صاحب قوالدین پھلتی بازار آگرہ سے نکالتے تھے۔ تقطیع ۱۳ × ۹ تھی اور قیمت آٹھ آنہ مہینہ بلا متوصل ڈاک۔ پتا چلتا ہے کہ ۱۱ اگست سنہ ۱۸۵۱ع تک یہ اخبار ضرور جاری تھا۔ دیوان تفتہ کی جلد اول اسی اخبار کے مطبع سے نومبر ۱۸۴۹ع میں شایع ہوئی تھی۔

۲۰ نومبر ۱۸۲۸ع کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے جو انہوں نے لارڈ دہلوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا:۔

لارڈ دہلوز است رونق بخش ہند ۱۷ صبا در شش جہت میں مؤدہ گو
مصرع تاریخ مقدم گنت 'مہر' افتخار ہند بادا نجم تو
۱۸ ع ۲۸

۲ مارچ سنہ ۱۸۳۹ع کی اشاعت میں مرزا غالب کی پلج آنگ کا اشتہار ایک لمبی نظم میں درج ہے۔ یہ کتاب شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خان کے توسل سے قلعہ دہلی کے مطبع سلطانی مہر چھپی تھی۔

اس اخبار سے ایک اقتباس اور لیا جائے گا۔ یہ غالب کے خطاب سے متعلق ہے جو انہیں حضرت بہادر شاہ کے دربار سے عطا ہوا۔ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۵۰ع کے اسعد الاخبار میں یہ خبر درج ہے:۔

"ان دنوں شاہ دین پٹا نے جناب ملے القاب مرزا اسد اللہ خان غالب کو یہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالنعل پنجاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آیلدہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ خطاب

دے کر چہہ پارچہ کا بھش بہا خلعت اور تین * رقم جو اہر عطا فرمائے۔
یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متعین عبارت میں
لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہو گا۔“

دہلی میں ایک شاہی مہر کن تھے - شہر میں ان کا نام بدرالدین
مشہور تھا۔ لیکن ۹ دسمبر ۱۸۵۰ ع کا اسعد الاخبار انہیں بدرالدین علی خاں
لکھتا ہے - ملکہ وکٹوریہ کی فرمائش پر انہوں نے دو مہریں کئدہ کیں
ایک ملکہ معظمہ کے نام کی اور دوسری ان کے رفیق زندگی پرنس البرٹ
کے نام کی - اخبار مذکور سے وہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو ان
مہروں پر کھودے گئے - دیکھئے انگریزی اور لاطینی الفاظ کا ترجمہ کس
خوبی سے کیا ہے :-

۱ - ”شہنشاہ سلیمان جاہ کیواں بارگاہ خاقان اادھر سلطان البصر
مورد الطاف ایزد رحمان بادشاہ انگلستان و ایرلند
و فرمانفرمائے ملک ہند ناموردین مسیحکا ملکہ و کتوریہ
۲ - ”الموئید بتائید الہی فخر خاندان شہنشاہی برنسوک
انیس معزز ملکہ معظمہ رفیع القدر والا شان سر آمد بارگاہ
انگلستان البرٹ فرانسس اکسس چارلس ایمان دل -“

سنہ ۱۸۵۰ ع میں کوہ نور کا ظہور ہوا - یہ پنجاب کا اولین اخبار
ہے - اس کو نئے طرز کا پہلا اخبار کہا گیا ہے - منشی ہر سکھہ رائے
سکندر آباد (مضامات دہلی کے رہنے والے تھے - انہوں نے ۱۸۵۰ ع کے شروع
میں لاہور میں یہ اخبار جاری کیا - اس سال کے اختتام پر اس کے
خریداروں کی تعداد دو سو ستاون تھی - خریداروں اور چاندے کی

وصولی کی فہرستیں وقتاً فوقتاً اخبار میں چھپا کرتی تھیں۔ چنانچہ سر جان لانس، 'لنٹنٹ انس'، مسٹر میکلوٹ، مسٹر سلیمین اور مسٹر میگریگر وغیرہ اعلیٰ انگریز افسروں کے نام ایسی فہرستوں میں ملتے ہیں پایا جاتا ہے کہ اس اخبار کی خریداری مدراس، بمبئی اور کلکتہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۸۳ ع میں یہ اخبار ہفتہ وار سے روزانہ ہو گیا لیکن پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ یہ واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ سنہ ۱۸۵۸ ع میں یا اس تک مشہور ہندو منشی نول کشور 'کوہ نور' کے عملے میں کام کرتے تھے۔ لاہور کے تین اخباروں کی ادارت سے جتنے علما اور ادیبوں کو وابستگی رہ چکی ہے اُنہی لکھنؤ کے 'اودہ اخبار' کے سوا شاید کسی اخبار کو نصیب ہوئی ہو۔ یعنی 'کوہ نور'، 'پیسہ اخبار' اور 'زمیندار' کوہ نور کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہندو مسلمان اور عیسائی اديتروں کے ہاتھوں میں رہا۔ (چنانچہ نادر علی شاہ تاج الدین - منشی نول کشور، مرزا موحّد منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی وغیرہم اصحاب اس کی ادارت کے کفیل رہ چکے ہیں۔

خدا معلوم کوہ نور کے نام میں کیا جادو تھا کہ اس کی پیدائش کے بعد بہت سے اخبار ایسے نکلنے لگے جن کے نام نور سے ترکیب دے گئے تھے مثلاً دریائے نور لاہور سے، نور الاخبار اور نور افشاں لدھیانہ سے، نور الانوار اور مطلع نور وغیرہ۔

آخر یہ نامی گرامی اخبار بہت سے انقلابات جھیلتا ہوا سنہ ۱۹۰۴ ع میں بند ہو گیا۔

سنہ ۱۸۵۳ ع میں راے دیوان چند رئیس سیال کوت نے ایک اخبار ' پساپے بہا ' مطبع چشمہ فیض سے جاری کیا۔ یہ اخبار وکٹوریا پیپر کے نام سے اب تک جوں توں زندگی کے دن بھر رہا ہے۔

' اخبار عام ' سنہ ۱۸۷۱ ع میں لاہور سے جاری ہوا ' ہفتہ وار نکلتا تھا اور ایک پیسے میں بکتا تھا ' پلڈت مکند رام مٹرولاس پریس سے نکالتے تھے ' رفتہ رفتہ روزانہ ہو گیا یہ اخبار اب بھی جاری ہے اور اس وقت پنجاب میں سب سے پرانا اخبار ہے۔

' اودہ اخبار ' سنہ ۱۸۵۸ ع میں لکھنؤ سے جاری ہوا - لاہور میں کوہ نور کے دفتر میں بیٹھ کر پریس اور اخبار کے چلانے کے رموز پر حاوی ہو کر منشی نول کشور (پھر سی ' آئی ' ای) نے یہ اخبار نکالا جو سنہ ۱۸۷۴ ع میں روزانہ ہوا اور اس وقت تک آب و تاب سے روزانہ چل رہا ہے - کسی نہ کسی جذبے سے متحرک ہو کر حاسد لوگ کہتے تھے کہ اودہ اخبار پاپونیر کا ترجمہ ہوتا ہے - یہ کچھ ہی ہو ' محض یہ واقعہ کہ وہ اچھے صوبہ کا یا غالباً کل اردو دنیا کا پہلا روزنامہ ہے اور یہ کہ مشہور عالم فسانہ آزاد اول اول اسی اخبار کے ضمیمہ کی طور پر اشاعت پذیر ہوا کرتا تھا کیا اس کے لئے طرہ امتیاز نہیں - ملک کے بعض نہایت قابل اور نامی اصحاب اس اخبار کی ادارت کو فخر بخشتے یا شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے ہیں مثلاً مولوی غلام محمد تپش تلمیذ غالب - مولانا سید امجد علی اشہری - پلڈت رتن ناتھ سرشار - منشی نوبت راے فظر مرزا حیرت دہلوی - حضرت جالب دہلوی - مرزا یاس عظیم آبادی (اب مرزا یگانہ لکھنوی) - مستر شوک تھانوی - مرزا محمد عسکری اور مستر پیارے لال شاگر دغیر ہم - اس اخبار کو

عہد حاضر کے صحیفوں میں سب سے پرانا کہنا چاہئے —

لکھنؤ میں 'اودہ پنچ' کے اجراء نے جو سنہ ۱۸۷۷ ع کا واقعہ ہے۔ اردو ادب میں ایک نئے ادارہ کا دروازہ کھولا۔ یعنی مزاج حسنہ اور مطائبات کو رواج دیا۔ اب تک لوگوں کا علم مطائبات سعدی اور ہزلیات جعفر زٹلی تک محدود تھا جن کو وہ کوتھری کا دروازہ بند کر کے پڑھتے اور بد مذاقی کے مزے لوتے تھے۔ یا احباب کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی تاویل و تعبیر کرتے۔ لیکن 'اودہ پنچ' نے واقعات حاضر اور سوشل اور سیاسی معاملات کے گتھل مدارج کو ظرافت کی برچک دی۔ نہ صرف یہ کہ جس طرح اکبر مرحوم کو کانگریس اور لیگ سامنے کے موضوع مل گئے۔ منشی سجاد حسین کو سر سید احمد خاں اور علی گڑھ کی تحریک جدید ہاتھ آگئے۔ بلکہ منشی صاحب مرحوم کی غایر نظر سے کوئی واقعہ یا شخصیت جو مزاج کا عنصر رکھتی ہو یا جس کی کوئی کل تھیلی ہو بچ نہیں سکتی تھی ان کے وار کو کوئی خالی نہ دے سکا۔ کارتوں کی ابتدا بھی اودہ پنچ ہی کی ذات سے ہوئی۔ اودہ پنچ کی ہر دلچیزی اور قبولیت عام کا موازنہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مندرجات کے انتخاب کے دو خاصے مضامین مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ ایک گلدستہ پنچ اور دوسرا انتخاب اودہ پنچ —

ذیل کی جدول سے وہ اردو کے قریباً ساٹھ اخباروں کے کوائف معہ سنہ ابتداء وغیرہ کے معلوم ہوں گے، جس کے بعد بعض اخباروں سے اقتباس پیش کئے جائیں گے اور اپنے قایم کئے ہوئے ہر دور کی صحافت پر مختصر تبصرہ بھی ہوگا —

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	ادارہ
دور اول ابتداء سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک	۱	اردو اخبار	دہلی	سنہ ۱۸۳۶ ع	مولوی محمد یاتر
	۲	سید الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۳۷	سید محمد خان
	۳	سراج الاخبار (فارسی)	قلعہ دہلی	سنہ ۱۸۳۱	
	۴	نواہد الناظرین	دہلی	سنہ ۱۸۳۶	ماسٹر رام چندر
	۵	توان السعدین	دہلی	سنہ ۱۸۳۶	پنڈت دھرم ناراین ہاکسر
	۶	ضیاء الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۳۹	شیخ محمد ضیاء الدین دہلوی
	۷	کوہ نور	لاہور	سنہ ۱۸۵۰	منشی ہر سکھا رائے
	۸	ہماچے بہا	لاہور	سنہ ۱۸۵۳	منشی دیوان چند
	۹	کشف الاخبار کشف الاسرار	بہمنی	سنہ ۱۸۵۵	منشی امان علی لکھنوی
	۱۰	صادق الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۵۶	
دور دوم سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک	۱۱	مفوح القلوب (فارسی)	کراچی بندر	سنہ ۱۸۵۶	مرزا محمد شفیع خلف مرزا مخلص علی
	۱۲	اردو گانڈ	کلکتہ		
	۱۳	اودہ اخبار	لکھنؤ	سنہ ۱۸۵۸	منشی نول کشور
	۱۴	اخبار عالم	میرٹھہ	سنہ ۱۸۶۱	محمد وجاہت علی خاں
	۱۵	اخبار انجمن اودہ موسوم	لکھنؤ	سنہ ۱۸۶۲	
		پلا - بھارت پتر کا			
	۱۶	نجم الاخبار	میرٹھہ	سنہ ۱۸۶۳	مولوی محمد حیات
	۱۷	لارنس گزٹ	میرٹھہ	سنہ ۱۸۶۳	سید جمیل الدین
	۱۸	آگرہ اخبار	آگرہ	سنہ ۱۸۶۵	مولوی خواجہ یوسف علی
	۱۹	پنجابی اخبار	لاہور	سنہ ۱۸۶۵	

تفصیل دوو	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	ادیتور
	۲۰	اکمل الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۶۶	منشی بہاری لال 'مشتاق'
	۲۱	علی گڑہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	علی گڑہ	سنہ ۱۸۶۶	
	۲۲	رہیلکھنڈ گزٹ	مراد آباد	سنہ ۱۸۶۶	منشی بشن سرورپ
	۲۳	بدیا بلس	جموں	سنہ ۱۸۶۷	پیشی کرشن دیال مالک
	۲۴	مقصود الاخبار	گورگانو	سنہ ۱۸۶۸	فلام معی الدین ادیتور
	۲۵	ریاض الاخبار	خیبر آباد	سنہ ۱۸۶۹	قاضی قطب الدین احمد
	۲۶	مطلع نور	کائنپور	سنہ ۱۸۶۹	حضرت ریاض منشی بہاری لال
دور سوم سنہ ۱۸۷۰ ع	۲۷	اخبار انجمن پنجاب	لاہور	سنہ ۱۸۷۰	
سے سنہ ۱۸۷۹ ع تک	۲۸	اخبار عام	لاہور	سنہ ۱۸۷۱	
	۲۹	نور الانوار	کائنپور	سنہ ۱۸۷۱	
	۳۰	کوکب ہند	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۱	
	۳۱	نور افشاں	لہ ہیا نکہ	سنہ ۱۸۷۳	
	۳۲	ناصر الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۷۳	
	۳۳	آفتاب پنجاب	لاہور	سنہ ۱۸۷۳	دیوان پوٹا سنگھ مالک
	۳۴	نصرت الاخبار	دہلی	سنہ ۱۸۷۳	منشی فقیر محمد ادیتور
	۳۵	نصرت الاسلام	دہلی		مولوی نصرت علی
	۳۶	مرقع تہذیب	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۴	مولوی نصرت علی
	۳۷	مغید ہند	دہلی	سنہ ۱۸۷۵	منشی مہا نرائین
	۳۸	خیبر خواہ ہند	دہلی	سنہ ۱۸۷۵	منشی مہا نرائین

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	آئیڈیٹر
	۳۹	مہر درخشاں	دہلی	سنہ ۱۸۷۵	۶
	۴۰	اخبار تماشائی	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۵	منشی پورن چند
	۴۱	جریدۂ روزگار	حیدر آباد دکن	سنہ ۱۸۷۵	
	۴۲	جام جمشید و بلند اختر	مراد آباد	سنہ ۱۸۷۶	سید جمشید علی
	۴۳	سفیر ہند	دہلی	سنہ ۱۸۷۶	منشی بلاقی داس
	۴۴	انوار الاخبار	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۶	مہمد تیغ بہادر
	۴۵	اودۂ پنچ	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۷	منشی سجاد حسین
	۴۶	قیصر الاخبار	الہ آباد	سنہ ۱۸۷۷	سراج الدین احمد خاں
	۴۷	نسیم آگرہ	آگرہ	سنہ ۱۸۷۸	بابو جٹا داس بسواس وکیل
	۴۸	نیر اعظم	مراد آباد	سنہ ۱۸۷۸	امجد علی نیر
	۴۹	مہر نسیم روز	بھنور	سنہ ۱۸۷۹	
	۵۰	مشیر قیصر	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۹	منشی غلام مہمد تپیش
	۵۱	مظہر العجاائب	مدراں	سنہ ۱۸۷۹	
	۵۲	نرجمان شوق	استنبول	سنہ ۱۸۷۸	
دور چہارم سنہ ۱۸۸۰ ع	۵۳	دہلی پنچ	لاہور	سنہ ۱۸۸۰	منشی نثار علی شہرت
سے سنہ ۱۸۸۲ ع تک	۵۴	تجارت الاخبار	کلکتہ	سنہ ۱۸۸۰	دہلوی
	۵۵	سفیر ہند	امرتسر	سنہ ۱۸۸۰	
	۵۶	خیر خواہ عالم		سنہ ۱۸۸۱	
	۵۷	ریشتی اخبار	دہلی	سنہ ۱۸۸۱	منشی مہا نرائین
	۵۸	بنارس گزٹ	بنارس	سنہ ۱۸۸۲	مہمد حلیف منیچر
	۵۹	ریغارمر	لاہور	سنہ ۱۸۸۲	نثار و رام آنند

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	ایڈیٹر
۶۰	شعشعہ ہند	میرٹھا	سنہ ۱۸۸۳	مولانا شوکت حسین شوکت	
۶۱	اخبار النساء	دہلی	سنہ ۱۸۸۳	مولوی سید احمد	
۶۲	رفیق ہند	لاہور	سنہ ۱۸۸۳	منشی معزم علی چشتی	

اردو اخباروں سے اقتباس پیش کرنے سے پہلے سراج الاخبار کو نسبتاً دینا بہتر ہوگا کیونکہ پھر اردو صحیفوں کا سلسلہ پورا اور بلا مداخلت رہے گا، میں نے اس اخبار سے چند ایسے اقتباس چلے ہیں جو حضرت بہادر کی روزانہ زندگی اور شاہی اقتدار پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ادب میں قلعہ کی کلچر اور زبان سے متعلق خبر دیتے ہیں۔ یہ اخبار اصل میں بادشاہ کا روز نامہ تھا آخر میں خاص خاص خبریں بھی ہوتی تھیں جو عموماً دوسری سلطنتوں یا ریاستوں سے متعلق ہوتی تھیں، یا کبھی دہلی کی لوکل خبر موسم وغیرہ کی، یہ اخبار مطبع سلطانی میں ”بہ اهتمام مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں وقایع نگار و امداد علی بیگ خاں“ ہفتہ وار چھپکر شایع ہوتا تھا، اس کی تین جلدیں سنہ ۱۸۴۱ ع اور سنہ ۲۳ ع اور سنہ ۲۴ ع کی میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اس وقت میرے سامنے سراج الاخبار کی جلد اول نمبر ۳ کھلی ہے، عنوان ہے، ’سراج الاخبار‘ ”روز جمعہ بست و چہارم جمادی الثانی سنہ ۱۲۵۷ھ موافق سنہ ۴ جلوس معلی مطابق ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۱ ع“۔۔۔

بہادر شاہ بغیر ملک کے بادشاہ نہ لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور اقتدار وہی تھا جو اُن کے بزرگوں کا رہ چکا تھا۔ اگرچہ

صرف قلعہ کی چار دیواری اور مختصر سے علاقہ خالصہ میں بادشاہ کی حکومت تھی شہر دہلی پرایست اندیا کمپنی کا تسلط اور حکومت تھی۔ لیکن اس پر بھی شہر والے اپنی شکایتیں جو کمپنی کے افسروں کے خلاف ہوتیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ چوکیدارہ اور پولس کے خلاف شہر کی رعایا کی ایک عرضداشت گذرتی ہے —

”اشاعت متذکرہ صدر کی اصل عبارت یہ ہے پس از اداے صلوة عصر از دیوہی خاص رونق افروز شدند ‘ راجہ جیسکھہ راے و نذر الدولہ و احترام الدولہ و حکیم الممالک ‘ و راے شادی رام و میر اشرف علی خاں خلف نجیب الدولہ و فوجدار خاں و مرزا راجہ بھولانا تھہ ‘ و موتمن الدولہ مرزا علی خاں عرض بیگی وغیرہ بہ تلثم عتبہ فلک رتبہ پرداختند ‘ سواری مبارک در صحن دیوان خاص رسیدہ بود کہ انبوء کثیر از رعایاء شہر و سکائے صاحب باغ و دیگر املاک شاہی استغاثہ تعدی عملہ پولس در اخذ وجوہ چوکیدارہ مجبوزہ حال کہ دو چلدوسہ چاند از روے تعداد و نسبت معمول سابق بودہ نمودند و عرضداشتند کہ اکثر رتبہ شدت باین درجہ رسیدہ کہ اجناس و اثاث البیت بے اجازت مالکان خانہ گرفتہ می ہرند ‘ حضرت خدیو گپہاں از جماعت مروضات فریباں بہ سیف الدولہ مخاطب شدہ ارشاد فرمودند کہ از استبداد و اصرار مجستریت بہادر بر تضعیف وجوہ چوکیدارہ و اعزاز معظم الدولہ فرزند ارجمند اجنت بہادر باوصف ادراک تکالیف رعایا ازین تجویز ثابت می گردد کہ قانون نے تازہ دریں باب از صدر رسیدہ باشد ‘

زیرا کہ مجسٹریٹ بہادر بہ تعمیل احکام قانونی مامور است و اجنت بہادر بحکم عدم مداخلت در امثال این امور مجبور و الحق بواسطہ بے اختیاری در اصلاح این مقدمہ ہر دو معذور و بے قصور اندرین صورت شکایت گذاری ایشان نادر و بلکہ رجوع باہالیان صدر کے مختصر قوانین جامع النفع و ناسخ آئین عامۃ الضرر اند مناسب و بجاست ... لازم کہ بدوسہ کس از این مستغیثان کہ بحکم فہم و فراست معطلی باشند بہ تشفی و دلاسا فہمانند کہ موافقہ این مقدمہ بصدر نمایند و از پیشگاہ والاہم درین باب شقہ خاص تفصل اختصاص اسمی زبدۃ الامراء عالیشان عالیجہ رفیع المکان مقہد سرانجام مہمات سلطانی متکفل انصرام اسورات جہانبانی ہندی طامس کیمل رابرت سنہ لئلت گورنر بہادر مستقر الخلافت اکبر آباد صادر خواہد گردید ... ”

لفظ بہ لفظ ترجمہ محض طوالت ہے - اس اقتباس کا ملخص یہ ہے کہ شہر وغیرہ کی رعایا کے نمایندوں نے یہ عرضداشت پیش کی کہ رسوم چوکیدارہ پہلے سے دگنا تکڑا کردی گئی ہیں - جو یہ رسوم ادا نہیں کر سکتا پولس والے اس کے گھر کا مال اسباب زبردستی اٹھالے جاتے ہیں ایسا جبر اور ظلم جب سے شہر بسا ہے کبھی نہیں ہوا - اس عرضداشت پر حضرت بہادر شاہ کا حکم نہایت مہتم بالشان ہے - فرمایا اس بارے میں شہر کے مجسٹریٹ یا دہلی کے انگریزی ریذینٹ کو لکھنا فصول ہے کیونکہ وہ صرف احکام صدر کی تعمیل کرنے والے ہیں ان لوگوں میں جو سمجھ بوجھ والے ہیں ان کو سمجھا دو کہ اگرچہ جاکر محکمہ صدر میں

اپنی شکایت پیش کریں کیونکہ قانون اور حکم وہیں سے جاری ہوتے ہیں ان لوگوں کی اچھی تسلی کی جائے اور بتایا جائے کہ اس بارے میں قلعہ سے بھی گفتگو کرنے کو لکھا جائے گا، کوئی اس حکم کو لطائف التحیل کہے یا مصلحت وقت پر مبنی۔ بہر حال خود داری کا اعلان ثبوت ہے، اس کے سر! بہادر شاہ کچھ اور کر ہی نہ سکتے تھے۔

یہی اشاعت مظہر ہے کہ :-

”روز شانہ ہجرت شہنشاہی روز برآمدہ حضرت شاہشاہ در دیوان خاص بکری طلا کار رونق افزا شدند و امرای عظام و دیگر خدام ناصیہ سائی آستان سپہر نشان گشتند کپتان انجلو بہادر قلعہ دار معہ مصور سحر کار جادو نگار کہ شہت نام دارد بشرف مجرا رسید و مصور مذکور بہ تیاری شبیلہ اقدس مشغول گشت“۔

۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ مرزا غالب نے نوزائیدہ شہزادہ کا زائچہ ایک فارسی قطعہ میں نظم کر کے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :-

”عرضداشت اسد اللہ خان غالب نخلص کہ زائچہ طالع نونہال حدیقہ اقبال را بہ نظم در آورده معرفت نوروز علی خان فرستاده و در آن داد سخنوری داده بود بہ نظر کرامت اثر گذشت و مورد تحسین گشت“۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک غالب قلعہ کے دربار میں باریاب نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ’ذوق‘ کا خطاب ’سلطان الشعرا‘ تھا نہ کہ ملک الشعرا۔ اور یہ کہ وہ ابھی تک ’خاقانی ہذا‘ نہیں ہوئے تھے۔

قطعہ میں جس کا ابھی ذکر ہوا چودہ شعر تھے - پہلا شعر یہ ہے :-

سپہر بارگاہ فرقد ال سریر شہا

طلوع کوکب مجد و علا مبارکیاد (ردیف مبارکیاد)

ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کبھی کبھی انگریزی دوائیں بھی استعمال

کرتے تھے - ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۵۷ھ کے اخبار میں ہے کہ :-

”بعد ازاں دابی سین بہادر کے در زمانہ سابق سرتر ایجنٹ

خاص دارالخلافہ بودند و حالا بہ عہدہ کلکتری و مجسٹریٹی

علاقہ بہاول پور مامور اند بہ سعادت ملازمت رسیدہ اشرفی

نذر گذرانیدند عرض حالات آب و ہوائے آن ضلع نمودند و

بلدگان اقدس برائے کدام درایے انگریزی کہ مہیج اشتہا و

و مقوی اعضا باشد بہ موجب عرض سابق شاں ارشاد نمودند -

معروض داشت کہ فردا از راس بہادر تا کتر گرفتہ ابلاغ حضور

فیوض گلچور خواہم ساخت -“

اخبار نمبر ۱۲ جلد اول میں ہفتہ کے روزنامہ میں درج ہے کہ

بادشاہ نے اپنی غزل (بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی)

پر مصرع لگائے تھے - اسے ”سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ

ذوق“ نے پڑھ کر سنایا - اس سے اگلی اشاعت میں درج ہے کہ ”شیخ محمد

مشعق حسین تخلص نے رباعی مرسلہ اسد اللہ خاں غالب تخلص کہ شاعر

نازک خیال است در شکر یہ عطاءے دال“ کہ از پیشگاہ حضور انور شدہ بود

بہ وسیلہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر بہ سمع ہمایوں

و - انید -“ یہ وہی رباعی ہے (بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاء نے دال) جو

دیوان میں شامل ہے - یہاں بھی غالب کا نام بغیر کسی اعزازی لقب کے ہے -

مولوی ہی لکھ دیا جانا - ظاہر یہ ہوتا ہے کہ لفظ 'مرزا' قلعہ کی اصطلاح میں شہزادوں کے لئے خاص ہو چکا تھا اور مرزا غالب کا رسوخ قلعہ کے دربار میں ابھی بہت کم تھا -

۲ شوال سنہ ۱۲۰۷ھ کے سراج الاخبار میں ہے :-

” روز دوشنبہ بست و ہشتم رمضان المبارک چوں ہمگی ہمت والا
نہست حضرت قدر قدرت بہ خیرات مبرات مبدول است موافق
معمول تقریب دیوالی برائے وزن جسم معظم و پیکر مطہر در
تسبیح خانہ کہ میزان برپا کردہ بودند تشریف فرما شدہ بہ
زرد نقره و دیگر فلذات و غلات ہنگانہ وزن فرمودہ بہ
ارباب استحقاق عنایت فرمودند و لباس ملبوس بہ خاص
تراشاں مرحمت گشت “ -

خاص اشخاص کو بادشاہ خط نسخہ کی تعلیم بھی دیتے اور اس فن میں شاگرد بناتے تھے اور شاعری میں بھی بادشاہ کے دربار میں غالب کی حاضری کم سے کم تین ہجری سالوں یعنی سنہ ۱۲۳۰ - ۱۲۴۰ - ۱۲۵۰ میں تو پائی نہیں جاتی لیکن رسل رسال کی سبیل کا پتہ چلتا ہے - ۱۵۱ کی رباعی کا ذکر ابھی ہوا زائچہ والا قطعہ اس سے پہلے آچکا تھا - اب غرہ ذیقعد سنہ ۱۲۵۷ کے اخبار میں لکھتے ہیں ” اسد اللہ خان غالب تخلص عبارت نثرا کہ حضرت نزدشاں ابلاغ داشتہ بودند درسلک نظام بطور مثنوی کشودہ بنابر ملاحظہ اقدس فرستادہ برائے خواندن بہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر فرماں شد حسب الحکم بہ سمع اقدس رسانند و مطبوع خاطر والا افتاد “ -

اسی اشاعت میں بادشاہ کی ایک غزل مستزاد بہت نفیس درج

ہے جس کا مطلع ہے :-

جو عرش سے ہے فرش تلک آدمی میں ہے - دیکھ آنکھ کھول کر
 کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہے پر چاہئے نظر
 ۲۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۵۷ کے سراج الاخبار سے واضح ہے کہ اس وقت
 سید الاخبار زندہ اور جاری تھے - بادشاہ برہمنوں کو بھی دان دیا کرتے
 تھے - چنانچہ ۱۰ محرم سنہ ۵۸ کے سراج الاخبار میں ہے کہ :
 ”فرضداشت برہمنے کہ بہ عنایب زنجیر فیل کامیاب گردیدہ بود
 مشعر طلب حصص دیگر برہمنان کہ ملازم سلطانی اند بہ نظر
 انور گزشت، حکم شد کہ این تصدق محض بہ ذات توتعلق
 دارد دیگران را دعوے شراکت نمی رسد“ —
 جون سنہ ۱۸۲۳ کے سراج الاخبار میں ایست اندیا کمپلی سے جو
 پلشن آتی تھی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

” بہ گوش حق نبوش رسید کہ پیشکش زر معمولی از خزانه
 انگریزی بہ خزانه عامرہ و نیز زر آمدنی کلید خانہ ہمدست
 تاج محمد خاں سرچوکی دیوان خاص داخل شد “ —
 ۵ جولائی سنہ ۱۸۲۳ کے اخبار میں ”خبر لاہور“ کے تحت درج ہے :-
 ”... راجہ دھیان سنگھ آزرده خاطر گشتہ معہ اسب و فوج
 خود بہ صوبہ جموں رخت کشید، و مہاراجہ شیر سنگھ بہادر
 از رفتن او بسیار کشیدہ خاطر گشت و بر سر محفل گفت کہ
 راجہ دھیان سنگھ راتکیر بر فوج آراستہ و تدبیر خود است
 مگر آن چنان سزائے این سرکشی بہ کنا دش خواہم نہاد
 کہ جملہ متمدان بر سر حساب خواہند آمد و جملہ و نعرہ را

طلب نموده گنت کہ باچہار رجست کار آزموده پیادگان و دو

رجست سواران جنگ دیدہ بر سرش شرافت ...

سراج الاخبار کی ان جلدوں سے جو میرے پاس ہیں یہ تو واضح

ہوتا ہے کہ رزیدنسی وغیرہ سے بادشاہ کی خدمت میں کبھی کبھی انگریزی

میں بھی مراسلے جاتے تھے اور قلعہ سے ان کے جواب بھی انگریزی میں

دے جاتے تھے اور یہ کہ ایک انگریزی کا سکریتری منحصر اس کام کے لئے

تعیین تھا جس کا نام بابو دلاور سنگھ تھا لیکن کہیں یہ ذکر نہیں آیا

کہ بادشاہ کو انگریزی کی شد بود تھی - مگر ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۴۳ کے

پرچے میں ہے :-

”شتہ خاص ... کہ در خط و عبارت انگریزی بود بہ نظر قدسی آوردند“

غالباً اس کی عرض دستخط کرنے یا مہر لگانے سے ہو گئی —

۲ اگست کے اخبار میں ”مادرزن ایشان آیا ہے - خوشدامن چونکہ

مہلک تھا استعمال نہ کیا - رزیدنسی اور قلعہ کے درمیان بعض معاملے ایسے

الجبہ تھے کہ سلجھنے میں نہ آتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ تو اس

سے بہت آزرده دھتے تھے چنانچہ سنہ ۱۲۴۰ - ۱۲۴۱ ع میں مدتوں تک دربار

موقوف رہا اور قلعہ سے باہر بھی شاذ ہی تشریف لے جاتے - اسی زمانے

میں بادشاہ نے ایک انگریز سنیرالدولہ مشہورالملک مستر جارج طامس

بہادر مصلح جنگ کو نوکر رکھا - اس نے انگریزی خواں سکرتری کی امداد

سے تمام ضروری کاغذات اور عہد نامے وغیرہ انگریزی میں تیار کئے تجویز

یہ تھی کہ وہ مدد مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر وغیرہ انگلستان

جا کر مالکہ معظمہ کے دربار میں بادشاہ کے معاملات کی چارہ جوئی کریں -

لیکن آخری خبر جو ہم تک پہنچی یہ ہے کہ ۱۸۵۰ء نے اس جوش و خروش

پر تھنڈا پانی ڈال دیا کہ مسٹر طامس انگریزی قوم اور رعایا سے ہے اس کا بادشاہ کی سفارت پر مامور ہو کر جانا نہیں ہو سکتا اور دوسرے یہ کہ مفت کی زیر باری ہوگی۔ سمیرا الدولہ کی تالخواہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تھی۔

سراج الاخبار کی ان تینوں جلدوں میں جن کا ذکر ابھی آیا ہے فارسی بہت پختہ اور تہیت ملشیانہ ہوتی تھی۔ لفاظی جو دربار کی شان تھی اس کے علاوہ اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی۔ زبان کے قاعدے اور آئین کی پابندی سخت تھی۔ یہ الفاظ اور مرکبات جو ان جلدوں میں سے اخذ کر کے ذیل میں لکھ جاتے ہیں غالباً دلچسپ ثابت ہونگے:-
دیوٹی معلے، نوازاہاے، تھیکہ داران، درگھڑی، عملہ سرشتہ ایجنٹی چھٹی کمپ انگریزی، یک ڈالی میوہا، برآمدہ پھتھک کلاں، نہلام، کمشوری، اپیلانٹاں، اسپانڈنٹ، چٹھی، چٹھیات، کن کیمپ، توڑا دار، برسبیلی ڈاک، رجسٹر، رپورٹ، کمیٹی، مشاہدگان، گانہی نویس، زربلی، حوری، لقا، مادر زن، (لباس) بہ حلق کشیدند (پہانسی دی) اہاے گورمیلٹ، چھاپہ خانہ، فلات ہنگانہ (سقنجا) وغیرہ وغیرہ —

یہ کہیں سے معلوم نہ ہو سکا کہ اس اخبار کی کیا قیمت تھی اور آیا یہ اور اخباروں کی طرح فروخت ہوتا تھا —

اردو اخباروں سے اقتباس

ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک

جلد ۱۹ - نمبر ۱۵ - مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۵۷ ع کی

اردو اخبار

اشاعت میں درج ہے :-

” دہلی گزٹ کا ایک نامہ نگار کابل سے ۲۹ مارچ کو لکھتا ہے کہ مختصر فوج جسے امیر دوست محمد خاں نے پیش ہولاک اور سر چھو خیل قبیلوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا تھا محمد شاہ خاں سے مقابلہ کے بعد، جلال آباد واپس ہو گئی ہے کثیر مال غنیمت امیر کے سپاہیوں کے ہاتھ لگا ہے اور خاندان مذکور کو اپنی جان بچا کر پہاڑی قلعوں میں چوسمان میں ہے جا چھپا ہے ... برادر مہر داد خاں نے یہ بھی بیان کیا کہ چند انگریزی اخبارات ہندوستان کے شایع شدہ امیر کے سامنے پڑے گئے جن میں گورنمنٹ کی بد نظمی پر تلخید کی گئی تھی کہ وہ امیر کو خواہ مخواہ روپیہ دیتی ہے حالانکہ وہ دوطرفہ تعلقات رکھتے ہیں - امیر نے یہ سن کر کہا کہ جب گورنمنٹ پر کوئی مشکل آ پڑتی ہے تو وہ لوگ لاکھوں پونڈ صرف کر دیتے ہیں اور اب جب کہ ایرانی دوسروں کی تحریک پر افغانستان پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور محض گورنمنٹ ہلد کو دق کرنے کی نیت رکھتے ہیں تو گورنر جنرل نے عقلمدی اور دور اندیشی سے کام لے کر امیر کے عہد و پیمان پر غور کیا ہے کہ وہ قائم رکھنے کے قابل ہے ... اور معتبر خبر ملی ہے کہ سلطان جان نے کساندر انچیف افواج ایران متعینہ ہرات سے گرشک پر فوج کشی کرنے کی درخواست کی ہے اور کہا ہے کہ اہل گرشک نے اس شرط پر مدد دینی منظور کی ہے کہ تین سال تک کا خراج ماف کر دیا جائے “ —

جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۵۷ ع کی اشاعت

صادق الاخبار

میں یہ اخبار لکھتا ہے :-

” اعلان شاہ ایران “

” اعلان شاہ ایران کی کئی کاپیاں گلیوں اور سڑکوں کے کنارے پر چسپاں ہیں، میرے ایک دوست نے اس اعلان کی بعینہ ایک نقل کر لی ہے جو جامع مسجد کی پشت پر چسپاں ہے اس اعلان کو متعدد آدمیوں نے دیکھا ہے، مختصراً اس کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ مذہب حق کا دعوے کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ عیسائیوں کو مدد نہ دیں اور حق و راست پر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی میں اپنی تمام طاقت صرف کر دیں اور وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ جب کہ مابعد دولت (شاہ ایران) تخت ہند پر متمکن ہوں گے اور رعایا کو اتنا ہی خوش حال بنا دیں گے جتنا کہ انگریزوں نے مملوک الحال کر کے ذریعہ معاش سے محروم کر دیا ہے، ہم کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیا کرتے ہیں اور نہ وہاں دیں گے —

” یہ ہے اس اعلان کی رویداد، ایک شخص محمد صادق نامی جس کے ذریعہ سے یہ اعلان کھا گیا کہتا ہے کہ ۱۶ تاریخ تک ۹۰۰ ایرانی سپاہی مع چند معزز افسران کے ہندوستان میں داخل ہو چکے ہیں اور خاص دہلی میں ۵۰۰ سپاہی تبدیل لباس میں مختلف صورتوں میں موجود ہیں، وہ اپنی نسبت کہتا ہے کہ ۱۴ مارچ کو میں دہلی پہنچا، جہاں اعلان چسپاں کر دے گئے ہیں“

اخبار مذکور کا حاشیہ اس اعلان اور محمد صادق کے بیان پر عجیب لیکن معنی خیز ہے، شروع میں یہ کہہ کر کہ ”لوگ کہتے

ہیں یہ اعلان چلے بے فکروں کا گھڑا ہوا ہے ” صاحب صادق الاخبار اسو:
طرح رتطراز ہے :-

” ہندوستانی تو صرف اسی وقت خوش ہوں گے کہ اگر شاہ ایران
عباس شاہ صفی کی طرح ہمارے خاص بادشاہ کو سلطنت
دیں اور تعجب بھی نہیں جو وہ ایسا کریں کیونکہ خود تیمور نے
ایرانہوں کو سلطنت بخشی تھی اور نظر غائر قائلے سے معلوم
ہوتا ہے کہ اسی احسان کے بدلے عباس شاہ صفی نے ہمارے ہمایوں
کو مدد دی تھی “ —

اگلی اشاعت مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۵۷ میں یہی اخبار محمد صادق
کو جعل ساز بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اگر گورنمنٹ کے ہاتھ لگ جائے تو
ایک دو تے کا جو تہ سرکہ میں تر کیا ہوا اس کی قنات پر پڑے گا “ -
مگر صادق الاخبار کا یہ فرمان اور سرکہ میں جوتا تر کرنے کا نسخہ
تجویز کرنا اس مشورہ کے مقابلہ میں جو انہوں نے شاہ ایران کو حضرت
بہادر شاہ کے ہاتھوں میں ہندوستان کی سلطنت بخشنے کے بارے میں دیا
ہے کوئی وقعت نہیں رکھتا - ” قدر “ کو ابھی قریباً تین مہینے ہیں اور دہلی
میں یہ اشغلی اٹھائے جا رہے ہیں - پھر اگر ابست انڈیا کمپنی کے اہلکار
بست و کشاد کو یہ شک ہوا کہ بہادر شاہ کمپنی کے خلاف ایران کے ساتھ
سازش کر رہے تھے تو ذرا بھی تعجب کی بات نہیں - پہلے سنہ ۱۸۴۱ ع
میں دہلی کا رزیدنٹ بادشاہ سے شکایت کر چکا تھا کہ وہ امیر دوست
محمد خاں سے براہ راست خط کتابت کرتے ہیں جو نہیں ہونا چاہئے
اب قدر سے دو تہیں مہینے پہلے یہ ایران کا قضیہ اٹھایا گیا - چنانچہ ایک
شاہزادہ بنارس میں گرفتار بھی کیا گیا جس پر یہ الزام تھا کہ بادشاہ کا

مواسلہ لے کر ایران جا رہا تھا۔ اشتہار مذکور خواہ کسی کا طبعزاد ہو اخبار کی پہلی اشاعت کا نوٹ یقیناً نامناسب اور فتنہ انگیز ہے —

’دہلی گزٹ‘ پہلے انگریزی میں نکلتا تھا پھر اردو میں بھی ہو گیا کابل کے متعلق اس کے حوالے سے اردو اخبار کا اقتباس جو سب سے پہلے پیش ہوا ہے وہ بھی سادگی سے خالی ہے۔ شکایت ہوئی ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں ان انگریزی اخباروں کی تلقید جو یورپین ہی نکالتے تھے اور معاملات خارجیہ میں جارحانہ نکتہ چینی پریس کے ان قوانین کا باعث ہوئی جو سرکار وقت کو اس زمانے میں نافذ کرنے پڑے —

جلد چہارم - نمبر ۲ - مورخہ ۲۲ جنوری سنہ ۱۸۴۹ ع سے
فوائد الناظرین | یہ اقتباس لیے جاتے ہیں —

”خبر ملتان“

”۱۱ تاریخ تک کے خطوط صاحب دہلی گزٹ پاس آئے ان سے کوئی بات تازہ نہ معلوم ہوئی فوج سرکاری شہر ملتان کا قبضہ اور محاصرہ قلعہ کا کٹے پڑی ہوئی ہے شب و روز توپخانہ آتش بار جاری رہتا ہے اور صاحبان حرب و پیکار تجریز واسطے قبضہ کر لیتے قلعہ کے کر رہے ہیں“ —

”خبر خاص دہلی“

”گیارہویں تاریخ جنوری سنہ ۱۸۴۹ ع کو شاہزادہ دارا بخت بہادر ولعہد سلطنت ہند نے اس جہان ناپایدار سے طرف عالم بقا کے نفاذ کوچ بجایا اور چراغ دہلی میں دفن کئے گئے۔“

۵ فروری سنہ ۱۸۴۹ ع کی اشاعت میں یہ اخبار پچھلے سال یعنی ۱۸۴۸ ع کے واقعات دینا ہر مہینے کے عنوان کے تحت یہ قہد تاریخ دینا

ہے جن میں سے چند واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں : —

”سارچ“

”پانچویں تاریخ کو بابو بھولا ناتھ اور گوپال چندر شہر لندن سے بعد حصول علم طب کے ہندوستان میں داخل ہوئے۔“
 ”۱۸ تاریخ تمام ولایت فرنگ میں شورش واسطے ریاست جمہوری کے اٹھی اور چند شاہان اس دیار کے اپنی اپنی سلطنت کو استعفا دے کر بھاگ گئے۔“ —

”مٹی“

”۲۵ تاریخ کو جنرل دینچورا صاحب کو جو کہ مہاراجہ لاہور کا نوکر تھا حکم ہوا کہ یہاں سے ولایت کو چلا جائے۔“
 ”اکتوبر“

”۹ تاریخ کو دنیا کے باشندوں اور طالب علموں نے سرکشی کی اور وہاں کا شہنشاہ معہ اپنے خاندان کے فراری ہوا۔“ —

اسی اشاعت میں فرا سو صاحب کی ایک اردو غزل بھی درج ہے جس کا مطلع ہے —

جو سر کہ الفت میں تری ہم سے نہ ہو گا

ہے ہم کو یقین وہ کبھی عالم سے نہ ہو گا

یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ پندت دھرم ناراین جنھوں نے ’قران السعیدین‘ نکالا تھا ’مالوہ اخبار‘ نکالنے والے ہیں جس میں ایک طرف اردو اور ایک طرف ناگری ہوا کرے گی۔

”۲ اپریل کے اخبار میں قلمہ معلے کی خبر لکھتے ہیں کہ ”حضور

والا نے 'زبدۃ الاخبار آگرہ' اور 'اردو اخبار' دہلی کو ملاحظہ
 کیا اور اس میں جو شرائط درباب اضافہ کی تھیں ان کو پسند
 فرمایا اور اصلی شرائط کو اپنے 'سراج الاخبار' میں چھپوا دیا۔
 یہ شرائط بادشاہ کے مالی معاملات کی اصلاح کی تجویزیں تھیں۔
 ۹ جولائی کی اشاعت دہلی سے ایک اور اخبار مسموٰی 'ضیاء الاخبار'
 کے جاری ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ جس کے مہتمم شیخ محمد ضیاء الدین دہلوی تھے۔
 ۳ ستمبر کے اخبار میں یہ سمدراجات اہم ہیں: —

۱ - شبیہ و حالات ولہم شیکسپیر -

۲ - پنچ آہنگ یعنی مجموعہ نثر غالب کا اشتہار۔ یہ کتاب کلیم
 غلام نجف خان نے اپنی نگرانی میں قلعہ کے مطبع سلطانی میں چھپوائی تھی۔
 ۴۹۳ صفحے تھے اور قیمت چار روپیہ مقرر تھی۔

ایک اور بات نوٹ کے قابل یہ ہے کہ فواید الناظرین کی اس جلد
 (سنہ ۱۸۴۹ ع) میں اردو - فارسی اور انگریزی کے تہتس اخباروں کے
 حوالے موقع بہ موقع آئے ہیں: —

تعلیم الخلیق - آفتاب عالمتاب مدراس - دہلی گزٹ - مجمع الاخبار
 مالوہ اخبار اندور - الحقائق - نزہۃ الاخبار - زبدۃ الاخبار آگرہ - قرآن
 السعدین دہلی - اردو اخبار - نزہۃ الارواح - انگلش مہن - دہلی اخبار -
 ضیاء الاخبار دہلی - لٹریچر گزٹ - پیپل جرنل - خیر خواہ ہند - اخبار ہرکارہ -
 جام جمشید - اعظم الاخبار فواید الشائقین - اور - سید الاخبار --

اب تاریخی ترتیب کی رو سے کوہ نور ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس
 کوہ نور کا ضروری تذکرہ آگے ہو چکا ہے — ۲۱ ستمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کو
 کوہ نور کی معمولی اشاعت کا دن نہ تھا اس لئے اس تاریخی کو اس کا

ایک ”پرچہ زاید“ شائع ہوا جس پر ضمیمہ نمبر ۳۹ درج ہے اور عنوان جلی ہے: ”مژدۂ نفع دہلی“۔ یہ ایک نہایت اہم تاریخی مقالہ ہے جس سے طویل اقتباس بیجا نہ ہوگا۔ یہ اصل پرچہ زاید منجملہ دوسرے اخباروں کی اہم اشاعتوں کے میں ساتھ لیتا آیا ہوں جو بعد میں ملاحظہ کرائی جائیں گی اب وہ اقتباس ملاحظہ ہو: —

”..... صاحب ایجوکٹڈ جنرل فوج ظفر موج مقام دہلی نے کل کی تاریخ ۹ بجے صبح کے بذریعہ تار برقی اول مرتبہ تو یہ تحریر فرمایا کہ مورچہ بری پر دلہران انگریزی نے کل شام کو حملہ کر کے ۶ ضرب توپ اور ایک توپ بم بلا کسی نقصان کے اپنے قبضہ میں کر لیں اور آج صبح کو لاہوری دروازہ قبضہ میں آگیا۔ اجمیری دروازہ اور مور چال بھرونی سے اب گولہ نہیں چلتا مفسدین ان جملہ مقامات کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور سپاہ گان سرکاری قبضہ کرنے کے واسطے چلے جاتے ہیں..... اور مفسدین نے آج صبح کو اپنے کمپ کا میگزین بھی اُڑا دیا آمد و رفت ہماری آج چاندنی چوک تک جاری ہو جائے گی..... اور شاہ دہلی اور اس کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں۔“

”پھر ۱۰ بجے صبح کے صاحب موصوف نے یہ خبر بھجی کہ اجمیری دروازہ اور دیگر مورچال پر قبضہ سرکار کا ہو گیا... .. اور لال محل [لال قلعہ] میں داخل ہونے کی تیاری ہے۔ پھر دوپہر کے وقت صاحب موصوف نے یہ مژدہ دیا کہ لال محل جامع مسجد و اجمیری دروازہ پر سرکار کا تسلط ہو گیا۔ بعد

اُس کے دو بچے دن کے یہ خبر آئی کہ سلیم گڈہ و پل پر سرکار کا قبضہ ہوگیا تھوڑے عرصہ میں دروازہ ترکمان تک کل شہر دہلی و دیگر مور چال پر تسلط کامل ہو جائے گا۔

”پھر ۵ بجے شام کے یہ خوش خبری آئی کہ معرکہ دہلی کا تمام ہوا تمام شہر دہلی اور محل بادشاہی اور سلیم گڈہ اور پل وغیرہ پر شجاعان سرکار کا بالکل تسلط ہوگیا..... سنا جاتا ہے کہ شاہ دہلی معہ عیال و اطفال ایک گانو میں جو شہر سے قطب صاحب کی سمت چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے چلے گئے ہیں۔“

”مطبع گوہ نور لاہور محلہ یکی دروازہ حویلی منشی ہوسکھہ راے پروپرائٹر میں باہتمام منشی نول کشور منیجر و غلام محمد پر نتر و علی بخش پبلشر کے چھپا۔“

اس سے یہ واضح ہوا کہ منشی نول کشور جنہوں نے بعد میں لکھنؤ میں اپنا نامی گرامی مطبع اور اودہ اخبار جاری کیا سنہ ۱۸۵۷ میں یہاں لاہور میں مطبع گوہ نور کے منیجر تھے۔ گوہ نور کی ابتدائی جلدیں مہرے قبضے میں نہ آسکیں۔ سنا کہ منشی محبوب عالم صاحب مرحوم کے ہاں کچھ پرانی جلدیں ہیں ان کے کتب خانہ کی آتش زدگی کا حادثہ ہوچکا تھا اور وہ گوہ نور کی سنہ ۱۸۵۱ ع کی جلد مہرے معزز دوست راے بہادر یلندت شہو نراین صاحب کو مستعار دے چکے مگر منجبتہ کو ان سے یہ استفادہ مہسر نہ آیا۔ راے صاحب موصوف نے اس جلد سے مستفید ہو کر ایک مہتمم بالشان لکچر لاہور کی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی میں ’گوہ نور آف سنہ ۱۸۵۱ ع‘ کے عنوان سے دیا جو اس کے جرنل جلد ۴ نمبر ۱۔ سنہ ۱۹۰۶ ع

میں طبع ہوا ہے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ نور کی جلد سنہ ۱۸۵۱ء میں مندرجہ ذیل اخباروں کے نام حوالہ کی طور پر آئے ہیں :—

۱ - اخبار ہرکارہ
۲ - مراۃ الاخبار
۳ - مراۃ النہال
۴ - انجمن آرا } کلکتہ

۵ - مجمع الاخبار بمبئی۔

۶ - اردو اخبار
۷ - قرآن السعیدین
۸ - عمدۃ الاخبار
۹ - دہلی گزٹ } دہلی

۱۰ - اخبار الحقایق
۱۱ - زبدۃ الاخبار } آگرہ۔

۱۲ - جام جہاں نما مہر قہہ۔

۱۳ - باغ و بہار
۱۴ - بنارس گزٹ } بنارس۔

۱۵ - عمدۃ الاخبار بریلی۔

۱۶ - ریاض الاخبار سیال کوت۔

۱۷ - دریائے نور لاہور۔

۱۸ - شملہ اخبار۔ شملہ۔

۱۲ - جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کا کوہ نور غدر کے بعد شاہ دہلی کے معاملہ

پر بہت روشنی ڈالنا ہے۔ وہ لکھتا ہے :—

”اب ہم انتخاب ایک چٹھی کا جو دہلی سے ہمارے پاس پہنچی ہے اور اس میں مفصل حال شاہ دہلی کا کسی صاحب نے بہ چشم خود دیکھ کر لکھا ہے درج ذیل کرتے ہیں ہم کو راقم چٹھی کی تحریر پر اعتماد کامل ہے۔ صاحب چٹھی لکھتے ہیں کہ چند دن گزرے کہ میں ہمارا چند دوستوں کے شاہ دہلی اور ان کی بیگم صاحبہ کی ملاقات کو گیا تھا۔ شاہزادہ نے دیکھتے ہی مجھے کو پہچان لیا اور اپنی والدہ کے پاس اطلاع کرنے کو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد پیغام لایا کہ بیگم صاحبہ میرے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ میں نے اپنے دوستوں اور ہمراہیوں سے اجازت اندر جانے کی لی اور ان سے میں نے کہہ دیا کہ بیگم صاحبہ مجھے کو آگے ہی سے جانتی ہے اس واسطے مجھے کو بلایا ہے۔ پہلے کمرہ میں بادشاہ سلامت سوتے تھے۔ پہلے کمرہ سے گزر کر دوسرے میں جہاں بیگم صاحبہ ایک کھڑکی کے متصل جس پر پردہ پڑا تھا پلنگ پر پروں کا تکیہ رکھ ہوئے بیٹھی تھی چوں اس کمرہ میں ادھر ادھر گروہ کثیر عورات حرم کا موجود تھا میں نے بیگم صاحبہ کو نہیں پہچانا پر انہوں نے دیکھتے ہی مجھے کو بلالیا اور اپنے پاس بٹھلایا۔“

اوپر کی تحریر ترجمہ ہے جو کوہ نور نے لاہور کے انگریزی اخبار پنجاب کرائیکل مطبوعہ ۶ - جنوری سنہ ۱۸۵۸ء سے کیا۔ جو کوایف اس تحریر سے معلوم ہوئے وہ کچھ عجیب ہیں۔ یہ بیگم صاحبہ ملکہ زمانہ زینت متعلیٰ ہو سکتی ہیں کیونکہ وہی بادشاہ کی خدمت میں رنگون میں آخر دم تک رہیں۔ ملاقات کرنے والے کون صاحب ہیں اس کا پتا نہیں چلتا۔ یہ ملاقات اس

طرح کی تہرتی ہے جس طرح ایک یورپین جنتلسین ایک یورپین خاتون سے کرتا ہے۔ اس پر زیادہ وقت دینا فضول ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ منشی نول کشور غدر کے خاتمہ کے بعد کوہ نور اور لاہور سے چلے گئے کیونکہ اشاعت مذکورہ کے اختتام پر پلڈت سوچ بھان کا نام منیجر کی جگہ درج ہے اور یہ نام آئندہ مدت تک اسی حیثیت میں چلتا رہا۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع کا کوہ نور امرتسر کی یہ خبر لکھتا ہے :-
 ”ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ بمصوبہ اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے چند دولت مند امرتسر سے دہلی گئے ہوں۔“

۲۶ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع کا اخبار مظہر ہے :-
 ”دہلی - خط مورخہ ۱۷ جنوری سے مفہوم ہوا کہ مسترسی ٹی لباس صاحب نے دہلی میں پہنچ کر چارج عہدہ جج کا لے لیا دوکانداروں وغیرہ کے نام پروانہ جاری کئے جاتے ہیں کہ وہ شہر میں آکر سکونت اختیار کریں جسی شخص کو شہر میں رہنے کی اجازت ملے گی بعوض کچھ روپیہ کے ایک ثبت ملے گا اور اگر کسی شخص کے پاس سے چار دن کے بعد ثبت نہ نکلے گا تو وہ شہر سے خارج کیا جائے گا۔“

اسی اشاعت میں یہ بھی خبر درج ہے :-
 ”اخبار لاہور کراینکل مطبوعہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع سے دریافت ہوا کہ شاہ دہلی بہ نسبت سابق صحت رکھتے ہیں اور مکمل گذشتہ یعنی ۱۹ تاریخ کو ان کی تحقیقات شروع ہو گئی ہوگی۔“

(۲۳ فروری سنہ ۵۸ کی اشاعت سے ایک خط اور ایک غزل نقل

کی جاتی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ خط فارسی میں ہے اور غزل اردو

کی۔ جو اس زمانے کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ لکھتے ہیں :-

”جناب مخدوم و مکرم قدردان والا شان جناب منشی صاحب

دام اقبالہم بعد از جہیں سائی بزمین ارادت و ناصیہ فرسائی

بلوچ افادت مشہود ضمیر نوازی تخلص آں کہ امروز حسب

عادت قلم برداشتمہ یادہ درائی نمودہ ام و بتقریب میلہ چراغان

اکثر احبا از نواح قدم پر چشم خواہند نہاد اگر مہربانی کردہ

آں خرب ریوہ جلد را از اندراج اخبار پر بہار رشک

در شاہوار فرمایند بہد از بلدہ نوازی نخواہد بود۔

زیادہ تا زندگی بلذگی)۔

”نور احمد چشتی لاہوری عفی عنہ“

”غزل“

وہ جو پہلو سے اٹھ درد دل ایسا اٹھا

ضبط کی تاب نہ باقی رہی چلا اٹھا

حالت عشق مری دیکھ کے وہ ہلستا تھا

کیوں رہے ہاں اب تو بتا شور یہ کیسا اٹھا

صایہ میکشی کا دور کرو جلد شروع

ماہ نو دیکھا جو ابرو سے اشارہ اٹھا

موسا لافز تھا میں اور لوگ مجھے ہڈتے تھے

لن ترانی ہوئی موقوف جو پردا اٹھا

جس ٹھہری ہار کے کوچے سے نکلا مجھ کو

راہ میں ضعف سے سو بار میں بیتھا اٹھا
اس کی انت سے بھلا فائدہ کیا نکلا ہے
نام بد نام ہوا مفت میں پیسا اٹھا
عشق کے رمز و کدایہ کی سمجھ میں یارو
مجنوں مشہور تھا پر 'چشتی' بھی ویسا اٹھا

۹ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء کی اشاعت میں دہلی کے پھر آباد ہونے کی
خبر اس طرح دی گئی ہے :-

"کار سپانڈنٹ دہلی نے خط مورخہ یکم مارچ میں یہ لکھا کہ
شہر دہلی میں اہل ہنود بستے جاتے ہیں اور خال خال
مسلمان بھی آباد ہوئے ہیں جن کی نسبت احکام خاص ہوئے
ہیں۔ چاندنی چوک اور دریہ میں کچھ رونق ہو گئی ہے
شہر میں تھانجات بھی بجز کوتوالی ابھی قائم نہیں ہوئے
بلکہ تمام شہر میں ابھی چوکھڑا بھی مقرر نہیں ہوئے مگر
تھانجات بیرونی قائم ہو گئے ہیں باغ شاہی واقعہ چاندنی چوک
کی تھاری بلام نہاد باغ کمپلی ہوتی ہے ... بادشاہ کی نسبت
ابھی حکم اخیر نہیں ہوا مقدمہ زیر تجویز ہے شہر کے اندر
آمد و رفت ساکنان دہلی کی بلا حصول پاس حاکم کے نہیں
ہوتی ... کہتے ہیں شہر کے اندر باون سڑکیں نکلیں گی اور
فصل شہر منہدم ہوتی :-

اس سال خطوط علم اور ذکر علم دھن ان عنوانوں پر مہینوں

مہاسین نکلتے رہے —

۱۳ اپریل ۱۸۵۸ء کا اخبار یہ خبر دیتا ہے لکھنؤ میں یہ اشتہار جاری ہوا

ہے کہ جولوگ باہر چلے گئے ہیں تین دن کے اندر واپس آکر اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں اور دکانیں کھول لیں ورنہ باغی تصور کئے جائیں گے اور ان کے گھر اور دکانیں لوٹ لی جائیں گی۔

ہمارے بھائی | چشمہ فیض لاہور سے نکلتا تھا۔ یہ پلندریہ روزہ تھا۔ مندرجات کے اعتبار سے اس کو رسالہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا 'فوائد الناظرین' کی طرح اس میں علم و ہنر سے متعلق ہی مضامین اور ترجمے ہوتے تھے۔ ان کے سوا سرکاری سرکلروں اور حکموں کے اعلان وغیرہ۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

”کیفیت مقناطیس“

”ہزار شکر و احسان خالق ہے کہ جلے اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کو نعمائے گوناگوں سے ہم لوگوں کی پرورش و آسائش کے واسطے مرتب کیا یہ زمین اندر باہر سے بے انتہا نعموں سے معمور ہے جتنا ہم غور کریں اتنا ہی کرشمہ نظر آتا ہے دیکھئے اس مٹی کو جسے ایک ادنیٰ ترین سمجھتے ہیں کیا کیا جوہر ملے ہوئے ہیں ہر ایک ذرہ سے اسی نور کا ظہور ہے چشم بیدا چاہئے ورنہ جاہل کی نظر میں جوہر و کلکر ایک برابر ہے۔“

(اشاعت ۲۸ فروری سنہ ۱۸۵۸ء) پھر مقناطیس کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ اسی اشاعت میں ڈاک بجلی یعنی ٹیلیگراف۔ سیر کرۂ زمین۔ وسعت عالم۔ سمندر میں لوہے اور پتھر کا ترنا۔ 'باکو' کا آتش فشاں پہاڑ وغیرہ مضامین ہیں۔ (مزدہ فتح راحت کذہ بہ تفصیل تمام) جو اسی اشاعت کو رونق دے رہا ہے زبان کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں:-

”واضح ہو کہ فاضل محمد خاں ناسی جاگیردار ریاست بھوپال

نے راہ بغاوت اختیار کیا تھا اور بہ تلبیس ابلہس خبیث
 باتفاق اور اخوان الشیاطین کے قلعہ راحت گڈہ کو ملجا و
 ساوا بنایا تھا - ۲۵ تاریخ ماہ حال کو فوج ہندوستان قلبی
 زیر حکم میجر جنرل سر مہوروز صاحب بہادر کے راحت گڈہ پر
 پہنچی کلارہ جو پر جر معاذی قلعہ مذکور واقع ہے کچھہ مفسد
 نظر آئے فوج سرکاری نے تاخت کی باقی پیٹھ دکھا کر قلعہ
 میں گھس گئے افسران فوج انگریزی تدابیر محاصرہ میں مصروف
 ہوئے اور اتواپ قلعہ شکن نصب کر کر قلعہ پر گولہ اندازی
 شروع کی ۲۸ دین تاریخ کو دیوار توڑ ڈالی اور حملہ کی
 تیاری ہوئی مفسد خوف جان سے سیاہی شب میں فرار کر گئے
 بہت سے ماخوذ بھی ہوئے - فاضل محمد خان موجد فساد اور
 کامدار خاں پلندارہ بھی گرفتارین سے تھہ دروازہ قلعہ پر براہ
 پھانسی رہ سپر فنا ہوئے کار بد کردہ را جزا میں است -

اس کے ساتھ اردو اخباروں کا پہلا دور ختم ہوتا ہے - اس دور
 کے خصوصیات حسب ذیل قرار دیے جاسکتے ہیں :-

۱ - سنہ ۱۸۵۷ ع کے ہنگامہ سے قبل سیاسی اور امور خارجہ میں اردو
 پریس نسبتاً بہت دلچسپی لیتا تھا لیکن اس شورش کے بعد اس کا
 لب و لہجہ بہت نرم اور مصلحت وقت کے تابع ہو گیا -

۲ - نواید الماظرین ابتداء سے مگر دوسرے اخبار سنہ ۱۸۵۸ سے مغربی علوم
 و فنون کی اشاعت میں سرگرم ہو گئے -

۳ - اردو کی فزلیں کبھی کبھی ہر اخبار میں شایع ہوا کرتیں اور شعرا
 اخبار میں اپنے کلام کی اشاعت پر ناز کرتے -

۴ - اب تک اردو اخباروں میں اشتہاروں کا وجود نہ تھا - اخبار یا مطبع والے جو کتاب نکالتے اسی کا اشتہار چھپتا - جیسے کوہ نور کی جملتری -

۵ - اس عہد کی زبان اگرچہ باغ و بہار کی زبان نہ تھی لیکن قدامت کے نقش سے معرا نہ تھی - فارسی انشا کا تتبع حاوی تھا مثلاً صفت اور مضاف کو موصوف اور مضاف الیہ سے پہلے لانا - یہ جو کبھی دونوں فارسی ہوتے اور کبھی ایک فارسی اور ایک اردو یعنی ہندی - یہی مسلک واعطف کے ساتھ ہوتا - علم معانی کی کتابیں جو اس زمانے کے بہت پہلے سے متداول نہیں ان انشاپردازوں کے ذہن پر حاوی نہ تھیں - ایسی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آئیں مثلاً :

راقم چٹھی - صاحب چٹھی - انتخاب ایک چٹھی کا - اجازت اندر جانے کی لی - بیگم صاحبہ بیٹھی تھی - چوں (بجائے چونکہ) - بہ حصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوت کے - چارج عہدہ جج کا تھا - وہ (وہ کی جمع) - بہ نسبت سابق صحت رکھتے ہیں - کارسپانڈنٹ (بجائے نامہ نگار) - بلا حصول پاس حاکم کے - جوہر و کلکر - وغیرہ وغیرہ -

۶ - املا کی بابت یہ باتیں نوٹ کے قابل ہیں :-

(۱) فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقتوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے - عبارت کو پیراگرافوں میں ضرور تقسیم کر دیتے تھے -

(۲) الف مفہوم کے بعد واو لکھتے کہ رواج عام تھا جو بعد میں مدت تک جاری رہا -

(۳) 'چھوڑ کر' اور 'چڑھ آئے' جیسے الفاظ میں وہ 'ڑ' کی جگہ 'ڑ' لکھتے تھے -

(۴) 'مجھکو' بگھر ہاے ہوز کے 'مجھکو' لکھتے اور مستر میں 'ت' کی

جگہ 'ت' استعمال کرتے —

(۵) انگریزی املا کی صحت اس قدر مد نظر تھی کہ ستمبر اور دسمبر ہی

لکھتے۔ اب کی طرح ستمبر اور دسمبر نہیں —

(۶) بمبئی میں 'م' کی جگہ 'ن' لکھتے جیسے ہم اب تک 'سلمہالہا'

میں لکھتے ہیں —

(۷) 'جس' پر 'کہہ کر' وغیرہ ملا کر لکھتے یہی سلوک فارسی کے

لواحق و روابط سے ہوتا —

(۸) 'میں نے' کو صرف ایک 'نون' کے ساتھ ملا کر لکھ دیتے —

(۹) الف مددودہ پر علامت مد ضرور ہوا کرتی لیکن ہاے ہوز کو اگر

کبھی دو چشمی شکل دیتے تو اس مقام پر جہاں وہ مخلوط التلفظ

نہ ہوتی۔ یاے معروف و مجہول کے امتیاز کا تو ذکر ہی کیا —

املا کے بارے میں زیادہ کہنا بے سود ہے کیونکہ صوبہ آگرہ اور

پنجاب دونوں صوبوں میں املا کے قاعدے بہت بعد میں مدون ہوئے —

لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو کے ابتدائی زمانے کی کتابوں میں املا کا طریق

خاص مدت تک وہی رہا جو قدیم سے چلا آرہا تھا۔ انشا میں آج کل

کی طرح عربیت حاوی نہ تھی بلکہ فارسی کی آمیزش زیادہ تھی لیکن

ایسی کہ اس کو گلستاں بوستاں پڑھا ہوا اچھی طرح سمجھ سکتا تھا —

مدعا نگاری اس زمانے کی صحافت کی بہر حال تعریف کے قابل ہے —

وہ لوگ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر سکتے تھے —

سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک

اب ہم اس زمانے میں پہنچتے ہیں جو اردو صحافت کی نقرئی

جوبلی کا زمانہ ہے یعنی اس کی عمر کم و بیش پچیس برس کی ہو چکی ہے۔ اب سنہ ۱۸۵۸ کی افرائنری اور بے اطمینانی دور ہو چکی ہے۔ انگریزی حکومت ملکہ وکٹوریہ کے زیر نگیں مستقل اور برقرار ہو چکی ہے۔ اب حاکم و محکوم میں وہ مغایرانہ انداز اور معاندانہ ادا نہیں رہی جو سنہ ۵۷ سے پہلے تھی۔

۳ جنوری سنہ ۱۸۶۰ ع کے پرچہ میں ایک قطعہ تاریخ کا عنوان کوہ نور نہایت دلچسپ ہے لکھتے ہیں:-

”قطعہ تاریخ شوالہ و سراے دتالاب تعمیر کردہ لالہ رتن چلہ

’ریش دراز واقعہ بہرون شاہ عالم دروازہ شہر لاہور‘ —

یہ چھڑیں اب بھی موجود ہیں اور ان کے موجودہ قابض دیوان کشن کشور صاحب ’ڈارمہیوالا لکھ جاتے ہیں جس طرح ان کے مورث اعلیٰ دیوان کرم چند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار سے ’ڈارمہیوالا‘ کے لقب سے ممتاز تھے۔ لیکن کوہ نور کے صاحب تحریر نے اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا۔

یہی اشاعت صفحہ ۱۴ پر خبر دیتی ہے:-

”کمرشل گزٹ الہ آباد سے دریافت ہوا کہ دفتر صدر دیوانی

آگرہ کی نسبت حکم ہوا ہے کہ ۱۵ جنوری سنہ ۶۰ کو الہ آباد

میں جاری ہو مدت ہوئی تین سپاہی رجمنٹ ۵۳ شاہی کے

بیچ علت نکالنے چار ہزار روپیہ کے خزانہ الہ آباد سے گرفتار

ہوئے تھے ان کا مقدمہ سپریم کورٹ کلکتہ میں پیش تھا اب

حکم آیا ہے کہ ایک سپاہی ۶ برس اور دو سپاہی چار چار

برس کو قید کئے جائیں۔“ —

۱۰ جنوری کا اخبار خبر دیتا ہے :-

” تھاری جناب نواب لفتنت گورنر بہادر کے استقبال جناب نواب معلی القاب اسیر کبیر گورنر جنرل کے واسطے ہو رہی ہے بھاس تک تشریف لے جانے کی خبر ہے ’ شعلہ مار ’ باغ کی آراستگی خوب ہو رہی ہے “ —

۲۱ جنوری کا پرچہ ایک عجیب خبر دیتا ہے :-

” اودہ اخبار سے معلوم ہوا کہ صاحب والا شان چھٹ کمشتر اودہ کو علاقہ اودہ میں رواج زبان انگریزی کا عموماً بہت جلد منظور ہے اور باجراہ حکم محکم تحصیلداران و سرشتہ داران کو مجبور کیا ہے کہ در صورت نہ دیئے امتحان زبان انگریزی کے شروع سنہ ۱۸۹۱ سے دے لوگ برخاست ہو جائیں گے ... ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ علقریب یہ حکم پنجاب بھی میں بھی نافذ ہونے والا ہے اور غالب ہے کہ یہاں نیچے کے عہدہ داروں کو تاکید سیکھنے تحریر زبان اردو کی حروف انگریزی میں ہوگی اور عرایض مستغیثاں بھی اسی تحریر میں داخل ہوا کریں گی “ —

۲۵ فروری سنہ ۶۰ کے پرچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کراچی

سے سکندریہ تک بھری تار برقی کا اجرا ہوا —

۳ مارچ کا اخبار منظر ہے کہ :-

” دہلی ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تیاری سوک آہنی کی دہلی سے آگرہ کو بڑی دھوم دھام سے ہو رہی ہے - اگلے سال لاقی چل نکلے گی کہتے ہیں کہ اس کے کارخانہ کے مکانات کی عمارت دریائے جمن سے اس طرف شہر کے اندر

تھری ہے اور سنا ہے کہ درپہ کلاں واقعہ چاندنی چوک کی عمارات قدیم مسمار کی جاویدگی اور وہاں عمارات کارخانہ دیلوے تیار ہوں گی چنانچہ پیسود بھی ہوگئی ہے اور حکم انہدام مکانات مذکوریں کا سنایا گیا ہے مگر لوگوں نے عرضی اپنی بہ حضور جذاب کورنر جنرل صاحب بہادر ارسال کی ہے۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں پہلا سرکاری مدرسہ اس مہینے (مارچ سنہ ۶۰) میں جاری ہوا :-

۷ اپریل کا پرچہ ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے - صفحہ ۲۸۴ میں درج ہے :-

”تتمہ تقریر مسٹر جیمس ولسن مشیر مالی گورنمنٹ ہند درخصوص تقرر تمس ہاے جدید در انجمن قانونی منعقدہ ۱۸ فروری سنہ ۶۰ روز شنبہ اکثر پوشیدہ نماند کہ ایں ہمہ اسباب وجوہ اختلاف حساب ہارا کہ بمعرض تبیان درآوردیم غرض من ازاں چلیں نمی باشد کہ ہیچگونہ معذرتے درخصوص آن نوع طویقہ ترتیم ...“

اصل اخبار کے دیکھنے سے یہی پایا جاتا ہے کہ اصل تقریر فارسی ہی میں ہوئی تھی - اگر سنہ ۱۸۹۰ ع میں گورنمنٹ انڈیا کا ایک کا بیلہ کا وزیر فارسی زبان سے رجوع لاتا ہے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں - کا بیلہ یعنی کیبلیمت کے منستروں کا نرالا پن اب بھی وہی ہے جو ساتھ ستر برس پہلے تھا چنانچہ ۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ کو روائٹر لندن سے تار دیتا ہے کہ رائٹ آنریبل مسٹر والٹر الیٹ مسٹر ایگریکلچر نے ایپرڈین کی برٹش ایسوسی ایشن میں دیلیٹویتی یعنی نظریہ

اضافیہ پر نظم میں تقریر کی۔ فلسفہ اور سائنس کے مسئلوں پر نظم میں بحث کرنا ایسے ہی بڑے آدمیوں کا کام ہے جس طرح کہ مالی امور پر فارسی میں تقریر کرنا —

یہ پرچہ آگے چل کر صفحہ ۲۱۸ پر خبر دیتا ہے :-
 ”بیبئی میں لڑکیوں کی تعلیم بھی بہت ترقی پر ہے۔ خاص
 قوم پارسیوں میں لڑکیوں کے چار مکتب ہیں۔ اور قریب
 چار سو لڑکیوں کے ان میں تعلیم پاتی ہیں۔ سوائے پارسیوں
 کے دو مرہٹوں کے اور دو گجراتیوں کے اسکول اور ہیں اور
 ان میں ۲۵۱ لڑکیاں پڑھتی ہیں“ —

سوشل اصلاح کے حامیوں کے لئے یہ خبر دلچسپ ثابت ہوگی :-
 ”معلوم ہوا کہ شادی بیوگان ہلود کا پونا میں بڑا چرچا پھیل
 رہا ہے اور بہت لوگ اس بات کے رواج دینے پر مستعد ہیں
 برہمنوں کے کئی افضل خاندانوں میں کئی بیوہ عورتوں کی
 شادی کی گفتگو ہو رہی ہے اور تین سو بیوہوں اور پلندتوں
 کے قریب اس رائے پر متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ پندراۓ
 مناسب اور دھرم شاستر کے موافق ہے یہ رواج کئی برس
 سے جاری ہو گیا ہے“ —

ایک اور خبر یہ ہے کہ :-

”۲۵ اپریل کو شام کے وقت جناب مہاراجہ صاحب بہادر والے
 پتھالہ لاہور سے بہ سبیل ڈاک سیچ گاڑی لالہ کداریاتہ معہ
 جلد اکابر ریاست پتھالہ کو تشریف لے گئے“ —

۵ مئی سنہ ۱۳۵۰ ع کی اشاعت میں دہلی کی یہ خوش خبری درج ہے :-

”سنئے ہیں کہ جناب نائب السلطنت امہر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر نے براہ الطاف خمسہ روانہ ارشاد کیا ہے کہ جامع مسجد دہلی مسلمانان دہلی کو واپس مل جائے۔“

یہی اشاعت مدرسہ سرکاری لاہور کی بابت چند دلچسپ امور کا ذکر کرتی ہے۔ اس مدرسہ کے کہلنے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لکھا ہے :-

مستور میتی صاحب بریلی سے طلب ہو کر مدرس مقرر ہوئے ... ایک مدرس فارسی بھی مقرر ہوگا۔ ایک پلڈت شاستری بھی مقرر ہوگا۔ درجہ اول میں فرزند ان راجاں ورثیسان و سرداران کمرہ علاحدہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ درجہ دوم میں اکثر فرزندان عہدیداران سرکاری و مہاجناں وغیرہ عزت داران کمرہ جداگانہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ درجہ سیوم میں عام بھلے مانسوں کے لڑکے درس پاتے ہیں۔ طلباء درجہ اول کی فیس تین روپے ماہوار ہے ایک روپیہ تک باقیوں سے ۸ آنے حق التعلیم۔ مکان تعلیم حویلی راجہ دھیان سنگھ صاحب سرگباسی تجویز ہوئی ہے۔“

کہتے ہیں انسانوں کی طرح مکانوں کی بھی قسمت ہوتی ہے۔ یہ حویلی راجہ دھیان سنگھ کی ضرور ایسی ساعت میں بنی ہوگی کہ اکثر و بیشتر تعلیمی اور ادبی کاموں کے لئے استعمال میں آیا کرے۔ یہ پنجاب کا پہلا سرکاری سکول اس مکان میں قائم ہوا۔ اور لاہور کا گورنمنٹ کالج بھی اسی مکان میں شروع ہوا۔ اخبار عام کا دفتر اردو مطبع بھی برسوں یہاں رہا۔ تا اکثر اپنی بسنت جب تھیں سو فیکل میں شامل ہو کر پہلے پہل لاہور آئیں تو ان کے لکچر اسی مکان میں ہوئے۔ سوامی و ویکانڈ کی فلسفیانہ آواز بھی اسی مکان میں گونجی اور اب دیپال سنگھ ہائی سکول ابعدا سے

اسی کے زیر سایہ چل رہا ہے۔ اب اس ابتدائی مدرسہ کا حال سنہ درجہ اول میں جس کا ذکر آئے آیا انتیس طلبہ داخل ہوئے۔ درجہ دوم میں ۲۱ مئی سنہ ۶۰ کو اتھارہ سے سیلتائیس ہو گئے۔ درجہ سوم میں صرف چھ لڑکے پڑھتے تھے۔ لڑکوں سے داخلہ کے وقت 'زر شگون' لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اول دن یعنی ۱۲ مارچ کو تین سو تیس روپیہ شگون کی مد میں رئیسوں کے شہیدہ میں وصول ہوا۔ لیکن بعد میں اس 'زر شگون' کی رقم معین ہو گئی۔ یعنی صنف اول کے لئے چار روپے سے سات روپے تک صنف دوم کے لئے دو روپے سے چار روپے تک —

اتک کے کمارے پل بنانے کے لئے سخت دقت پیش کرتے تھے اس لئے ابتدا میں یہ تجویز قرار پائی تھی کہ، اتک کا پل زمین دوز بنایا جائے، یعنی اس کے نیچے سرنگ نکالی جائے۔ ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۶۲ کا کورہ نو اس کی بابت یہ لکھتا ہے:۔۔۔

”تھاری پل زمین دوز اتک اب بدستور دونوں جانب میں جاری ہے۔ سابق جو پانی آگیا تھا اب سب خشک ہو گیا ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ کل طول اس پل کا اس پار سے اُس پار تک پندرہ سو فٹ ہے جس میں سے ۳۸۰ فٹ ایک جانب سے اور ۲۶۸ فٹ دوسری جانب سے کھد چکا ہے۔“

۱۸ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء کا اخبار لاہور میں پہلے پہل آنریری میجسٹریٹوں

کی خبر دیتا ہے جو کئی وجوہ سے نہایت دلچسپ ہے ملاحظہ ہو:۔

”سوموار کے دن ۱۳ جنوری کو خاص کوٹوالی شہر لاہور میں

حسب منظوری جناب نواب لغٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دام اقبالہ

ایک جلسہ شایان تفویض اختیارات آنریری میجسٹریٹ ہو“۔

” ہدایت آنریری مجسٹریٹ لاہور —

” اجلاس کوتوالی میں ہو - آپس کے مشورہ سے باریاں باندہ لیں گے“

” دفعہ ۵ - ان کے پاس ایک منشی مشاہدہ دار تھس روپے کا

بمنظوری صاحب کمشنر بہادر مقرر کھا جائے گا —

دفعہ ۶ کسی طرح مثل فارسی و اردو میں مرتب نہ کی جائے گی

کل تحقیقات زبانی ہوگی - مستغیث خود حاضر ہو کے زبانی

۱۔ متغاثہ کریں گے - عرضی دینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے —

” دفعہ ۷ - تعمیل زبانی احکام آنریری مجسٹریٹوں کی ذمہ

سپر نٹلڈنٹ پولیس شہر کے ہے - اور ایک سہاوی خواندہ

پولیس کا آنریری مجسٹریٹوں کے پاس واسطے تحریر نام

گواہان ... حاضر رہے گا —

اختیارات پچاس روپیہ جرمانہ - تین ماہ قید یہ عدالت بھی خاصی

نوشیروانی ہوگی - بیکسٹیلڈ نے ایک ناول میں کاغذ قلم دوات کو بہت

دلکا ہے - اس نے تو صرف ایک دلی خواہش کا اظہار کھا تھا - یہاں عملاً

ع - کاغذ بدریدند و قلم بشکستلد - کا مضمون ہے —

اسی اشاعت میں ” جناب معلی القاب نواب لغت گورنر بہادر پنجاب“

معمہ ” جناب دیوس صاحب سکرٹری اعظم لاہور“ کی ” بہ سبیل سنج

گازی کلکتہ کی روانگی کی خبر درج ہے اور لکھا ہے یقین ہے کہ عرصہ

ایک مہینے تک واپس آجائیں گے - اس سے اگلی اشاعت میں درج ہے

” خبر معتبر ہے کہ ۲۳ یا ۲۴ ماہ حال تک نواب لغت گورنر بہادر پنجاب

روٹی افروز کلکتہ ہو جائیں گے“ - صاحب موصوف ۳۰ جنوری کو کلکتہ سے

واپس روانہ ہو کر ۹ کو لاہور پہنچے گویا اس زمانے میں لاہور سے کلکتہ

کا سفر دس یا گیارہ دن میں طے ہوتا تھا۔ اس سے عام لوگوں کی مدت سفر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کو ضرور گفتگو کرنے سے زیادہ ہی مدت سفر میں گزرتی ہوگی۔ اب یہ زمانہ ہے کہ پبلک ریلوں کی سمت رفتاری کی شکایت کرتی ہے اور اگر کوئی تین دس پانچ منٹ لٹ ہو جائے تو مسافروں کو ناگوار گزرتا ہے۔

۸ فروری کے اخبار میں ایک نامہ نگار قیرہ اسماعیل خان سے فارسی

میں ایک خبر لکھتا ہے۔ یہی اخبار مضرب ہے :-

”نیلام پشیمیلہ جو لندن میں ہر ششماہی کو ہوتا ہے اب کی دفعہ ۹ تاریخ دسمبر سے ۱۲ تاریخ ماہ مذکور تک ہوا اشتہارات نیلام تجاران شال امرتسر کے پاس آگئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب کے نیلام میں مال پشیمیلہ تحفہ و اعلیٰ کشمیری و پلجابی برابر قیمت کو فروخت ہوا تجاروں کو نفع ہوا نہ نقصان اور مال پشیمیلہ جلال پوری و لدھیانہ و نور پوری وغیرہ جس میں اون کرمانی دروٹی مستعمل ہوتی ہے نہایت ناپسند ہوا اور قیمت بھی کم وصول ہوئی ... ہم شالہافوں کو بہ تاکید تمام آگاہ کرتے ہیں کہ اگر دے اس کہوت سے باز نہ آویں گے اور پشیمیلہ اصل میں خراب اون ملا دیں گے تو پشیمیلہ کی بکری مالک یورپ میں ہرگز نہ ہوا کرے گی۔“

”لاہور میں حکام کی مہربانی سے سب طرح خیریت ہے۔“ یہ

لکھ کر پھر باغ شعلہ مار کا ذکر آتا ہے۔

لاہور میں ابھی تک ریل تو نہیں آئی لیکن ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء

کو اس کا کچھ سامان لاہور میں آتا ہے۔ اس کے استقبال کی کھلیت

کوہ نور اس طوح لکھتا ہے —

” ۱۲ تاریخ کو سامان ریل بڑے تعجل اور شان سے یہاں پہنچ گیا جملہ صاحبان عالیشان اور مهم صاحبان اور رنہسان لاہور اس کے لانے کے واسطے تھیں کوس کے فاصلہ پر تشریف لے گئے تھے ہزار ہا باشندگان شہر کا ہجوم تھا - سپاہ گورہ و پولس کی چاروں طرف ریل کی حفاظت تھی - کئی سو بول بامداد پانچ ہاتھوں کے اوس کو نہایت آہستگی سے کھینچتے لاتے تھے قریب شام سب سامان بھرون دروازہ دہلی متصل کارخانہ ریلوے آکر تھرا۔ اب ہر روز وہاں میلہ لگا رہتا ہے - اسی دن رات کو صاحبان عالیشان نے بتقریب ورود ریل جلسہ عیش و طرب کا ترتیب فرما کر باہم شغل اکل و شرب فرمایا - خبر ہے ۳ مارچ کو لاہور سے امرتسر تک ریلوی جاری ہو جاوے گی۔“

(یہی اخبار ہندوستان میں ” آہلی سوکوں “ کی کھلیٹ یوں لکھتا ہے)

” آخر سنہ ۱۸۶۱ع میں منجملہ کل ۲۹۳۳ میل کے جو کہ تمام ہندوستان میں زیر تیاری تھے ۱۳۶۰ میل پر ریل جاری ہو گئی مشرقی ریل [ایست انڈین ریلوے سے مراد ہے] چند روز میں چار سو میل تا مقام منگھیر رواں ہوگی اور دریائے سون پر عالیشان پل جون تک تیار ہو جاوے گا ایک سوک آہلی دہلی سے آگرہ تک بنے گی اور اس کی پیمائش ہو چکی ہے مہتمم فریلڈ اف انڈیا کو امید ہے کہ سنہ ۱۸۶۳ کے موسم برسات تک کلکتہ سے تا دہلی برابر سلسلہ آمد و رفت کا بسواری ریل جاری ہوگا - مدد اس میں ناگپور کی لہن بھی اختتام کو پہنچی لیکن

بالفعل جاری نہیں ہے اور کلکتہ سے جانب جنوب و شرق والی ریل ۲۹ میل مقام متلا تک تمام ہو چکی ہے صرف ایک پل باقی ہے وہ بھی چند ہفتوں میں کھل جائے گی اور ہوزا میں کارخانہ تجارت کی ترقی پکڑنے سے گورنمنٹ کی تجویز یہ ہے کہ ایک پل بنادیا جاوے [ھگلی پر] کہ وہاں سے مال کی آمد و رفت کلکتہ میں ہونے لگے اس پل کا صرف پندرہ لاکھ روپیہ ہوگا اور بطرز عجیب ھنگا —

آخر بہ قول کوہ نور مورخہ ۸ مارچ سنہ ۱۸۶۲ ع ”یکم تاریخ مارچ سنہ ۱۸۶۲ ع لاہور سے امرتسر تک ریل بڑی دھوم دھام سے جاری ہوئی یہ دن مبارک تھا کہ تواریخ پنجاب میں ہمیشہ نے لئے یادگار رہے گا۔“ قطعہ تاریخ اجراء ریل از لاہور تا امرتسر من تصنیف دیوان امر ناتھ صاحب رئوس لاہور“ بھی لطف سے خالی نہیں۔ فرمایا ہے :-

ریل گردید رواں از لاہور سوے امرتسر ودل ہا شد شاد
مغز سرود ز دودش ہمہ خوں گلخندش آتش جان شداد
بروش تیز چو عقل صانع بدوش تیز چو فکر استعاد
صرف گردید بسے آہن و سنگ رہ متیں گشت چو سطح فولاد
شہ انگلیتہ طلسمے عجیبے کرد در ملک خویش ایجاد

نقش بر بال پری بست چلیں

می پرد تخت سلیمان برباد

سنہ ۱۸۶۲ ع

(”لاہور سے امرتسر تک درجۂ اول کی گاڑی کا کرایہ تین روپے اور درجۂ دوم کا دو روپے اور درجۂ سوم کا ۴ آنے ہوگا۔ ایک گھنٹہ

چالیس ملت میں یہ ۳۲ میل کا فاصلہ طے ہوگا۔ —

اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۹۰ ع کو خزانجات سرکاری ممالک ہند میں ۱۷ کروڑ ۷ لاکھ ۳۸ ہزار ایک سو چودہ روپیہ موجود تھا بمقابلہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ ع کے جب کہ یہ میزان ۱۴ کروڑ ۷۳ لاکھ ۵۵ ہزار چار سو سینتیس تھی —

بریلی کے ایک نئے مطبع ’جلوہ ظہور‘ کا اشتہار جو ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۹۲ ع کے کوہ نور میں مالک مطبع مذکور نے جاری کیا قابل دید ہے۔ لکھتے ہیں:—

”راے جہاں آراءے صاحبان دانہں اور دانہں پسندان ہمت
بلند پر مخفی نہ رہے کہ خالق کائنات اور آفرینندہ موجودات
نے انتظام سلسلہ جہان و جہانیاں کا ساتھ علم اور عقل کے
وابستہ فرمایا ہے ...“ —

۳ مئی سنہ ۱۸۹۲ کے اخبار میں لوکل اس طرح لکھتے ہیں:—

”لاہور میں سب طرح خیریت ہے ہر چند مٹی شروع ہوگیا
چندان گرمی نہیں ہے بلکہ رات کو کبھی کبھی ایسی سردی
پڑتی ہے کہ دھائی کی حاجت ہوتی ہے“ —

یہاں موسم کا اب بھی یہی حال ہے جو اب سے بہتر برس پہلے تھا۔
پہلے قانون ایسا تھا کہ جس مقدمہ میں کوئی یورپین ایک فریق
ہو وہ صرف کلکتہ ہی میں سماعت ہوتا تھا۔ خود یورپین لوگوں کو اس
میں ہوی زحمت ہوتی تھی ذرا ذرا سے معاملے کے لئے ہندوستان بھر کے
کوٹے کوٹے سے کلکتہ جانا پڑتا تھا۔ اس لئے انہیں نے وادیا کر کے اس قانون
کو ترمیم کرایا۔ ابھی یہ ترمیم نہیں ہوئی تھی کہ ۵ جولائی سنہ ۱۸۹۲
کے کوہ نور نے یہ خبر شایع کی:—

”پہانسی۔ اسی اخبار [دہلی گزٹ] میں لکھا دیکھا کہ کلکتہ میں ۲۳ تاریخ جون کو صبح کھوقت مسٹر ’رے‘ نام ایک صاحب پہانسی دئے گئے جنہوں نے راولپنڈی میں ایک ہندوستانی کو بندوق سے ہلاک کیا تھا اور مقدمہ ان کا حسب آئین سوگاد تفویض سوپریم کورٹ ملکتہ ہوا تھا۔ قریب تین ہزار صاحبان و پانسو دسواں کلکتہ نے جذاب لارڈ الجن صاحب بہادر گورنر جنرل کی خدمت والا میں التجا کی تھی کہ ازراہ ترحم رے صاحب مدوح کی نسبت عوض سزا قصاص حکم حبس دوام بعبور دریاء شور ہو جائے لیکن جذاب معشمالہ نے اس کو نا منظور کیا“ —

لاہور کے لارنس گارڈن کی تاریخ جسے کوہ نور ”تاریخ یادگار باغ سرجان لارنس صاحب بہادر لفتلٹ گورنر سابق پنجاب“ کہتا ہے جو ”محمد مردانعلی خاں صاحب المتخلص بہ رعنا کی تصنیف سے ہے قابل ملاحظہ ہے۔ لکھتے ہیں:—

لفتلٹ پنچ آب تہ سرجان لارنس تہ نیکلام بسکہ وہ صاحب دل و دماغ باغ جہان میں نام رہ تاکہ تابہ حشر لاہور میں یہ اونکا بنا یادگار باغ ’رعنا‘ نام باغ سے دیو دے لئے عدد روشن سن مسیح ہوا صورت چراغ ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ لڈکا شایر (جسے کوہ نور لہن ’کشائر‘ لکھتا ہے) پر اس سال کوئی مصیبت آئی تھی کہ وہاں کے باشندوں کی امداد کے لئے ہندوستان میں جگہ جگہ چلے ہوئے چنانچہ دہلی میں چار سواکیانوے اور امبالہ میں پیک الی سوداگر کی کوشش سے ”معتدا جان لہن کشایر“ کی امداد کے لئے ایک ہزار تین سو سولہ روپیہ چلے ہوا۔

اسی اخبار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ خطوط وغیرہ پر ٹکٹ اسٹامپ نصف آنہ لگانے کا دستور سنہ ۱۸۵۴ء میں جاری ہوا تھا - ۱۱ اکتوبر کی اشاعت دہلی میں تعلیم نسوان کی ترقی پر اطمینان کی روشنی ڈالتی ہے - جزیرۂ سراندیپ میں ”آمد سرکار“ کی توتھر کا ذکر کرتے ہوئے اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :-

”یہ خوبی حسن انتظام سرکار کی ہے ورنہ ہندوستانی ریاستوں میں اگر اس قدر بچت ہوا کرے تو یہ ریاستوں مالا مال ہو جائیں اور عمدہ طریق پر روپیہ صرف ہونے کے واسطے سرمایۂ کثیر جمع ہو مگر یہ بات نہ اہلکار ریاستوں کے چاہتے ہیں اور نہ خود رئیس پرواہ کرتے ہیں اور رعایا بھی چلداں خوش نہیں رہتی اکثر جگہ لوگ تلگ ہو کر انگریزی عملداری کی تمنا رکھتے ہیں اور اپنی سرکار کے شاکی ہیں۔“

(یکم نومبر سنہ ۱۸۶۲ء کا اخبار راوی ہے کہ :-

”لاہور کرائیکل سے معلوم ہوا کہ لاہور میں جو یادگار سرجان لارنس صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اول پنجاب کے واسطہ ایک مکان ’جان لارنس ہال زر چلندہ سے تعمیر ہو رہا ہے اس کی امداد کے واسطہ راجہ صاحب بہادر فرید کوت نے پانسو روپیہ عطا فرمایا ہے۔“)

”لہن کشایر“ کے ”محتاجین“ کی امداد کے لئے ہندوستان میں

جگہ جگہ سے چندوں کی خبریں اس مہیلے میں چھپتی رہیں :-

۲۹ نومبر کا اخبار یہ لوکل خبر دیتا ہے :-

”نریش کلکر دہلی دروازہ سے کوتوالی تک تیار ہو گیا ہے اب

وہاں سے ہندو ملت ہی تک شروع ہوا ہے پھر بھائی دروازہ تک جاے گا شہر کے گردا گرد نہر بھی خوب سرگرمی سے جاری ہے۔

”علماء اسکول مشن کو اب خوب رونق ہے قریب ایک سو طالب علموں کے تعلیم پاتے ہیں اور کمال خوشی کی بات ہے کہ ابتدائی مئی سنہ ۲۵ ماہوار کی امداد کا حکم اس سکول کے واسطے لغت گورنر نے بھی منظور فرمایا ہے۔ ۲۱ نومبر کو دو گاڑی ریل ملتان سے لاہور میں پہنچ گئی۔“

۶ دسمبر سنہ ۱۸۹۲ء کو یہ خبر دیتا ہے :-

”شاہ دہلی - اخبار لاہور کرانیکل میں از روے تحریر معتبر دیکھا کہ ۷ تاریخ ماہ گذشتہ کو رنگون ملک برہما میں مغلوں کا آخر بادشاہ ’ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی‘ اس دار ناپائیدار سے رحلت کرگیا اب اس خبر میں کچھ شک نہیں۔“

(ان دو برسوں یعنی سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۲ء کی کواہ نور کی

جلدوں میں حسب ذیل معاصرین کے حوالہ آئے ہیں :-

- ۱ لاہور کرانیکل - ۲ دہلی گزٹ - ۳ انگلشمن - ۴ کمرشل گزٹ
- ۱ لہ آباد - ۵ ٹینکس - ۶ ہرکارہ - ۷ لکھنؤ ہرلڈ - ۸ اخبار اودہ گزٹ -
- ۹ اخبار بمبئی گزٹ - ۱۰ اخبار سندھن - ۱۱ نورالابصار آگرہ -
- ۱۲ منہد خلیق - ۱۳ بمبئی ٹائمس - ۱۴ مجمع البکرین لدھیانہ -
- ۱۵ اودہ اخبار - ۱۶ شعلہ طور - ۱۷ فرینڈ آف ایفڈیا - ۱۸ اخبار
- انجمن ہند لکھنؤ - ۱۹ دہلی جنرل - ۲۰ پونا ابرزور -

اس اخبار کے نام کا تسمہ تھا ”کاشف الاسرار“ - بمبئی سے باہتمام
کشف الاخبار
 منشی امانعلی لکھنوی نکلے تھا - ایک عجیب بات جو اب

تک اور کسی اخبار میں نہیں دیکھی وہ اس میں یہ تھی کہ اس کا اشتہار نظم میں ازل صفحہ پر ہوتا۔ سارا صفحہ اسی سے پر ہوتا تھا۔

سنہ ۱۶ مئی ۱۸۶۱ء کی جلد سے :-

” کرچہ پہلے جب بحکم خبر حمد خالق و نعت پیغمبر
تب بہت دل مرا بکال ہوا مدح اخبار کا خیال ہوا
نام اخبار اب کروں اظہار کشف الاخبار کشف الاسرار
... ..
ہے یہ امید اہل دولت سے دستگیری کریں عنایت سے
... ..
شرح قیمت ملاحظہ ہو :-

سوا سکہ پہ ماہوار جو لے وہ سوا تیرہ سال پیشگی دے
... ..
بدۂ کو اخبار چھاپ لیتا ہوں پلچشلہ کو بانٹ دیتا ہوں
چند مہینوں کے بعد ان بھالہس شعروں کی جگہ صرف چار مصرع
وہ گئے۔ خبر اقلیم چین ملاحظہ ہو جو اشاعت مذکورہ سے نقل کی جاتی
ہے۔ عبارت آراؤی فسانۂ عجائب کو مات کرتی ہے :-

” متخبروں کا اظہار ہے کو ایف تازہ آشکار ہے کہ بالذہل دیا
چھن سے آگہوت آیا اس طرح کی خبر لایا کہ اب ادھر کا
ملکی کاروبار بسہولیت و آرام تمام جاری ہے ایام فساد کا
گزر گھا چھن و امنیت کی باری ہے - فغفور چین اپنی دارالسلطنت
کی طرف مراجعت فرما ہوا.....“

(ایک اور خبر یہ ہے :-

”خیر۔ صاحب انگلشیمن ظاہر کرتے ہیں حال آمدنی پیش
 ہے ہر ایک کو ماہر کرتے ہیں کہ شہر کلکتہ کے محکمہ سلطانی
 شیشن کورٹ میں جو کارپرداز قاعدۂ دین محمدی کے واقف
 کار اور مذہب ہندو کے پندت شاسترداں ملازم سرکار ہیں ان
 کو موقوف کریں گے۔“

۱۳ اپریل سنہ ۱۸۶۲ ع کا پرچہ نئے وائسرائے کے تقرر کی خبر اس

طرح لکھتا ہے : —

”خبر تشریف آوری گورنر جنرل جدید منشیان شیریں بہان
 فرخلدہ تحریر و دیہوان فال زبان ہمایوں تقریر اس خبر
 بشاشت اثر دلپذیر گریوں تسطیر کرتے ہیں کہ ملک ہندوستان
 گلشن نشان کے نئے گورنر جنرل“ —

آج کل کے اخباروں کے ادیتروں اور پڑھنے والوں کو ان پر اتم

بزرگوں کی فرصتوں پر ضرور رشک آتا ہوگا۔

یہ اخبار میرٹھ سے نکلتا تھا۔ منشی وجاہت علی خاں اس
 اخبار عالم کے مہتمم تھے اس زمانے میں مہتمم ادیتور کو کہا کرتے تھے
 اور اکثر وہی مالک بھی ہوا کرتا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت مورخہ
 ۵ جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع پر جلد ۵ نمبر ۱۰ درج ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار
 تھا اسی اشاعت میں میرٹھ کی لوکل خبریں نظم میں درج
 ہیں۔ فرماتے ہیں : —

”سردی اب کی برس ہے اتنی شدید کانپتا نکلے ہر سحر خیز شہد“

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ کا اخبار کار خیر کی ایک خبر اس

طرح سناتا ہے : —

”کار خیر - اخبار انڈین قیلی نہوز میں لکھا ہے کہ مسٹر پریم چند اور رائی چند رو سائی بمبئی نے سرکار گورنمنٹ کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ ہم چھ لاکھ روپیہ سرکار گورنمنٹ کو بلدوبست کرنے پائی سکنا سورت کے واسطے کہ ان کو بہت تکلیف ہے دیتے ہیں - عبارت کا الجھاؤ اور ضعف تالیف طبیعت کو بد مزہ کرنے والا ہے“ —

اگلی اشاعت میں دو کالم کا ایک مضمون ”تعلیم عورات“ پر ہے - جو اس طرح شروع ہوتا ہے :-

”ازدوری شرع شریف و دھرم شاستر کے پڑھنا لکھنا عورتوں کا جایز ہے بلکہ مذہب اسلام میں جیسا پڑھنا لکھنا مردوں پر فرض ہے اسی قدر عورتوں کو ہے“ —

یہ اپنے وقت کے نہایت ثقہ اخباروں میں سے تھا - دہلی سے نکلتا تھا مشہور و معروف حکیم محمود خاں اس کے مالک تھے - یکم جنوری سنہ ۱۸۶۰ ع جلد ۳ نمبر ۱ سے یہ دو اقتباس لیے جاتے ہیں جو جدید قانون ریلوے سے تعلق رکھتے ہیں - پایا جاتا ہے کہ زنانہ درجے میں مرد کے سفر کرنے کی سزا ایک سو روپیہ جرمانہ تھی - اور ”اگر کوئی افسر ریلوے جب کہ اپنی کام پر نشہ میں مخمور ہو جائے تو وہ ایک سال تک قید ہو سکتا ہے اور اس پر جرمانہ بھی ہو سکتا ہے“ —

اسی اشاعت میں در ہے :-

”قوانین جدید در باب اجرت خبرتار برقی“

”نیا طریقہ جو خبرتار برقی کے بہودیلے کے لیے مقرر ہوا ہے

ناظرین اخبار کے ملاحظہ کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اگر سو میل سے زیادہ فاصلہ پر نہ ہو۔ آتھ آنے۔ اگر سو میل سے

فاصلہ زیادہ ہو اور ۲۰۰ میل سے کم ہو۔ ایک روپیہ

... ..

اسی طرح اگر ۱۰۰۰ میل سے فاصلہ زیادہ ہو مگر ۲۰۰۰ سے کم۔ پانچ روپیہ

ماسوائے اس کے آتھ آنے فی پیغام بطور رسوم بابت رجسٹری کتاب

لیا جاوے گا اور معطلت نہ چہر اسی نہ لیا جاوے گا

پایا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کا چوتا بھی مدت تک ایک اہم سیاسی

مسئلے کی طور پر رہ چکا ہے۔ ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع کا اکل اخبار لکھتا ہے :-

” عرصہ چند روز کا گذرا کہ نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہاد

نے ایک حکم معرفت گورنمنٹ ماتحت کے صاحبان جج ہائی کورٹ

اضلاع ممالک بنکال اور ممالک مغربی کے پاس در باب دریافت

دائے اس امر کے بھیجا تھا کہ جن ہندوستانیوں نے انگریزی

وضع اور لباس کا پہننا اختیار کر لیا ہے جب وہ کچھری میں

آویں اور اس جگہ فرش ہو یا نہ ہو ان کا چوتا اوتارنا

مناسب ہے یا نہیں۔ بجواب اس کے صاحبان ہائی کورٹ

نے اپنی رائے مختلف لکھی ہے اب یہ امر ہائی کورٹ مدراس

سے دریافت کیا گیا ہے۔

۲۸ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کی اشاعت میں مرزا غالب کی تصویر کا

اعلان ہے۔ یہ تصویر مرزا کی آخری تصویر ہو گی کیونکہ سنہ ۱۸۶۹ ع میں

تو ان کا انتقال ہو گیا :-

” شبہ مبارک جناب معلی القاب نجم الدولہ دبیر الملک

اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب مدظلہ العالی - ناظرین
 والا تمکین اور نیز شاگردان ارادت آئیں حضرت مدوح
 الصدر کو مؤدہ ہو کہ دریلا حضرت مدوح کی تصویریں
 فوتوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کروای ہیں - پس
 جس صاحب کو شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپیہ کے
 تکت بلف عدایت نامہ پید لاء بہاری لال کے نام اکمل المطابع
 دہلی میں بھیج دیں بصفہ پیونگ ان کی خدمت میں مرسل ہو گی -
 ۲۹ جولائی سنہ ۸۹۸ کا اخبار ایک واقعی دلچسپ مضمون پیش
 کرتا ہے - لکھا ہے :-

” غلط فہمی حاکم و محکوم کو عملداری انگریزی کے نامطوبع کرنے
 میں بڑا دخل ہے - حکام اوایل عمر سے عموماً ولایت میں تعلیم
 پاتے ہیں - وہاں کی رسم و راء و قواعد و ضوابط و عادات اور
 طریقوں سے واقف ہوتے ہیں اور انہیں کو اچھا جانتے ہیں -
 ہندوستانیوں کی عادات اور اُن کے عقاید سے اُن کو بخوبی
 علم نہیں ہوتا اُن کی ساری کارروائی انہیں اصول اور خیالات
 پر مبنی ہوتی ہے جو انہوں نے اوایل عمر سے اپنے وطن میں
 کسب کئے ہوتے ہیں ... اور وہ اس امر کے خواہاں ہوتے ہیں
 کہ ہندوستانی بھی انہیں اصول پر چلیں ... “ -

۵ اگست سنہ ۹۸ کے اخبار میں مفتی صدر الدین خاں آزاد کے
 انتقال کے دو قطعہ تاریخ درج ہیں ایک میر مہدی 'مجروح' کا طبعزاد
 اور دوسرا سید امرا مرزا 'انور' کا - مگر وفات کی خبر لوکل کالم میں
 درج نہیں جو اسی ہفتہ میں واقع ہوئی تھی -

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۸ کا اخبار اردو کے مشہور متکسین ماسٹر پیارے لال ہیڈ ماسٹر نارمل سکول دہلی کی لاہور کے سرکاری بک ڈپو میں تبدیلی کی خبر مشتہر کرتا ہے اور صاحب موصوف کے حسن لیاقت کا اعتراف کرتا ہے ۔۔۔

۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع کا اخبار خبر دیتا ہے کہ :-
 ”قبل ازیں جناب وایسرائے گورنر جنرل بہادر کی مہربانی سے جو یہ قرار پایا تھا کہ نو شخص نیٹو یعنی ہندوستانی طالب علم سرکاری خرچ سے تحصیل علم کے لئے ولایت بھیجے جائیں گے بموجب اس قرار داد کے گورنمنٹ بلکالہ کی طرف سے دو شخص کا بھیجا جانا تھا ہے اور اس میں جناب لفتلٹ گورنر بلکالہ نے یہ تہویا ہے ...“

۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۹ کی اشاعت میں ’سرکاری اخبار کے عنوان

کے تحت لکھا ہے :-

”اس اخبار کے اہتمام میں جناب ڈایرکٹر صاحب بہادر پنجاب کی توجہ خاص ہوئی ہے اور صاحب ممدوح نے جناب ماسٹر پیارے لال صاحب اور مولوی معتمد حسین صاحب کے اہتمام سے جاری کیا ہے خاص اسی کام کے واسطے ماسٹر صاحب موصوف کو بترقی مدارج دلی سے لاہور بلایا ہے ماسٹر صاحب کی لیاقت عالمی اظہر من الشمس ہے مولوی صاحب کی بھی شہرت فارسی و اردو میں ابین من الامس ہے ...“

یہ اخبار غالباً ’اتالیق پنجاب‘ ہے - مگر وہ رسالہ تھا —

۱۷ فروری سنہ ۱۸۶۹ کا اکمل الاخبار مرزا غالب کی رحلت کی

خبر شایع کرتا ہے یہ ایک مراسلہ میر مہدی مجروح کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا انتقال " ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع مطابق ۲ ذیقعد سنہ ۱۲۸۵ ھ روز دو شنبہ کو دو پہر ڈھلے " ہوا۔ میر مجروح کے قطعہ تاریخ کے ساتھ یہ ماتم اور رنج و غم کا مقالہ ختم ہوتا ہے۔ کل مرقد استاد پہ افراط الم میں ہاتھ نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غمگین بولا ہے اگر فکر میں تاریخ کی مجروح کھدے نہ یہی گنج معانی ہے تہ خاک اس کے بند مہینوں تک مرزا کے شاگردوں اور مداحوں کے قطععات تاریخ نکلتے رہے جن میں منشی ہوگو پال 'تختہ' مرزا قربان علی بیگ 'سالک' سجاد مرزا سجاد - یوسف علی خان عزیز - ماسٹر وزیر سلگھہ - مولوی شمس الدین شمس - منشی جواہر سلگھہ جوہر - نواب امین الدین احمد - خواجہ حالی منشی بہاری لال مشتاق - نساخ - مولوی اموجان 'ولی' نواب مصطفیٰ خان شینتہ وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ میر مہدی مجروح کا ترکیب بلد مرثیہ غالب بھی اسی سلسلے میں شایع ہوا ہے - اخبار نے نوٹ کیا کہ مادہ تاریخ میں اکثر شاعروں کو 'آہ غالب بہ مرد' میں توارد ہوا -

۲۸ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع کے اخبار میں انکم ٹیکس پر ایک مضمون

ہے - لکھتے ہیں :-

" ۳۱ مئی کے اجلاس میں کلکتہ کی برٹش انڈین اسیوسیشن نے انکم ٹیکس کی نسبت یا اس کے ایکسال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہنے کی نسبت اہل فرنگ کی مانند گرفت کی ہے پس ہم بھی بایں لحاظ انگریزوں کی مثل ہیں کہ جو محصول اپنے ذمہ ہم خود تجویز نہ کریں اس کو ہم اپنے ذمہ

قائم رکھنا پسند نہیں کرتے۔“

۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ ع کے اخبار میں فضیلت ہندوستان کے عنوان سے ایک مضمون میں جو عبارت آرائی کی گئی ہے اس کا نمونہ لطف سے خالی نہیں۔ یہ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :-

”مور خاں صداقت نگار وراویان واقف اسرار نے سلسلہ

مشکین خامہ کو مہدان بیان میں جولاں دیا ہے حال عظمت

ہندوستان جنت نشان کا اس عنوان سے بیان کیا ہے ...“

۱۵ دسمبر سنہ ۹۹ کا اخبار ایست انڈیا ریلوے سے متعلق یہ خبر دیتا ہے کہ اس کمپنی کا ”ایجنسی بورڈ“ اس قسم کی گزیاں بنوا رہا ہے جن میں بیچ میں گلی ہوگی جس کے ایک طرف زنانہ کمرے اور دوسری طرف ان مردوں کے مردانہ کمرے ہوں گے جن کی عورتیں زنانہ کمرے میں ستر کر رہی ہوں۔ اخبار اس نئے انتظام کو نہایت پسند کرتا ہے۔

تبصرہ

عام کھفیت | اس قرن کے اواخر میں سنہ ۵۷-۵۸ کی افراط فری کے باقیات اور ملکی پریس کی پریشانی دور ہونے لگی۔ اور اخبار ملکی معاملوں میں دبی زبان سے رائے زنی کرنے لگے۔ واپس رائے اب امہر کبیر وغیرہ وغیرہ سے صرف جذاب وایسرائے بہادر رہ گئے انگریزوں کے لئے صاحبان عالیشان مقرر ہو گئے۔

انشا اور اسلوب | انشا میں کوئی ترقی نہیں۔ اسلوب وہی فارسی کی بھدی نقل رہا۔ بھوندی قدامت پرستی کی مثالیں بھی کم نہیں۔ قلعہ دہلی کے سراج الاخبار کی طرح جو خوش دامن چھوڑ کر

مادر زوجہ لکھا کرتا تھا کواہ نور نے 'دازہی والہ' کو القط کر کے جو ایک لقب تھا 'ریش دراز' اس کا ترجمہ گھو کر فارسی کی ٹانگ توڑی۔ اعلم کو بھی ان لوگوں نے نہ چھوڑا چنانچہ 'شالامار' کو شعلہ مار بنا دیا۔ اور کھمیل پور کو فارسیت کے بحران میں 'کامل پور' کر دیا۔ ایسی ترکیبیں اکثر آتی ہیں جو مخالفت قہاس لغوی کی بھدی مثالیں ہیں۔ مثلاً :- سیاہی بیچ نکالنے چار ہزار روپیہ کے خزانہ الہ آباد سے گرفتار ہوئے تھے۔ رواج زبان انگریزی کا - (بجائے انگریزی زبان کا رواج) - عرصہ ایک مہینے تک - یہ الفاظ کا مجموعہ مہمل ھ عرصہ یک ماہ تک لکھتے یا ایک مہینے کے عرصے تک تحصیل داراں و سرشتہ داراں کو پیمود ہو گئی۔ دریائے جمنا کے بدلے دریائے جمن لفتلت گورنر سابق - چین و املیت - کمپنی کی جمع 'کمپنیاں گھڑی گئی - فارسیت چھوڑتے تو ایسی بولیاں بولنے لگتے - گورنمنٹ بنگالہ نے یہ تھرایا ہے -

املا نے کچھ بہتر صورت اختیار کی کم سے کم اکمل الاخبار چھوڑے
 املا | قیہ کو وقتہ کی طور پر استعمال کرنے لگا - گازی میں ابز - د کے ساتھ باری باری سے سوار ہونے لگی - 'کو نہیں' کو کوائی نہیں لکھا گیا - ماہ کی ہا ہوز حال کے ساتھ ملا کر لکھتے - پہنچ کو پہونچ لکھتے - ط کے ساتھ ہیں - ب مل کر سب طرح لکھتے - اس ان میں الف کے بعد واؤ آنا ہی تھا - مشیانہ اغلاط مثل سہولیت وغیرہ اور واقعہ بجائے واقع بھی موجود ہے -

سنہ ۱۸۷۰ ع سے سنہ ۱۸۷۹ ع تک

یہ اخبار ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں
 اخبار انجمن پنجاب | ایک عنوان دیتا ہے - یعنی معلومات جدید مقام

تختہ بائی واقع سرحد پنجاب میں۔ اس کے نیچے یہ تحریر ہے —

” ہمیشہ بربل فوارہ میں سخن جاریست

” کہ اوج منصب دنیاے دون نگوںساریست

” سچ ہے کہ زندگی نقش بر آب ہے اور دنیا خواب و خیال

کیا کیا عجائبات پروردگار عالم نے اس صنفِ عالم پر پیدا

کیے ہیں جو اُس کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہیں اور اس خاک

کے پتلے یعنی انسان کو کیسی طاقت بخشی ہے کہ وہ بھی دنیا

میں کیسے کیسے کام کرتا ہے اور کیسی کیسی نشانیاں اور

یادگاریں اپنی عقل و ادراک کی چھوڑ جاتا ہے ... ”

اُن بتوں وغیرہ کی دستی تصویریں بھی دی ہیں جو نہایت عمدہ

اور صاف ہیں۔ اسی اشاعت میں اودہ کے چیف کمشنر کی بیماری کی

خبر ان الفاظ میں لکھی گئی ہے :-

” صاحب پانیپت لکھتے ہیں کہ دشمنان جنرل بہرہ صاحب

بہادر چیف کمشنر اودہ کی طبع مبارک جادۂ اعتدال سے

سخت متصرف ہو گئی ہے ” —

۱۹ جولائی سنہ ۱۸۷۲ کا انجمن پنجاب میں ” گار سن دی ٹاسی

صاحب کی تصویر دے کر لکھا ہے :-

” صاحب موصوف عربی و فارسی و ہندوستانی میں ملکہ

کامل رکھتے ہیں اور پیرس میں پروفیسر زبانہائے مشرقی ہیں۔

انجمن پنجاب کے ممبر اور اُس کے دلی معاون اور مددگار ہیں۔

” نمبر اخبار انجمن پنجاب بابت اپریل سنہ ۱۸۷۷ ع ” میں انجمن

پنجاب کے ایک جلسہ کی روداد درج اس کی قرار داد (۶) دلچسپی

سے خالی نہیں اس وقت تک اہل ہنود میں سنندر کے سفر اور یورپ میں جاکر کچھ مدت رہنے کے متعلق چھوٹ چھات اور پڑھیز و اجتناب کے بہت سے وسوسے تھے۔ وہ تجویز یہ ہے:—

” (۶) صاحب پریسیدنٹ بہادر کی تحریک پر تجویز ہوئی کہ ایک درخواست واسطے امداد چندہ راجگان و مہاراجگان و رؤساء پنجاب کی خدمت میں بھیجی جائے کہ لندن میں ایک انڈین انسٹیٹیوٹ بنایا جاویگا جس میں مذہبی رعایت اہل ہنود کی ہر ایک امر میں رکھی جاویگی اور ایسی تجویزیں کی جاویں گی جن سے مسافت [مطلب سفر سے ہے] جہاز میں بھی سہولت مذہبی اہل ہنود کو حاصل ہو“—

اسی سال میں لاہور کی بادشاہی مسجد کی مرمت کی تجویز ہوئی جو خستہ حالت میں تھی۔ اس کام کے لئے گورنمنٹ نے پانچ ہزار روپیہ اس شرط کے ساتھ مرحمت فرمانا منظور کیا کہ اُس کا دو چلند اس ملک کے لوگوں سے بطریق چندہ جمع کیا جائے۔ چندہ دیئے والوں کی فہرست میں یہ نام بھی درج ہیں راجہ ہربلس سنگھ (ان کے چندے سے بڑھکر کسی شخص واحد کا چندہ اس فہرست میں نہیں)۔ پلڈت موتی لعل۔ پلڈت بدری ناتھ۔ منشی ہر سکھ رائے مالک کوہ نور۔ لالہ نہال چند وغیرہ۔ اس زمانے کے ملی علم برداروں کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔

۱۸ اگست ۱۸۷۱ کا اخبار انجمن پنجاب راوی ہے:—

”ریاست جہند میں ایک انگریز کا قہد ہونا۔ پبلک اوپینین سے خبر ہے کہ مہاراجہ صاحب بہادر جہند نے مستر دیوس نامی

ایک انگریز کو جو 'اون کی ریاست میں باجا سکھا نے پر ملازم تھا معہ اس کی جو رو بچوں کے مقید کر لیا ہے - وجہ مقید کرنے کی یہ بیان کی گئی ہیں کہ ایک پلٹن کے گورہ نے قیوس صاحب کو لکھا تھا کہ میں اپنی جنگی نوکری سے دست بردار ہونا اور ریاست جیلڈ میں ملازمی کرنا چاہتا ہوں آپ مجھے مشورہ دیں کہ کس طرح عمل کروں قیوس صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ انگریزی نوکری چھوڑ کر بڑے پچتائینگے ریاستوں کا کچھ حال نہیں ہے اور نیتو یہ ایمان ہوتے ہیں - یہ چتھی پکڑی گئی۔

کوہ نور | کوہ نور اپنے ضمیمہ مطبوعہ ۱۶ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع میں ایک نہایت اہم اور تاریخی جلسہ کی روداد شایع کرتا ہے - انجمن پنجاب کا یہ جلسہ ۹ اپریل سنہ ۷۴ کو انجمن کے مکان سکشا سبھا واقع لاہور میں ہوا - چیف کورٹ کے چیف جج مسٹر بولنوا (Boulnois) اس کے صدر تھے - مسٹر تھارنگن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ - کرنل مکلاگن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ - مسٹر ینگ کمشنر لاہور - مسٹر ہالرایڈ ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم - مسٹر نسجت قپٹی کمشنر لاہور - نواب عبدالمنجید خاں - راجہ ہربنس سنگھ فقیر سید قمرالدین وغیرہ اور بہت سے علماء فضلا اصحاب شریک جلسہ تھے - اس جلسہ کی فرض تھی اردو نظم کی اصلاح کی تجاویز سوچنا - اس جلسہ میں ذکر کے قابل دو باتیں ہیں ایک مولوی محمد حسین آزاد کی تقریر شاعری کی اصلاح سے متعلق اور دوسری انہیں کی ایک نظم مسمیٰ "بہ شب قدر" - یہ مثنوی اردو شاعری کی سب سے پہلی نظم نئے طرز کی ہے - یہ دونوں چیزیں آزاد مرحوم کے کلمات میں موجود ہیں - اس دن سے دنیا میں اردو کی باضابطہ نئی یا نیچرل شاعری

کی بنیاد پڑی - اسی جلسہ میں یہ بھی قرار پایا کہ ہر مہینے جلسہ ہوا کرے جس میں شاعر مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھا کریں -

ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب بابت جون سنہ ۱۸۷۴ ع کی تاریخی حیثیت ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں نہایت اعلیٰ ہے کیونکہ اس میں ادارۃ انجمن پنجاب کے اس مشاعرہ یا مناظرہ کی مفصل روداد درج ہے جو ۳۰ جون سنہ ۱۸۷۴ ع کو انجمن مذکور کی سرپرستی میں ہوا تھا - مقررہ موضوع ”زمستان“ تھا - شاہ انور حسین ”ہما“ - مرزا اشرف بیگ خاں ”اشرف“ مولوی علامہ الدین ”مصدق“ کاشمیری - مولوی الہی بخش ”رفیق“ - مولوی محمد حسین ”آزاد“ - مولوی محمد مقرب علی ”زایر“ - مولوی اموجان ”ولی“ - مولوی قادر بخش اور مولوی عطاء اللہ نے مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھیں - اس مناظرہ پر میرا ایک مفصل لکچر ہے (جو میرے مجموعہ نثر میں داخل اور زیر طبع ہے) - اس لئے یہاں زیادہ کہنا طول کلام ہے - اگلے مناظرہ کے لئے ”امید“ موضوع مقرر ہوا -

۱۳ اگست سنہ ۷۵ ع کا اخبار شہزادگان جاپان کی نسبت ایک خبر درج کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان اپنی حیثیت انگیز ترقی پر کس طرح فایز ہوا - لکھا ہے :-

”شہزادہ ”خیوا“ کا، عمومی شہنشاہ جاپان اور فٹافٹا کا اچوتنت شہنشاہ موصوف سہاہ پرشہا میں داخل ہوگئے اور انہیں برلن کی رجسٹریٹ پیدل میں لفٹنت کا عہدہ ملا - ”ٹفا“ نے لفٹنتی کا امتحان دیا اور خیوا کا ایک اعلیٰ افسر کے ماتحت کام سیکھ رہا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ

پرشیا کو اسبات کا تعصب نہیں کہ اُنکی سپاہ میں غیر ملک کے لوگ جنگی عہدوں پر ممتاز نہ ہوں۔“

اخبار مذکور اس خبر کی توجیہ یوں کرتا ہے:—

”لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عہدے انہوں نے غیر ملک والوں کو اپنے ہی ملک میں دئے ہیں جہاں غیر ملک والوں کی بغاوت کا اندیشہ نہیں۔ گورنمنٹ انگریزی ملک ہندوستان میں ایسا کرنا نہیں چاہتی کیونکہ یہ غیر ملک ہے اُنکا اپنا ملک نہیں۔“

۱۰ ستمبر سنہ ۷۵ ع کا اخبار پبلک اُپی نیوں سے ایک مضمون اخذ اور ترجمہ

کرتا ہے جس کا عنوان ہے انگریزی راج - اس مضمون کا ذیل کا اقتباس اوس زمانے کے پبلک کے سیاسی خیالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ نکہا ہے:—

”انگریز دیسی لوگوں کو مراتب اعلیٰ شاید اسوجہ سے نہیں دیتے کہ مبادا وہ سرکار سے سرکش ہو جاویں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک حق تلفی رفع ہوتی دھبگی اور انصاف ہوتا رہے گا تب تک ہندوستان میں سرکشی کا ویسا ہی کم خطرہ ہے جیسا کہ سکاٹ لینڈ میں - ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اندیشہ بغاوت اس بات سے کم ہو جاویگا اگر باشندگان کے اسلحہ اوتار لئے جاویں گے اور انکے ساتھ سلوک بد کیا جاویگا؟... اگر یہی صورت دہی تو ہندوستان کے لئے ایک زمانہ وہ ہوگا کہ اوس کی جنگی حرارت بالکل سرد ہو جاویگی اور یہاں کے لوگ اپنے ملک کے بچاؤ کے لئے اپنا کلی حصر دوسرے ملک والوں پر رکھیں گے۔ کیا یہ بات حکمرانوں کے فائدے کی

ہے کہ محکوم اس طرح ضعیف کر دئے جائیں؟ ... یہ بزدلی کی مصلحت ہندوستانیوں کو جنگی علاقوں سے محروم کرنے کی اور ان کی ساری خوشی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔۔۔“ —

۱۷ ستمبر سنہ ۷۵ کے اخبار میں مضامین علمی کی سرخی کے نیچے ایک لمبا مضمون ہے جس کا عنوان ہے ”مجموعہ ہولے - قانون کشش و حرکت کا بیان“ —

۱۵ اکتوبر سنہ ۷۵ کا اخبار منکیر ہے کہ :-

”سرچرچہ تپیل صاحب بہادر لفتنٹ گورنر بلکال نے ایک تجویز اسباب میں پیش کی تھی کہ دیسی معزز لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے کے لئے ایک صیغہ گورنمنٹ کی جانب قایم کیا جاوے۔“ —

۸ اکتوبر سنہ ۷۵ کا اخبار ’منقولات کی مد میں ایک مضمون دیتا ہے جس کا عنوان ہے ’اردوے معلہ —

۱۰ دسمبر سنہ ۷۵ کے پرچے میں مضمون ”در بیان فواید صبر مولفہ امہر الامرا نواب محمد اسماعیل خاں صاحب بہادر فیروز جنگ والے ریاست جاوڑہ“ درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ اس وقت اردو پریس کی کھاد قدر و منزلت تھی —

۱۲ جنوری سنہ ۱۸۷۷ ع کے اخبار میں ”دربار قیصری میں انجمن پنجاب اور یونیورسٹی کی قدر افزائی“ کے عنوان سے افتتاحیہ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں دربار قیصری کے موقع پر انجمن پنجاب کے ایک معزز ڈپٹی مہیشن نے وائسرائے لارڈ لٹن کی خدمت میں ایک ایڈرس پیش کیا۔ اس کے جواب میں بقول اخبار انجمن پنجاب ”حضور معزی

الیہ نے یہ بشارت جاننزا اہالیانِ قہر پوٹھشن کو دی کہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو منصب کامل یونیورسٹی کا عطا کیا جاوے گا۔ ”مطلب یہ کہ یہ منصب اس موقع پر عطا ہو گیا۔ اسی اشاعت میں قیصری دربار دہلی کی بڑی تقریبوں اور عطاءے خطابات وغیرہ کا ذکر ہے۔

اسی پرچے سے یہ خبر آج کل کے تعلیمی اداروں کے لئے دلچسپ ثابت ہوگی۔ لکھا ہے :-

”امتحان فرست آرٹس میں کالجہائے پنجاب نے نمایاں

کامیابی اختیار کی“ —

آپ یہ معلوم کرنے کو بیتاب ہوں گے کہ یہ ”نمایاں کامیابی“ کیا تھی سنئے صوبہ پنجاب میں اس وقت دو کالج تھے ایک لاہور کا گورنمنٹ کالج جہاں سے آٹھ طلبا اس امتحان میں پاس ہوئے۔ دوسرا دہلی کالج جہاں سے چار پاس ہوئے۔ یہ بارہ کی میزان کل اس وقت نمایاں کامیابی سمجھی جاتی تھی —

یہی پرچہ ایک خبر ”نظام دکن کی فحاشی“ کی سناتا ہے کہ :- ”نظام دکن نے جاتے وقت یونا میں قیام کیا تھا [دہلی جاتے وقت] ایک مبلغ کی تعمیر کے واسطے دیوڑھار روپیہ مرحمت فرمایا یہ امر بے تعصبی پر دال ہے۔“ لاہور کی شاہی مسجد کی مرمت سے متعلق چلدے کی فہرست آپ دیکھ چکے ہیں یہ خبر اس کا کتنا موزوں مقابل ہے۔

ہندوستانیوں کا ’جوتا‘ بھی معلوم ہوتا ہے گزشتہ زمانہ میں ایک وقیع اور اہم سیاسی اور قومی مسئلہ تھا۔ اس سے پہلے دور میں اس کا ذکر آیا ہے اب نو فروری سنہ ۷۷ کے پرچے میں اخبار انجمن پنجاب ”پھر وہی جوتا“ کے عنوان کے نیچے ایک واقعہ کا ذکر کر کے ایک لمبا

اور کرارا مضمون پیش کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یکم جنوری سنہ ۷۷ کو دہلی میں وائسرائے نے دربار قہصری کیا تھا نا۔ اسی سلسلے میں جگہ جگہ لوکل افسروں نے دربار یا جلسے کئے۔ چنانچہ مراد آباد میں بھی ایسا ہوا جب میئر ظہور حسین وکیل ہائی کورٹ دربار میں جانے لگے تو اُن سے کہا گیا کہ جوتا اُتار کر جائیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کس کا حکم ہے۔ کئی مرحلے طے کرنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ یہ حکم ”صاحب اسسٹنٹ کلکٹر بہادر“ کا ہے۔ چنانچہ میئر صاحب نے ان سے دو بدو ہو کر کہا کہ ”اگر ایسا حکم ہے تو ہم دربار میں شریک نہ ہوں گے۔ صاحب نے کہا کہ اچھا ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں پس میئر صاحب جوتا پہن کر دربار میں شریک ہوئے۔“

اس پر اخبار کا نوٹ ہے کہ :- ”اس موقع پر اگر میئر صاحب کو یہ خیال ہوتا کہ کون حجت کرے کہیں ہم کو دربار میں شریک ہونے سے ممانعت نہ ہو جائے تو ہرگز اس وقت یہ مرحلہ طے نہ ہوتا اور ذلت کے ساتھ میئر صاحب کو جوتا اُتارنا پڑتا۔ حال کے ایک واقعہ سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو ہندوستان کا جوتا ابھی تک نوک پان سے درست ہے یا یہ کہ تاریخ اپنے نئیں دھراتی ہے۔ کیونکہ ابھی ۱۹ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ ع کا تار جو ’ملماد‘ سے آیا خبر دیتا ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ کو جب کرپان کی علت میں عدالت میں پیش کیا گیا تو پولس نے زبر دستی ان کے جوتے اُتار ڈالے۔ (تربییوں ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴)

۲۳ فروری سنہ ۷۷ کا اخبار انگلشمن کے حوالے سے آریہ سماج کے

قائم ہونے کی خبر دیتا ہے۔ لکھتا ہے :-

”کل صاحبان ہنود کے لئے آریہ سماج کے قائم ہونے کی خبر نہایت

فرحت انگیز ہوگی۔ اس کی اصلی فرض یہ ہے کہ علم شریف بید کو اس کی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرے۔ اور اس مطلب کے حصول کے لئے مراتب مندرجہ ذیل عمل میں لائے اور ایک سہاچ ہر ایک احاطہ میں قائم ہوگی اور اس کے ماتحت بڑے بڑے شہروں میں کمیٹیاں قائم ہوں گی۔ دوم مدارس اس غرض سے کھولے جائیں گے کہ مردوں اور عورتوں کو بید کی تعلیم دی جاوے۔ سوم کتابیں چھاپی جاویں گی چہارم رسالجات اس غرض سے۔ پنجم فاضل پندت ملک کے مختلف مقامات میں اس غرض سے بھیجے جاویں گے کہ لوگوں میں شاستر کا اچھی طرح سے وعظ کریں۔“

اس پر اخبار انجمن پنجاب کا ہمدردانہ اور معرفانہ نوٹ ہے — یہی اشاعت قدیم دہلی کالج کے ٹوٹنے کی خبر اس طرح دیتی ہے : — ”دہلی کالج کی موقوفی آخر گورنمنٹ نے منظور کر لی اور سرکاری کارروائی اس باب میں پنجاب گورنمنٹ کوٹ میں چھاپی گئی۔“

۶ اپریل سنہ ۷۷ کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رسالہ ’ہندو باندھو‘ تین سال سے پندت شونرائین اگنی ہوتری ترائنگ ماسٹر لاہور گورنمنٹ سکول نے اہل ہندو کے لیے جاری کیا تھا۔ اخبار اس کی افادت کے اعلان کے ساتھ اس کی اعانت کے لیے اپیل کرتا ہے —

۱۳ اپریل سنہ ۷۷ کا اخبار ”اندین انسٹیٹیوٹ بغرض تعلیم و سازان گان ہندوستان در یونیورسٹی ہائے انگلینڈ و تعلیم دیگر علوم مفیدہ یعنی تعلیم سول سروس و انجینیری و زاعت و غیرہ وغیرہ“ کی خبر دیتا

ہے۔ تعلیم سروس منہدہ تو تھی اور اب بھی ہے لیکن اسے علوم میں شامل کرنا لکھنے والے کی ایجاد بندہ ہے۔ یہ تحریک ڈاکٹر لائٹز کی تھی جو چلی ہی نہیں۔

۱۱ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار ”پنجاب یونیورسٹی“ کا عنوان دے کر ”ریپورٹ بابتہ از سر نو مرتب ہونے علم مشرقی کالج اور سکول کے“ درج کرتا ہے۔ عربی کے استادوں کی ذیل میں پہلا نام مولوی فیض الحسن کا ہے اور اخیر نام مولوی محمد حسین کا ہے۔ ان کے نام کے آگے ”مولوی شیعہ“ لکھا ہوا ہے۔ اس اعتقادی اعلان کی نہ معلوم کیا ضرورت لاحق ہوئی۔ ۱۸ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار۔ اب دوس اور دوم کی خونریز جنگ چھڑ گئی۔ یہ اخبار ’مدراس میل کے حوالے مخالفین کی باقاعدہ فوج اور متعلقین کی یہ تعداد لکھتا ہے :- روسی فوج علاوہ سپاہ واقع پولہندہ و بالتک و گارڈز ایک لاکھ اور ترکی کی فوج چار لاکھ تیس ہزار شمار کرتا ہے۔ یہ اشاعت قریباً سب کی سب اس جنگ کے مضامین کی نذر ہے۔ سول ملہتری گزٹ کے ایک مضمون یا نوٹ کا ترجمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

”بھالیہک روسی ترکی واقع ایشیا کو اپنے ملک میں شامل کرنا چاہتے ہیں لندن کے وزرائے کنسرویٹو کی یہ رائے ہے کہ مغایرت اختیار کی جاوے۔ اس صورت سے ہم نہیں سمجھہ سکتے کہ انگریزی حقوق کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں کیا جماعت وزرائے انگلہندہ میں نہ کوئی سپاہی رہ گیا ہے نہ کوئی مدبر کہ بتاوے دوس جو اس ملک کو فتح کرنا چاہتا ہے تو اس کی نہت انگلہندہ کی نسبت کیا ہے“۔

۴ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار لاہور میں سوامی دیانند سرستی کے درود کی

خبر ان الفاظ میں مشہور کرتا ہے : —

”لاہور میں ویدوں کے ایک مشہور عالم و فاضل سوامی دیانند سرستی صاحب تشریف لائے ہیں اور ویدوں پر لکچر دیتے ہیں ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات کا یہ حال ہے کہ ایک دریا ہے کہ امدا چلا آتا ہے پلذت صاحب باغ دیوان رتن چند مرحوم میں مقیم تھے۔ اب خان بہادر ڈاکٹر رحیم خان صاحب نے کہ بڑے علم دوست ہیں اپنی کوتاہی اون کو فروکش ہونے کے لیے دی ہے —

جنگ دوم و روس کے معاملہ میں ایشیا تک ترکی اور سب سے بڑے کو افغانستان نہایت مشکل قضیہ تھا معلوم ہوتا ہے قسطنطنیہ کے اخبار دار الخلافہ استنبول اور کراچی کے مفرح القلوب نے اس قضیہ کو اور پیچیدہ کر دیا۔ یہ دونوں اخبار فارسی زبان کے تھے جس کا ذکر آگے آچکا ہے۔ اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۸ جون سنہ ۷۷ کا افتتاحیہ ”امہر کابل - گورنمنٹ انگلشیہ اور روس“ کے عنوان سے اس قضیہ پر طویل اور مفصل بحث کرتا ہے —

اسی تاریخ یعنی ۸ جون سنہ ۷۷ کا لوکل تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لکھا ہے کہ ”یکشنبہ گزشتہ کو ہال انجمن پنجاب میں بابو سریندر ناتھ صاحب بڑی سابق متعلق سول سروس ہندو ممبر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے ایک نہایت پر تائید و فصیح لکچر زبان انگریزی میں قومی اتفاق پر دیا۔ اس لکچر کے سننے کے لیے ایک گروہ کثیر تعلیم یافتہ نوجوانان پنجاب و دیگر معززین شہر کا جمع تھا۔ لکچر در حقیقت نہایت

زور و شور کی تھی —

اس کے اگلے دن یعنی ۴ جون سنہ ۷۷ ع کو مقام سکشا سیبا میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کو اہل پنجاب کا پہلا سیاسی مجمع کہنا چاہئے - رائے بہادر مول سنگھ صاحب وٹھس و آنریری میجسٹریٹ لاہور اس جلسہ کے صدر تھے - محب وطن سردار دیال سنگھ، مجیٹھیہ نے اول تجویز یہ پیش کی :—

”برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے سول سروس کے معاملہ میں جو کارروائی کی ہے اوس کو اس جلسہ کے ممبر بے کم و کاست منظور کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ انڈین سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے جو قواعد امیدواروں کی عمر سے متعلق تھے حال میں اون میں تغیر و تبدل کیا گیا - اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ جو اشخاص سول سروس کے امتحان میں شریک ہوں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس سال کی قرار پائے اور انہیں سال کی حد جو اب مقرر کی گئی ہے وہ منسوخ ہو جائے“ —

خان بہادر محمد برکت علی خاں اور خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں نے اس تجویز کی تائید کی دوسری تجویز اس جلسے نے یہ منظور کی :—

”اس غرض سے کہ ہندوستانی امیدواروں کا سول سروس میں داخل ہونا آسان ہو جائے اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ کل عہدوں میں سے کسی قدر عہدوں کے لئے جگہیں تعداد میں ہو جائے امیدواروں کا امتحان ہر سال ہندوستان کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ وسطی مقاموں میں ہوا کرے“ —

اس تجویز کے متحرک ڈاکٹر سورج مل اور تائید کرنے والے ماسٹر پیارے لال اور سید نادر علی شاہ سیفی تھے - اسی جلسے میں ایک مہموریل بھی منظور اور اختہار کیا گیا جو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے تھا - اس مہموریل پر پبلک کے دستخط کرانے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ اور منشی ہرسکھ رائے کے علاوہ سرکاری عہدے دار بھی شامل تھے -

۲۴ اگست سنہ ۷۷ ع کے اخبار میں ایک صاحب جہلم سے علی گڑھ کے مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-
 ”جس قدر دل سوزیاں عرق ریزیاں اسکے راقموں سے اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ظہور میں آئیں وہ سارا جہاں جانتا ہے - سید احمد خاں صاحب نجم الہند کو جنہوں نے اپنی جان مال عمر اسی قومی بھلائی اور اسلام کی سچی خیر خواہی میں صرف کی ہے اگر حجت اسلام کہا جاوے تو بجا ہے“ -

۱۲ اکتوبر سنہ ۷۷ ع کا لوکل ان اشعار سے شروع ہوتا ہے :-

شکر ہے لاہور میں بھی ابر باراں ہو گیا
 آجکل پنجاب بارش سے گلستاں ہو گیا
 بلبلیں فرحت سے گاتی ہیں یہ مصرع بے بدل
 فلجہ پڑ مردہ تھا اے لو آج خنداں ہو گیا
 ایسی بارش ہو گئی جو کھیتوں کو ہے مفید
 زندگی کا اے غریبو اب تو ساماں ہو گیا

۲ نومبر سنہ ۷۷ ع کے اخبار میں ایک لمبی مراسلت درج ہے جس کا عنوان ہے ”فاحشہ عورتوں کے متفرق جگہ شہر میں دھلے سے بہت

بڑے نقصان ہیں۔“ - پایا جاتا ہے کہ یہ تحریک زمانہ حال کی،
نہیں بلکہ پرانی ہے۔

۲۴ نومبر سنہ ۷۱ ع کا اخبار ہند کے مطالبات پر ایک اہم مضمون پیش کرتا
ہے جو نظام الدولہ نواب حاجی محمد مردان علی خاں بہادر
کا لکھا ہوا اور دربار دہلی کی نسبت تھا۔ اخبار کا ادیتران
مراعات و مطالبات کو بہ حیثیت مجموعی پسند کرتا ہے۔ مضمون
طویل ہے صرف مطالبات ملاحظہ ہوں :-

”سرکار کھنٹی تاجر تھی مگر اب دور شاہنشاہی ہے اس لئے برتاؤ
بھی شہنشاہی چاہئے۔ یہ دربار کھیل تماشے کے واسطے نہیں ہے۔ دوسرا
کی رضا ممدی پر نصف ہند بلکہ کل ہند کی رضا ممدی منحصر ہے“
ان الفاظ کے ساتھ نواب صاحب مطالبات کی یہ فہرست پیش کرتے ہیں :-

(۱) جھپور کو نصف سانپہر - واپس ملے۔

(۲) مارواڑ کو نصف سانپہر - علاقہ تالاب عمر کوت مکھرامبر
واریہ واپس ملے۔

(۳) گوالیار کو قلعہ گوالیار۔

(۴) اوڑیسہ پر کو علاقہ گنگا پور وغیرہ سوائے نیچے کے۔

(۵) نظام دکن کو برار واپس ملنا چاہئے۔

اس مضمون کے یہ الفاظ بھی قابل غور ہیں :-

”بمعد سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا

کہ سرحدیں مستحکم تھیں رعایا خوش حال تھی اور صرف تیس

کروڑ آمدنی ملک میں تھی۔ دس لاکھ فوج تھی اور اس پر

شاہی خزانہ اور کارخانہ معمور رہتے تھے۔ عجب ہے کہ اب

تربیں کروڑ [آمدنی میں] صرف دو لاکھ ساٹھ ہزار فوج اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے از حد قرض - ع - بھیں تفاوت رہ از گنجاست تابہ گنجا - سالانہ بجٹ خوب بلتا ہے مگر جب بجٹ نہیں تو محض لفافہ ہے - بارگ ماستری اور کمسریٹ اور مہم وغیرہ میں کروڑوں پر پانی پھر جاتا ہے جس کا حال سنگر حیرت ہوتی ہے - سرکار ایسی لکھ لٹ ہے کہ پلندارہ کی لوت بھی اس صیغہ نے مات کردی —

۱۳ جون سنہ ۱۸۷۹ ع کی اشاعت میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ مضمون ہے جس کا عنوان ہے ”ہند میں سب کچھ ہے لیکن صنعت و حرفت نہیں“ - ابتدا میں یہ شعر درج ہیں اور آگے چلکر موقع بہ موقع اسی زمیں کے اشعار نثر میں ملے ہوئے ہیں - ان اشعار کی ایک خاصی نظم بن جاتی ہے ملاحظہ ہو -

دل ساکڑان ہند سے کیونکر خفا نہ ہو
افسوس یاں تو صنعت و حرفت ذرا نہ ہو
ہر شخص کو وہاں کے یہی دھن ہے رات دن
ممکن ہے کوئی بات نئی ڈھونڈتا نہ ہو
طاقت ہے یورپیوں کی شے ہو نہیں لطیف
ممکن ہے ہند کی کوئی شے بدنما نہ ہو
تشبیہ ان کی دیتا ہوں اس جانور سے میں
آنکھیں تو کھل رہی ہوں ولے دیکھتا نہ ہو
اعضا ترے درست ہوں پھر لومڑی بلے
اے بے حجاب تجھے کو ذرا بھی حیا نہ ہو

گر یہ ہی حالتیں دل وحشی تری رہیں
 کہا جانے کہا ہو دیکھیئے کیا جانے کیا نہ ہو
 مشکل وہ کونسی ہے جو آساں نہ ہو کبھی
 افسوس دل سے چاہو اگر تم تو کیا نہ ہو
 بلبل بھی نالہ سنتے ہی بیدار ہو گئی
 اے بے خبر خبر تجھے مطلق ذرا نہ ہو

تجدید شاعری کا یہ دل کش ثمر آپ نے ملاحظہ کیا۔ اسی کے لئے

آزاد مرحوم برسوں سے تردد کر رہے تھے۔

۲۰ جون سنہ ۷۹ کا پرچہ ”انڈین ٹریبیون“ سے ماخوذ ایک خبر

درج کرتا ہے جس میں ایک اہل فرنگ کے ہاتھ سے ایک ہندوستانی
 مارا گیا تھا اور چیف کورٹ سے ملزم بری ہو گیا۔ یہ خبر اس عنوان کے
 تحت درج کی گئی ہے :-

”ہماری جان گئی آپ کی ادا تھری“

سرشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر کرنل ہالزائیڈ اور پنجاب یونیورسٹی
 کے رجسٹرار ڈاکٹر لائیٹز کی کبھی نہ بلی۔ اور دو مضبوط پارتھان
 قائم ہو گئیں ایک سرشتہ تعلیم اور بک ڈپو کی اور دوسری پنجاب
 یونیورسٹی کی۔ جب آزاد نے جو سرشتہ تعلیم سے متعلق تھے نئی شاعری
 کی بنیاد ڈالی اور مقدورہ موضوع کے ساتھ مناظرہ کا ڈھنگ نکالا تو یونیورسٹی
 کی پارتی نے پرانی چال کا طرحی مشاعرہ شروع کر دیا۔ مگر اس سے مناظرہ
 کو کوئی نقصان نہ پہنچا ۲۰ جون سنہ ۷۹ کا اخبار انجمن پنجاب ایک
 ”اشتہار انجمن مشاعرہ بیت العلوم پنجاب لاہور“ شائع کرتا ہے۔ اس
 کے مشاعرے رسالہ کی شکل میں چھپا بھی کرتے تھے اور لوگوں کی غزلوں

اردو فارسی - عربی - سنسکرت - ہندی - پنجابی اور پشتو میں ہوا کرتی تھیں یعنی جن جن زبانوں کے امتحان یونیورسٹی کی اور پینٹل فیکلٹی کے تحت ہوا کرتے تھے —

۲۷ جون سنہ ۷۹ کے اخبار میں صنعت و حرفت کا پھر تذکرہ آتا ہے جس میں بہت سے ہمعصروں کو خطاب کر کے اس بارے میں اتحاد عمل کی دعوت دی گئی ہے —

۱۱ جولائی سنہ ۷۹ کا اخبار پیسے کے پوست کارڈ کا خبر مقدم اس قطعہ کے ساتھ کرتا ہے —

۱ ہے لٹافہ بھی اور زر محصول^۲ اور فضولی کو تہام دیتا ہے
۳ خط بھی ہے اور نامہ پر بھی ہے یہ تکت پانچ کام دیتا ہے

۱۳ اپریل سنہ ۷۰ کا اکمل الاخبار یہ خبر دیتا ہے
اکمل الاخبار دہلی ”گورنمنٹ انڈیا کا مجوزہ بل متعلق یو - سی - ایس

دوس اف کا ملز میں دوسری دفعہ سماعت ہوا - اس کے پاس ہونے پر
لائیق اشخاص بغیر امتحان کے سول سروس میں لیے جائیں گے —

۲۰ اپریل سنہ ۷۰ کا اخبار ”سالانہ حساب سلطنت ہند“ پر بحث

کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”بے شک جو لوگ گورنمنٹ کے خیر خواہ اور رعایا کے

طالب فلاح ہیں وہ ہرگز اس بحث کو پسند نہیں کریں گے

کیونکہ ایسا نظام کس کام کا کہ بے جنگ وجدال کے سال میں

بھی خزانہ شاہی پر اختلال اور بے در پے انکم ٹکسی دیتے

دیتے رعایاء شکستہ مال کا برا حال ہے - جب سال گزشتہ کا

بحث نکلا تھا اس وقت تمام لوگ اس سبب سے ناخوش ہوئے

تھے کہ باوجود یکہ سرکار دولت مدار کی طرف سے ولسن صاحب نے بڑے شد و مد کے ساتھ اقرار کیا تھا کہ پانچ برس کے بعد یہ انکم ٹکس نہیں لیا جائے گا یہہ سررجرتہ تمپل صاحب نے ایک روپیہہ انکم ٹکس مقرر کیا اوس کے بعد اوسے سال کے اندر اس کو دونا کیا گیا لیکن اس کے ساتھ بھی لوگوں نے طوعاً و کرہاً اس کو مان لیا اور دو پیمت کر چہہ مہملے ایک روپیہہ کے حساب سے جملہ قیوۃ روپیہہ کے ادا کیا اور یہ سمجھا کہ اب کوئی لڑائی بہڑائی جدال قتال نہیں ہ سو آئندہ سال جیسا کہ جناب گورنر جنرل وایسرائے بہادر نے وعدہ فرمایا ہے اور انکم ٹکس دینا نہیں پڑے گا۔ سو جذاب سررجرتہ تمپل صاحب بہادر مشیر مال کے حسن تدبیر کے سبب یہ ہوا کہ ایک روپیہہ کے بدلے تین روپیہہ دو آنہ سیکڑہ دینا پڑا۔ سررجرتہ تمپل صاحب بہادر نے اپنے حساب کتاب اور منصوبے کو ایسا چھپا رکھا کہ گویا اس کے فاش ہونے میں بالکل نظام بگڑ جاوے گا حالانکہ اگر اس قدر نہ چھپاتے اور خرچ کی تفصیل شرح و بسط کے ساتھ لوگوں کو سنا دیتے تو غالب تھا کہ لوگ اتنے برہم نہ ہوتے اور اس ٹکس کے ادا کرنے کو اتنا ناگوار نہ سمجھتے ... —

اکلی اشاعت یعنی ۲۰ اپریل کے اخبار میں ایک بڑے مزے کا واقعہ

درج ہے جسے لطیفہ کہا گیا ہے - سنئے :-

کلکتہ کے ایک اخبار میں لکھا ہے کہ کل کے دن ایک عجیب اور دلچسپ ماجرا یہاں کونسل میں واقع ہوا - تفصیل اس

اجمال کی یہ ہے کہ جس وقت لیجس لیٹف کونسل کے ممبر انکم ٹکس اور معاملات کی بابت باہم مباحثہ کر رہے تھے ڈاکخانہ کے ایک چھوڑی نے ایک پارسل جناب سرورچرہ تمپل صاحب بہادر کے حوالہ کیا اس وقت صاحب مددوح نے جانا کہ اس میں نقشے اور حکم نامہ واپسی ہوئے مگر جب کھول کر دیکھا تو اس میں ایک خالی ڈبہ دیا سلائی کی نکلی - اس وقت صاحب موصوف بہت متعجب ہوئے اور چونکہ اس وقت کوئی موقع اس کے چھپانے کا نہ تھا لہذا صاحب مددوح نے اس کو اور ممبران کو دکھا دیا اور یہ لطیفہ نسبت اور ممبروں کے جناب مستطاب محلے القاب لارڈ میو صاحب بہادر کو از حد پسند آیا -

اس واقعہ پر اکمل الاخبار کا حاشیہ ملاحظہ ہو :-

” اکمل الاخبار - کسی ظریف نے عین موقع پر دیا سلائی کی ڈبہ یا تو بایں مراد بھیجی ہوگی کہ صاحب آپ کے محکمہ میں اندھیرا ہے روشنی کیجئے یا کسی جلے بھلے نے انکم ٹکس سے چلکر یہ ایما کیا ہوگا کہ بھت کے کاغذات کو جو ہر سال قربا کے گلے پر چھری پھیرتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ تسہ لکا نہ رکھیں آگ لگائیے - مگر افسوس ہے کہ وہاں وہی ظلمت رہی اور سرورچرہ تمپل صاحب بہادر کے عرق خجالت سے دیاسلائی سہل گئیں۔“

۲۵ مئی سنہ ۷۰ کے اخبار میں سید جمشید علی مہتمم مطبع آفتاب ہذا مراد آباد اپنے نکلتے والے اخبار جام جمشید کا اشتہار ساقی نامہ سے شروع کرتے ہیں - فرماتے ہیں :-

” پلا ساقیا سافر جم مجھے کہ علم و ہنر کا ہے ماتم مجھے “

یہی اشاعت لندن کے ہیلوور سکوائر کے ایک جلسہ کا ذکر کرتی ہے جو عورتوں نے اپنے حقوق اور مطالبات پر زور دینے کی غرض سے کیا تھا بقول اکمل الاخبار بی بی - پی - آئی تیلر صاحبہ اس جلسے کی صدر نشیں تھیں ” تقریر بی بی صاحبہ “ یعنی صدر جلسہ اس جلسہ سے شروع ہوئی :-

” اے حاضرین جلسہ یہ بڑے اندھیر کی بات ہے کہ مرد

عورتوں کے دشمن ان کی نسبت یہ الزام لگاتے ہیں کہ مظلوم

مستورات اوس حق آزادی کے قابل نہیں جو مردوں کو حاصل ہے - “

اس جلسہ میں اکثر فاضل اور معزز مرد بھی موجود تھے - بعض

مردوں نے بھی تقریریں کیں - بعض نے جواب دئے - جان ستوارت مل بھی

اس جلسے میں تھے انہوں نے کہا یہ قول اخبار ” بی بی زیب انجمن صاحبہ

کی اس تقریر کو سن کر مردوں کی جانب سے جواب دیا “ :-

” اے مہم صاحبہ - عورتوں کی نسبت بعض فاضلوں کی یہ

راے ہے کہ عورتیں سلطنت کے کاروبار میں اگر داخل پا جائیں

گی تو حکومت میں مذہبی تعصب کو فروغ ہو جائیگا اس لئے

کہ عورتوں کے دلوں پر مردوں کی نسبت پادری صاحبوں کی

نصیحت اور مذہبی ہدایت کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور پادری

صاحب بڑی مصلحت اور کوشش سے زیادہ تر عورتوں کے دلوں

پر ایذا تصرف کرتے ہیں جس سے ممکن ہے کہ عورتیں دوسرے

مذہب والوں کو یہی تعصب کی نظر سے دیکھ سکیں اور نتیجہ

اس کا یہ نکلے کہ انجام کار سلطنت میں خلل واقع ہو “ -

جان مل نے یہی بات اپنی کتاب سہجکشن اف و من میں بھی لکھی ہے -

یا سٹریجٹ تحریک بیسویں صدی کے دوسرے قرن کے اوایل میں شروع ہوئی تھی وہ زور دل پر تھی کہ جنگ عظیم کے بادلوں نے دنیا کی فضا کو گھیر لیا۔ جنگ کے بعد آپ نے دیکھا کہ اس قسم کی کسی تحریک کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ غرض کہ حال کی تاریخ میں عورتوں کے سیاسی حقوق کے مطالبہ سے متعلق یہ پہلی باضابطہ کوشش تھی۔ ”بی بی صاحبہ“ وغیرہ الفاظ جو اکمل الاخبار کے ایڈیٹر نے استعمال کئے ان سے پایا جاتا ہے کہ اسے عورتوں کے معاملہ میں بہت ہی جھجک اور شرم عارض حال تھی۔ ۲۲ جون سنہ ۷۰ کا اخبار آگرہ کی خبر لکھتا ہے کہ ۱۴ جون کو ”کھنران آراستگی شہر (اس سے مطلب ہے میونسپل کمشنر) غیر ملازم صاحبان انگریز اور ایک انبوه رئیسان و ساکدان ہندوستانی کا انکم ٹکس کی بابت دلائل پیش کرنے کے لئے مجتمع ہوا“ —

ریل اور گھوڑے کا مقابلہ

اب سے چونتیس برس پہلے آپ کی ریلوں کی رفتار کیا تھی اور یہ کہ سادات بارہ جو شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد برسوں بادشاہ گر رہے انگریزی عہد میں بادشاہ گری تو نہ کر سکے لیکن ان کے راج کے بڑے معجزے یعنی ریلوے انجن کو شکست دئے بغیر نہ رہے۔ اس کی کیفیت ۲۰ جولائی کے اخبار میں اس طرح درج ہے :-

”سادات بارہ میں سے ایک صاحب کے پاس عجیب گھوڑا حر حر تگ ہے چنانچہ ایک صاحب جلیل القدر ملازم ریل سے یہ شرط تھری کہ اسٹیشن کھتولی سے اسٹیشن مظفر نگر تک جو چودہ میل کا فاصلہ ہے گھوڑا ہمراہ ریل دوڑا یا جاوے اور گھوڑا پیچھے رہا تو مالک اسے ہزار روپیہ دیوے۔ اگر گھوڑا

ہو گیا تو ہزار روپیہ صاحب ملازم ریل سے لیا جاوے اس
 شنبہ کو گھوڑا ہمارا ریل کے دروازے پر لے گیا۔ ریل سے گھوڑا $\frac{1}{3}$ میل آگے گیا۔
 صاحب ملازم ریل نے شرط ہار کر ہزار روپیہ میر صاحب کی نذر کر کے
 میر صاحب نے از روے دریا دلی وہ روپیہ صاحب کو پھیر دیا۔ —
 ۲۷ جولائی سنہ ۷۰ کا اخبار فرانس اور پریشیا کی جنگ کے باعث
 کے متعلق بحث کرتا ہے۔ لکھا ہے :-

”شاہ فرانس نے شاہ پروشیا سے یہ درخواست کی تھی کہ
 پروشیا کے شاہزادہ ہونز زولرن کو تخت سلطنت ہسپانیہ پر
 بٹھانے سے باز رکھا جاوے ورنہ تمام ملکی معاملات باہمی ہمارے
 تمہارے قطع ہو جائیں گے۔ اب بذریعہ تاریخی معلوم ہوا کہ پروشیا
 والوں نے درخواست مذکور شاہ فرانس کی قبول کر لی مگر شاہ
 فرانس کے جوابدہوں نے زور کیا یہ جی میں سمجھتا ہوں کہ اب پروشیا
 والوں سے یہ درخواست کیجئے کہ شاہ پروشیا یہ ضمانت دے کہ آئندہ
 کبھی ہسپانیہ میں شاہزادہ پروشیا کے بادشاہ ہونے کی درخواست
 نہ کی جاوے گی۔ واضح ہو کہ یہ اخیر درخواست شاہ فرانس
 کی طرف سے ایسی ہوئی کہ طبقہ یورپ کی چھوٹی چھوٹی
 قوم کو بھی غضبناک کر دے۔ جب یہ پیغام شاہ فرانس کا قاصد
 لے کر پروشیا میں گیا شاہ پروشیا اس وقت ایک ایڈ جنرل
 تھیلٹ (انسرفوج) کے ہمراہ باغ میں سیر کر رہا تھا قاصد پیغام
 سنا کر جواب کا ملتجی ہوا بادشاہ پروشیا نے پیغام پھیر کر
 جواب دیا کہ اس کا کچھ جواب نہیں۔ جب قاصد بصد ہوا
 ایڈ جنرل تھیلٹ نے اس کو چھوڑ کر نکال باہر کیا۔ اتنی بات

کے ہوتے ہی شاہ فرانس کا مدعا حاصل ہوا۔ مدتوں کا رخنہ جو شاہ پروشیا کی طرف سے اوس کے دل میں تھا اب نکل آیا یعنی اس وقت پیرس دارالسلطنت فرانس کو بذریعہ تار برقی خبر گئی وہاں اس خبر کے پہنچتے ہی لڑائی کی تہادیاں شروع ہو گئیں۔ اودھر شاہ پروشیا بھی غافل نہیں تھا۔۔۔“

اس لمبی عبارت کے نقل کرنے سے میرا یہ منشا ہے کہ چونکہ اس میں وہ واقعات تفصیل کے ساتھ معاصرانہ حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں جو فرانس اور پروشیا کی جنگ سے عین ماقبل پیش آئے اور تاریخی طریق پر ایک بڑی لڑائی کا فوری سبب قرار دیے جاسکتے ہیں حالانکہ قریب کے زمانے کے مورخ ہم کو یہ بتاتے ہیں کہ ’فرینکو پرشین وار‘ کا اصلی سبب ابھی تک نا معلوم ہے۔ میں نہیں جانتا اصلی اور کیا ہوتا ہے اور کسے کہتے ہیں۔ کل کو کوئی یہ کہدے گا کہ اس جنگ عظیم جرمن کا اصلی سبب نا معلوم ہے۔ چنانچہ لارڈ ایکٹن نے عہد حاضر کی تواریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے جو لکچر ۱۱ جون سنہ ۱۸۹۵ ع کو کیمبرج یونیورسٹی میں دیا اس کا ایک حصہ اس کا ثبوت ہے۔ انہوں نے کہا:-

“ Even of a thing so memorable as the War of 1870, the true cause is still obscure; much that we believed has been scattered to the winds in the last six months, and further revelations by important witnesses are about to appear.”

ان کا ظہور آج تک نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ پالیسی کے ساتھ تواریخی علت اور سبب بھی بدلتے رہتے ہیں۔۔۔

انکم ٹیکس معلوم ہوتا ہے پبلک کو بہت ہی نا پسند تھا - ۳ اگست

کے اخبار کا یہ لطیفہ بھی خوب دلچسپ ہے :-

”پایونیر الہ آباد ناقل ہے کہ ممالک مغربی و شمالی [صوبہ
مکتدہ آگرہ] میں یہ مشہور ہے کہ یہ نیا تلس بسبب تشریف
آوردی دیوک اف ایڈنبرا کے لگا ہے اور دعا کرتے ہیں کہ ملکہ
معظمہ کو خدا اپنے لوگوں سے اتلی محبت دے کہ آئندہ اپنے
بچوں کو ہندوستان میں نہ بھیجیں —

یہی اشاعت ایک اور عجیب و غریب ٹیکس کی خبر دیتی ہے جو
الہ آباد کی میونسپل کمیٹی نے ہندوؤں کے مردوں پر لگا یا
تھا۔ یعنی جتنی لاشیں گڑا اور جمنا کے کنارے پر جلائی جاتیں
ان کے لئے فی لاش دھائی روپیہ لیا جاتا تھا۔ اس کے خلاف
بہت زور سے صدارے احتجاج بلند کی گئی —

۱۰ اگست سنہ ۷۰ کا اخبار آج کل کے سیاس اور بجٹ کے مبصروں
کے لئے سرمۂ بصیرت کا حکم رکھتا ہے۔ نیم جوشی اور گوکھلے مرحوم نے
اگر یہ تحریر دیکھی ہوتی تو ضرور تسلیم کرتے کہ بجٹ اور ہوم چارجز
پر بیسیوں برس پیشتر فریب اردو اخباروں کی نظر تھی۔ یہ تحریر
اخبار مذکور کے صفحہ ۲۵۰ پر ہے۔ عنوان ہی آج کل کے اہالی صحافت
کو چونکا نے والا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

”ہندوستان کی کماٹی انگلستان نے کھائی“

تحریر کیا ہے اعداد و شمار کی طویل فہرست ہے جسے چھوڑ دیا
جاتا ہے۔ یہ جملہ ملاحظہ کے قابل ہے :-

”منجملہ ان اخراجات کے ایک یہ ہے کہ جناب دیوک آف
ایڈنبرا نے ہندوستان کے روسا کو ہدیہ دیئے کے لئے جن جہزوں

کو مول لیا تھا اور اون کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے جتنے عہدے دار سب لندن سے کاکتہ آئے تھے اون کے جہاز کے کرایے میں مبلغ ایک لاکھ آٹھ سو اسی روپیہ خرچ ہوا تھا۔ انکم ٹیکس لوگوں کو تو ناپسند تھا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے قواعد ضرور نا واجب طور پر سخت اور غیر معقول ہوں گے۔ کیونکہ اخبار یہ خبر دیتا ہے کہ :-

” ۲۸ جولائی کو لندن سے تار برقی پر یہ خبر آئی کہ ۲۷ تاریخ کو چاند ممبران پارلیمنٹ اور وہ صاحب لوگ جو ہندوستان سے کچھ تعلق رکھتے ہیں جمع ہوئے۔ مسٹر چارلس ٹریولین صاحب پریسڈنٹ نے گورنمنٹ ہند کی دو باتوں پر اعتراض کیا اور کہا کہ اول تو فوج زیادہ ہے دویم رفاہ عام کے کاموں میں بھیجا صرف کیا۔ اس مجمع نے متفق اللفظ تفس کے قواعد کی مذمت کی اور یہ درخواست کی کہ ایک منتخب کمیٹی واسطے تحقیقات انتظام خصوصاً فنانشل ڈیپارٹمنٹ کے مقرر ہو۔“

۵ اکتوبر سنہ ۷۰ کا اخبار مندرجہ ہے کہ :-

” پٹھان کوت سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک انگریز ڈاکو ہو گیا ہے معہ چاند ہندوستانی رفیقوں کے مسلح ہو کر دہلی کے رستہ میں مسافریں کو مارتا ہے۔ اب تک یہ نہیں ثابت ہوا کہ کسی انگریز پر بھی کوئی حملہ کیا یا نہیں۔“

۱۲ اکتوبر سنہ ۷۰ کے اخبار میں ایک پروگرام درج ہوا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ سندھ پنجاب دہلی ریلوے کمپنی نے سلع پر جو پل بنایا تھا مکمل ہو گیا اور اس کے کھولنے کا شگون ۱۵ اکتوبر کو صہارا جہ

پتھالہ کریں گے۔ اس تقریب میں دہلی سے بھی چند رئیس بلے گئے تھے۔ اس مدت میں کوئی پرچہ فرانس اور پرشیا کی جنگ کی خبروں سے خالی نہیں نکلا۔ چنانچہ ۱۶ نومبر سنہ ۷۰ کا اخبار غباروں کی لڑائی کی خبر دیتا ہے۔ لکھا ہے :-

”فرانسیسیوں کی چالاکی میں شک نہیں جب غلیم نے انہیں زمین پر چھین نہ دیا تو غباروں میں بھٹھ کر آسمان کی طرف اڑنے لگے مگر پرشیا والے ان کو پورے استاد ملے آسمان پر بھی ان کا جاتاقب کیا ...“

یکم مارچ سنہ ۱۸۷۱ کا اخبار ’برہدو سماج‘ کے ضابطہ پر ایک طویل مضمون درج کرتا ہے۔ ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۱ کا پرچہ لکھتا ہے :-

”بہ ہیں تفاوت وہ از کجاست تابہ کجا۔ صاحب پایونہر لکھتے ہیں کہ سر سالار جنگ مدارالمہام حیدر آباد اور ہمارے سر درجہ تہذیب کے انتظام میں کس قدر تضاد ہے۔ ایک یہ ہیں کہ نئے نئے ٹیکس رعایا پر لگاتے ہیں ایک وہ ہیں کہ پہلے محصولوں کو موقوف کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے تینوں احاطے ٹیکس کے ظلم سے نالاں ہیں اور قلمرو نظام اس بار گراں سے سبکدوش۔ اگرچہ حیدر آباد میں بھی میونسپلٹی ہے مگر وہاں مکانوں اور پھلوں پر ٹیکس نہیں بلکہ ایک محصول دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ سال کا جو عرصہ سے پیشہ وروں پر جاری تھا گورنمنٹ نظام نے تین سال تک ایک قلم موقوف کر دیا۔“

معلوم یہ ہوتا ہے کہ انکم ٹیکس باقاعدہ ایجنسی ٹیشن کے علاوہ مزاج کا بھی نشانہ بنا۔ چنانچہ ۱۰ مئی سنہ ۷۱ کا اخبار ایک مضمون درج کرتا

ہے جس کا عنوان ہے ”ناک پر ٹیکس“۔ لکھا ہے یکم اپریل کو گورنر جنرل نے بہ اجلاس کونسل یہ ایکٹ پاس کیا کہ جو لوگ کسی قسم کا ٹیکس نہیں دیتے ان سے بھی ٹیکس لیا جائے گا اس ایکٹ کا نام ’ناک پر ٹیکس‘ ہوگا۔ جو لوگ نکتے یا چپٹی ناک والے ہوں گے وہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ رہیں گے۔ مگر جو ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنی ناک کٹا لیں گے یا بگاڑ دیں گے وہ بموجب دفعہ ۱۰۲ تعزیرات ہند سزا پائیں گے۔“۔ بڑے مزے کا اپریل فول ہے۔

۲۰ ستمبر سنہ ۷۱ کا اخبار مسٹر فور سائیکہ کمشنر جالندھر کی مفصل رائے کا ترجمہ چھاپتا ہے جو انہوں نے اخبار ایشیا تک مطبوعہ ۱۳ جون سنہ ۷۱ میں چھپوائی تھی اس کا لب لباب یہ ہے کہ ”ہندوستانیوں کو حکومت ہند میں بھرہ کافی دیکھا چاہئے۔“۔

پھر جوتی کا جھگڑا

۱۱ اکتوبر سنہ ۷۱ کا اخبار راوی ہے کہ :-

”ایک سخت اور تند مزاج قایم مقام دیپتی کشنر ملک اودہ نے بعض معزز اشخاص سے بہت سختی کے ساتھ گفتگو فرمائی کہ اگر تم انگریزی جوتا پہن کر ہمارے فرش پر آؤ گے تو ہم ہرگز نہ آنے دیں گے۔ انہوں نے گورنر جنرل کے آرڈر کا حوالہ دیا مگر صاحب نے نہ مانا۔“۔

۲۵ اکتوبر سنہ ۷۱ کا اخبار گورنمنٹ کے اس نئے حکم کی مخالفت کرتا ہے جس کی رو سے سرکاری ملازم پچھن سال کی عمر کو پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش کر دئے جائیں گے۔ اس طویل افتتاحیہ میں سے صرف ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے :-

”شہج شہراز کے مصرع - قدیمان خود را بہنژاے قدر - پر کیا

خوب عمل ہوا علاوہ اس کے سرکار کو تلخواہ زاید محض بے سود
دینی پڑے گی یہی جو لوگ برخاست ہوں گے انہیں نصف تلخواہ
بطور پنشن ملے گی اور ان کی جگہ پر جو مامور ہوں گے ان کو
پوری تلخواہ دینی پڑے گی —

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۱ ع میں لاہور سے ایک اخبار عربی
زبان میں نکلتا تھا - اس پر ۲۰ دسمبر سنہ ۷۱ کے اخبار میں مہرفانہ تبصرہ
ہے - یہ بتاتا ہے کہ یہ جدت کس دماغ سے پیدا ہوئی —

۵ جنوری سنہ ۱۸۷۰ کے اکمل الاخبار میں ایک ”انگریزی خواں کی
فریاد“ اس طرح شروع ہوتی ہے : —

”بھلا سرکار سے کوئی یہ تو پوچھے کہ اتنے ہندوستانیوں کو انگریزی
پڑھا کر کیا کرے گی - ان کو کہاں تک روزگار دے گی - جانے دو
ہم آپ ہی دیکھیں کہ اتنے ہندوستانی انگریزی پڑہ کر کیا
کریں گے - یہ بی - اے - ایم - اے یا کچھ اور کیونکر جنیں گے -
آپ ہی فرمائیے ہمارے لیے وجہ معاش کی کیسی قلت ہے -
ہم قوالی سیکھ نہیں سکتے جس سے شہسپیر کی طرح نام اور
معاش دونوں پیدا کر لیں ... کمر باندہ پورٹ ملٹو ہاتھ میں
لیے ہم اسٹریلیا بکریاں چرانے نہیں جاسکتے - کمانڈر انچیف
کبھی ہونے سے رہے - جہازی فوج میں ہمیں کون پوچھتا ہے -
فوج میں ہم گھسٹے نہیں پاتے - دنیا میں جو معزز وسیلے معاش
کے ہیں ان میں ہمارا دخل نہیں اب بتائیے رہا کیا - آپ
کہیں گے سول کے عہدے - بجا - لیکن آپ نے دیکھا بھی کتنے
ہندوستانی انگریزی خواں عہدوں پر ہیں - اتنے ہیں کہ انہیں

انگلیہوں پر گن لیجئے - ولایت جانے کی ایک پچ لگی ہے ...
 مطبعوں میں اتنی گنجائش نہیں کہ مضمون نویسی یا نامہ نگاری
 سے بسر اوقات کریں - کسی پیشے کی طرف (لہار - بڑھتی کے)
 اگر رغبت کرتے ہیں تو گھر کی خواجہ زادگی جانتی ہے -
 تجارت کے لیے سردست اتنا اثاثہ کہاں - بہت ہوئے بہت ہوئے
 کسی دفتر میں کلرک ہوئے لیکن وہاں بھی نقل نویسی ہی رہے -
 پولس میں بہت بڑھے تو تھانہ دار - کچھری میں بہت درجے
 تو سرشتہ دار - مال میں جا گھسے تو تحصیلدار - محکمہ افیون
 و نمک میں جا پھلے تو داروغہ ہو گئے اور عمر بھر رہے - ریل
 پر بلگالی گھسنے نہیں دیتے - بلک گھروں اور بڑے بڑے سردارگوں
 کے کارخانہ میں پارسی بھرے ہوئے ہیں - متعدد عہدوں کا نام
 لیوں یہ ہماری مجال نہیں - غیر متعدد عہدے یہ ہندوستان زما
 صاحب لوگ نہیں چھوڑتے - رہے دو چار ہندوستانی جو
 معزز عہدوں پر ہیں ان کا ذکر نہیں - عام سے کلام ہے -
 فرمائے یہ تھوڑی مصیبت ہے جہٹیں تو کیونکر چٹئیں - شکایت
 نہ کریں تو کیا کریں " —

یہ تحریر اقتصادی پہلو سے اور آج کل کی تعلیم یافتہ بے روزگاری
 کے لحاظ سے اتنی وقیع سمجھی گئی کہ یہاں بجلسہ نقل کردی گئی -
 زیست کی یہ کشمکش جسے آپ آج دو رہے ہیں اب سے ساٹھ پینسٹھ برس
 پہلے شروع ہو گئی تھی - ملک کے صاحبان بست و گشاد کا فرض تھا کہ میکالے
 کی فصاحت و بلاغت سے مسحور نہ ہو کر جیبی سوچتے کہ اس حالت کا انجام
 کیا ہوگا - ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ کو بتایا گیا تھا کہ اس وقت تمام

صوبہ پنجاب سے یعنی پنجاب خاص - سرحدی صوبے - دہلی اور پنجاب کی ریاستوں سے کل بارہ نوجوان ایف - اے میں پاس ہوئے تھے - آج صرف پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی ہی کی تعلیمی پیداوار پر نظر ڈالیے - زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں صورت حال سب پر ظاہر ہے -

ہندوستان کی صدائے احتجاج انکم ٹیکس کو آخر لے ہی مری - یہی اخبار انگلشمن کے حوالے سے راوی ہے کہ ”بے شبہ انکم ٹیکس موقوف ہو گیا کیونکہ سنہ ۱۸۷۳ - ۷۴ کے تخمینوں میں کہیں انکم ٹیکس کا ذکر نہیں“ - ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اسی سال یعنی سنہ ۱۸۷۳ ع سے پنجاب گورنمنٹ گزٹ اردو میں چھپنا شروع ہوا -

۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ کا لارنس گزٹ خبر دیتا ہے کہ کلکتہ لارنس گزٹ میرٹھ | یونیورسٹی کے انٹرنس کے امتحان میں جو مختلف مقاموں اور صوبوں میں ہوا کل ساٹھ سو چھییس امیدوار کامیاب ہوئے -

۱۶ فروری سنہ ۷۲ کا اخبار اردل میو گورنر جنرل کے قتل کی خبر اس شعر سے شروع کرتا ہے :-

رقم کس طرح ہو یہ حال تباہ

قلم کے نکلتے ہیں آنسو سیاہ

قانون دان حضرات یہ خبر نہایت دلچسپی سے سنیں گے جو ۱۳ فروری

سنہ ۱۸۷۳ کے لارنس گزٹ میں چھپی ہے :-

”لارنس گزٹ کے ایک کارسپانڈنٹ صاحب چیمبر سے رقم فرماتے

ہیں کہ چرخی دادری کے تہانہ دار نے چار تائین عورتوں کو

جو بچوں کا کلیجہ نکال لیتی ہیں بذریعہ چالان ریاست چیمبر

میں بھیجا ہے - یہ مقدمہ دو برو مہاراجہ صاحب بہادر کے پیش

ہوگا اگرچہ یہ بات بعید از قیاس ہے مگر ہم نے سنا ہے کہ جادو کے زور سے تائین عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہو جاتا ہے کہ جس کا چاہیں کلیجہ نکال لیں یعنی بدن سے غایب کر دوی —

لارنس گزٹ کے کارسہاندانت صاحب یا اس کے اڈیٹر صاحب تائین اور جادو کی نسبت چاہے کچھ رائے رکھتے ہوں سنہ ۱۸۷۴ ع میں ملک میں مجموعہ تعزیرات ہند رایج تھا اور اُس وقت یورپ کے ملکوں میں بھی جادو کُری مہمل چیز قرار پا کر قوانین متعلقہ سے خارج ہو چکی تھی — یہ کس طرح معلوم ہو کہ مہاراجہ صاحب جیند نے اُس مقدمہ میں کیا فیصلہ دیا — یہ کچھ ہی ہو ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے کہ تائین چڑیل — پچھلپائی وغیرہ صفات عورت کی ذات سے گزشتہ زمانے میں کیوں منسوب کی گئیں — مرد بھی اُس زمانے میں جادو کُری کرتے تھے وہ بچوں کا کلیجہ کیوں نہیں نکالتے تھے اس کا جواب یہی سمجھہ میں آتا ہے کہ انہیں بیچارے عورتوں کا کلیجہ جلانے سے فرصت نہیں ملتی تھی —

کھدر اور لٹکا شایر — دیسی ملیں اور مانچسٹر متخصر یہ کہ سودیشی اور بدیشی کا جھگڑا آج کا نہیں معلوم ہوتا — کم سے کم سنہ ۱۸۷۶ ع تک تو اس کا پتا چلتا ہے — اگرچہ وہ معاملہ خفیف تھا یعنی جلیڈو کے تاگے کا جھگڑا تھا کہ وہ ولایتی سوت کا چل پڑا تھا — لارنس گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل سنہ ۷۴ ع راوی ہے کہ :-

”نوساری کی پادسی عورتوں میں دفعتاً شہرت ہوئی کہ بمبئی سے کل کا کتا ہوا سوت آیا ہے جس سے پاک دورا جلیڈو کا پادسیوں کے لئے تیار ہوگا۔ یہ سنتے ہی تمام پادسی عورتیں غضبناک ہو کر اول برجورجی نوروزجی سردار قوم پادسی کے پاس جا کر فریادی ہوئیں کہ سوت جو کل سے تیار ہو کر آیا ہے اس سے ہماری

سو داگری کو نقصان پہنچھا۔“

لکھا ہے کہ جب سردار مذکور اور پارسى دستور سے حسب مشا
جواب نہ ملا تو وہ عورتیں زنانہ سکول میں گھس آئیں جہاں انہوں نے
استادوں اور شاگردوں کو ڈرایا۔ انجام کار دفع نزاع کی نظر سے وہ سوت
جو آدھا پوند تھا ان بھادر عورتوں کے حوالہ کر دیا گیا جسے انہوں نے
وہیں تار تار کر دیا اور سکول سے اپنی لڑکیوں کو جن کی تعداد تیس
تھی اٹھا کر لے گئیں۔

۲۲ مئی ۱۸۷۷ ع کے لارنس کزنٹ میں ہے :-

”افسروں کالج کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۷ ع کو اس

امر کا فیصلہ کیا ہے کہ جس طرح مرد طالب علم امتحان یونیورسٹی

کلکتہ کا دیتے ہیں اسی طرح عورات طلبہ بھی پردہ سے معرفت

عورتوں کے امتحان یونیورسٹی کلکتہ دیا کریں۔“

اسی اخبار سے معلوم ہوا کہ قاک کا کالا سے نانگہ میں سسلہ

جانا اسی سال سے شروع ہوا۔

۱۰ جنوری سنہ ۱۸۷۴ ع کی اشاعت اخبار کیا خاصا
نورالانوار - کانپور | گلدستہ - چوتھائی صفحہ اپنے اخبار کے منظوم اشتہار

سے بھرا ہے۔ باقی مندرجات نظم و نثر یک مصرعی سرخی سے مزین ہیں۔

۸ اگست سنہ ۷۴ ع کو یہ اخبار آبدوز کشتیوں کی نسبت یہ خبر دیتا ہے :-

”جرمنی کے مہر بحری نے کئی کشتیاں پانی کے اندر چلنے

والی واسطے تباہ کرنے جہاز دشمنوں کے بہ صلعت جدید

ایجاد کی ہیں

عام لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی کشتیاں فرانس کی ایجاد ہیں۔

جنگ جرمن میں ان کا زبردست استعمال جرمنی کی طرف سے ہوا ایک مراسلت کا عنوان ہے - ”نامہ احباب کے ہیں یہ مضامین لطیف“ اخبار سپین ٹیفک | انگریزی میں اس کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھا سوسائٹی - علی گڑھ | ہے - یہ ہفتہ وار تھا - بعد میں ہفتہ میں دو بار ہو گیا تھا - پہلے چلند صفحہ پہلو بہ پہلو اردو اور انگریزی میں ہوتے پور صرف اردو - کل اخبار ٹائپ میں چھپتا - صفحات کا شمار انگریزی کے مطابق بائیں طرف سے ہوتا - ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۷۹ ع کی اشاعت پر جلد ۱۱ نمبر ۱۹ درج ہے - سالانہ قیمت اٹھارہ روپیہ اور ڈاک کا محصول ڈیڑھ روپیہ تھا -

مذکورہ بالا اشاعت میں ہندوستانی جوتے کے معاملہ پر اردو اور انگریزی میں ایک لمبا مضمون ہے - لارڈ نارٹھ بروک کے استعفیے پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ہم لارڈ نارٹھ بروک صاحب بہادر کے عہد حکومت کی نسبت عموماً نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں اور گو بہ نظر ظاہر بڑودہ کے مقدمہ میں صاحب مددوح سے غالباً غلطی ہوئی اور ہمارے نزدیک بھی اس میں خلاف دور اندیشی طریقہ اختیار کیا گیا جیسا کہ قحط کے معاملہ میں غلطی ہوئی تھی اور اس میں چند امور خلاف دور اندیشی اختیار کئے تھے مگر ان دونوں صورتوں میں صاحب مددوح کا اصل منشا نہایت عمدہ اور عالی تھا“ -

یہ سرسید احمد خاں مرحوم کے قائم فی عشوہ گری ہے - اس کو کہتے ہیں مدبرانہ طرز تحریر - جو کہتا تھا وہ کہہ گئے اور اپنا دامن بھی بچا گئے - ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۷۵ ع میں ”تہذیب اور بد تہذیبی“ کے عنوان کے نیچے

ایک مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :-

”جس طرح کل ہندوستانیوں کا سپید رنگ ہو جانا اور ہر ایک ہندوستانی کا کوت پتلون پہن لینا اور ہندوستانی عورتوں کو انگریزی لباس زیب بدن کر کے بے پردہ گلی در گلی پھرنا دشوار ہے اسی طرح ہندوستانیوں کی تہذیب اور شایستگی کا صاحبان یورپ کے دل نشین ہو جانا بھی محال ہے۔ ہندوستانی کتنے ہی عازم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانت دار اور خوش کردار ہو جائیں مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور غیر مہذب ہی رہیں گے اور انگریز چاہے جتنی بد افعالیان کریں مگر وہ شریف کے شریف ہی ہیں.....“

۱۰ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کی اشاعت میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے :-
 ”انگریزی اخبار نویس ہندوستانی اخباروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں“ -
 ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۶ ع کا اخبار راوی ہے :-

”اخبارات دیلی تھاتھرات میں ایک دلچسپ تجویز پیش ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر دیسی سرداروں کو خطاب دیوک کا دیا جاوے ... ہوس ات لارڈ سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ ان ہندوستانی لارڈوں کو وہ ایٹنی جماعت میں داخل کر لیں“ -

۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کے اخبار میں ایک طویل اور مدلل مضمون اس موضوع پر ہے کہ :- ”بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی نہ کرنے میں کیا فساد ہے؟“ -
 اسی اخبار میں ایک اور مضمون ہے جس کا عنوان ہے :- ”بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متاثر ہے“ - اس مضمون کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-
 ”اب یہاں تک تو ہم نے سرکاری تدابیر سے فائدہ حاصل نہ کرنے کے ان اسباب کو بیان کیا جو خاص رعایا کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب ہم ان اسباب کو

بیان کرتے ہیں جو خاص انتظام ہی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک ان ملازموں کی کج اخلاقی اور ظلم اور زیادتی۔ اور اگر ہم سچ سچ کہیں تو بعض اوقات ان کی بد معاشی اس بات کی باعث ہے کہ ہندوستانی ان کی صورت دیکھنے اور ان کے پاس جانے سے اپنا مرنا بہتر جانتے ہیں۔“ —

(۵ - مئی سنہ ۱۸۷۶ کے اخبار میں مختلف واقعات کی ذیل میں ایک ٹوٹ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں آتا ہے - انگریزی میں آیا ہے ” Impressions or sentiments “ اُردو میں ان کے معنوں کو ” خیالی باتوں “ میں ادا کیا گیا ہے - یہ ترجمہ نہ جب درست تھا نہ اب ہے - اب تو ان دونوں کلموں کی جگہ اُردو میں ” ارتسام “ اور ” وجدانیت “ استعمال ہوتا ہے) —

۱۲ - مئی سنہ ۱۸۷۶ کے اخبار میں ایک زبردست افتتاحیہ درج ہے جس کا موضوع ہے ” شاہ جہاں پور کا واقعہ “ - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ جہاں پور میں کسی انگریز نے تین ہندوستانیوں کو قتل کر دیا تھا اور اپنے بیان میں کہا تھا کہ جب سے اس نے کانپور میں اس یادگار کو دیکھا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں مظلوم یورپیوں کے قتل کی بابت بغائی گئی ہے اس وقت سے اُسے ہندوستانیوں سے سخت دشمنی ہو گئی - لکھا ہے :-

” نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس نادان یورپین نے ان بیچارے ناکردہ گناہ ہندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی مکافات تصور کیا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کے ہلکامہ میں کسی اُردو کے طرف سے ہوا تھا اور جس میں ان مقتول ہندوستانیوں کو کچھ بھی دخل نہ تھا -۔“ —

اسی مضمون میں آگے جا کر لکھتے ہیں : —

ہم کو یاد ہے کہ اس بارے میں ہم نے اپنی ایک رائے بھی دی تھی جس کا منشا یہ تھا کہ ایسی یادگاریں ہمیشہ کیلئے کو تازہ کریں گی اور فساد کو بڑھاویں گی۔ پس اسی طرح ہم اب یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ پر یہ نظر بقاء امن و امان ضرور ہے کہ وہ ایسی جملہ یادگاروں کو نیست و نابود کر دے۔ —

چند سال ہوئے لاہور میں لارنس کے بت کے کتبہ پر بہت جھگڑا ہوا۔ مدتوں گورنمنٹ اور پبلک میں کشمکش رہی۔ مگر اب گورنمنٹ کی مصلحت اندیشی نے سرسید کے مشورے پر عمل کرنا مناسب سمجھا — ابھی کل کی بات ہے جب ساردا ایکٹ اسمبلی کے زیر غور تھا تو ہمارے ارباب وطن کے ایک طبقے نے اس کی مخالفت کی تھی اور اپنی جماعت کو اس کے اثر سے مستثنیٰ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۲ - مئی سنہ ۱۸۷۶ کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک صاحب ”قانون معاد تکاح“ کی تجویز پیش کرتے ہیں —

۱۵ - ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مفصل افتتاحیہ درج ہے جس کا عنوان ہے ”ہندوستانیوں کا خون“۔ یہ سرخی صدمت پراعت استہلال کا حکم رکھتی ہے۔ یہ مضمون مسٹر فلر کے مقدمہ میں لارڈ لٹن کی تلبیہ کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ پھر مختلف مقامات میں چھ ہندوستانیوں کے قتل کا ذکر کیا ہے جو حال میں یورپیوں کے ہاتھ سے ہوئے تھے۔ مضمون طویل ہے۔ سر دست اس اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے : —

(”قانون تعزیرات ہند کے اس حکم سے کہ اشتعال طبع کی

حالت میں قتل عند نہیں رہتا اور اگر آلہ قتل سے قتل نہ کرے تو قتل عند نہیں ہوتا یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بے رحم لوگ نہایت جری ہو گئے تھے اور ہر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کامیاب ہونے کے واسطے استعمال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا تھا مگر تاہم کچھ اندیشہ تھا۔ اور جب سے کہ شاہ جہاں پور میں ایک گورے کے ہاتھ سے تین ہندوستانی مقتول ہوئے اس وقت سے آلہ قتل کی بھی چندان پروا نہ رہی اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکی دار کا شکار بندوق سے ہی ہوا۔ اور اگر آئندہ ایسے امور میں تاکتروں اور جوریوں کی نیت بے خیر رہی تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہوگی اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔ —

اسی اخبار سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۷ - اکتوبر سنہ ۱۸۷۶ کو سرولیم میہور کو جو ایڈریس علی گڑھ میں دیا گیا جس کے سکریتری سر سید احمد خاں تھے وہ عربی زبان میں تھا۔ —

اودہ اخبار | نہ صرف دہلی والوں بلکہ تمام علم دوستوں کو اس کا برا
 قلمی تھا کہ وہاں جو دربار قیصری کا انعقاد ہوا تو اس سے امید تھی کہ دہلی کی شان میں ایزادی ہوگی۔ لہذا یہ ہوا کہ قدیم دہلی کا ایچ توڑ دیا گیا۔ ۱۷ - جولائی سنہ ۱۸۷۷ کا اودہ اخبار راوی ہے کہ :-
 "مسٹر فاسٹ صاحب دہلی کالج کے قوت جانے کا قضیہ ہوس ان کالجز میں پیش کرنے والے ہیں۔ اور انڈیا آفس سے اس باب میں تاد برقی بھی آئی ہے اور اس میں لکھا ہے کہ کیونکو اور

کیوں یہ کالج تو دیا گیا —

اخبار عام | ۶ فروری سنہ ۱۸۷۱ کا اخبار عام کلکتہ یونیورسٹی کے سنہ ۱۸۷۱
 کے بی۔ اے کا نتیجہ شایع کرتا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اکیس
 تعلیمی اداروں نے دو سو بارہ امیدوار اس امتحان میں بھیجے جن میں سے
 کل چوراسی پاس ہوئے۔ سب سے زیادہ طلباء پریسڈنسی کالج کلکتہ نے
 بھیجے یعنی ۷۶۔ جن میں ۳۵ پاس ہوئے۔ دہلی کالج تین میں سے ایک
 لاہور کالج سے صرف ایک امتحان میں بیٹھا جو فیل ہو گیا۔ ان اعداد
 کو یونیورسٹیوں کے آج کل کے نتائج سے کیا کوئی نسبت ہے —

۱۶ اگست سنہ ۷۱ کا اخبار سول سروس کے امتحان کا نتیجہ شایع
 کرتا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ کل ۴۸ پاس ہوئے جن میں سے بابو
 دومیش چندر دت دوم نمبر پر رہے اور آٹھ سو کا انعام پایا ان کے
 سوا دو اور ہندوستانی امیدوار اس امتحان میں پاس ہوئے یعنی
 بابو بہاری لعل گوپت چوتھے نمبر پر اور بابو سراندر ناتھ بلرچی
 بیسویں نمبر پر —

(۱۷ اپریل سنہ ۷۱ کا اخبار بتاتا ہے کہ :-

”لاہور گورنمنٹ کالج جو کہ پہلے ہیرا ملتی میں راجہ دھیان
 سنگھ کی حویلی میں تھا اب انار کلی میں جہاں پہلے لاہور کرائیکل
 تھا چلا گیا“ —

یکم مئی سنہ ۷۱ کا اخبار انجمن پنجاب کے جلسہ منعقدہ ۲۷ اپریل
 کی کارروائی دیتا ہے جس کی یہ دو مدات دلچسپی سے خالی نہیں —
 ”تجویز دوم - گورنمنٹ میں ایک درخواست اس
 مضمون کی روانہ کی جاوے کہ کل جلسوں میں جہاں صاحبان

یورپین و دیسی دونوں شامل ہوں تقریر صرف بہ زبان
اردو ہوا کرے۔“

”تجویز سوم - نوکری بلا کسی وجہ خاص کے کسی شخص
کو سوائے دیلے کسی امتحان کے نہ ملا کرے۔“

معلوم یہ ہوتا ہے کہ چٹا گونگ اور اس کے قرب و جوار کی آب و ہوا
نفسیاتی صحت پر خاص اثر رکھتی ہے - حال میں جو کچھ اُس نواح میں
ہوا اور ہو رہا ہے یہاں کا محتاج نہیں - ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں
ہمیشہ ایسی ہی ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہی ہیں - چنانچہ ۸ مئی سنہ ۷۱
کے اخبار عام میں لکھا ہے :-

”چٹی گونگ - یہاں کے مصلف سخت مصیبت میں ہیں -
مستغنیٹ لوگوں نے جن کے مقدمے کچہریوں سے خارج ہو جاتے
ہیں کیا عادت سیکھی ہے کہ اس مصلف کے گھر میں جس نے
ان کے بر خلاف فیصلہ کیا آگ لگا دیتے ہیں۔“

۱۵ مئی ۱۸۷۱ کا اخبار یہ لوکل خبر معہ اپنے حاشیہ کے لکھتا ہے :-
”لاہور - ایک انگریزی اخبار سے منکشف ہوا کہ چیف کورٹ
پنجاب نے ایک لڑکے کے واسطے جس کی عمر تیرہ سال کی تھی
ایک لڑکے کو کوئٹہ میں دھکا دے کر گرا دیلے کے جرم پر
حبس دوام کا حکم صادر فرمایا - تھوڑے دن ہوئے کہ ایک گورے نے
ایک لڑکے کو لاہور میں ایک خندق میں دھکا دے کر مار ڈالا اور
صرف ایک ہی سال کی قید سخت کا حکم ہوا تھا - حقیقت میں
انصاف کے یہی معنی ہیں۔“

۳۱ مئی سنہ ۷۱ ع کے پرچے میں ایک نہایت اہم افتتاحیہ درج

ہے۔ صاحب اخبار نہایت دلسوزی سے شاکی ہیں کہ گورنمنٹ انگریز بہادر نے جو انگریزی اور فارسی کی تعلیم عام کردی تو اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ جس طرح ان کے وطن میں سب پیشہ ور تعلیم یافتہ ہیں اور وہ لوگ تعلیم پا کر اپنے اپنے پیشے کی ترقی اور ایجادیں کرتے ہیں ویسا یہاں بھی ہوگا۔ لیکن یہاں نتیجہ الٹا ہوا۔ پورے لکھنؤ کو لوگوں نے اپنے پہلے کام کو بھی دھتتا بتائی ایجاد و اختراع کا تو ذکر ہی کیا۔“

۷ جون سنہ ۷۱ کا اخبار خبر دیتا ہے کہ پانچ روپیہ کا کرنسی نوٹ عنقریب جاری ہو جائے گا۔

۱۹ جولائی سنہ ۷۱ کے اخبار میں دو دلچسپ خبریں درج ہیں:-

(۱) ”حبشی غلاموں کا فروخت ہونا شہر بمبئی میں ۵۵ حبشی اطفال بسواری جہاز دھانی وارد ہوئے ہیں اور وہاں کے کمشنر پولیس کی نگرانی میں ہیں جو اشخاص ان کو نوکر رکھنا چاہیں اپنی درخواست پیش کریں۔“

(۲) ’قصاص - ۷ جولائی کے انگلشمن میں درج ہے کہ ایک گورہ سپاہی رابلسن جس نے مقام اسیر گدہ میں ایک شخص تھکرو نامی کو سوک پر چلتے ہوئے مارا تھا اس کو چیف جسٹس بمبئی نے پھانسی کا حکم دیا۔ ۲۶ جولائی ۷۱ کے پرچے میں لکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی رائے میں لکڑی کاتنے کا وقت اتنے چاند کے دنوں میں ہے۔ چڑھتے چاند میں کاتی جائے گی تو ناقص اور ناپائیدار ہوگی۔ انگلستان میں اس کی پابندی کرتے ہیں اور فرانس میں تو چڑھتے چاند لکڑی کاتنے کی قانوناً ممانعت ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ برازیل میں فن فلاحی کے ایک بڑے ماہر نے اپنے تجربے سے یہ سمجھایا کہ جو لکڑی پودنمائی کے قریب کرائی گئی

تھی اس کو جلد گھن لگ گیا اور وہ خراب ہو گئی —

۲ اگست سنہ ۷۱ کے اخبار میں سر تانلڈ میکلیوڈ سابق لڈلٹ گورنو پنجاب کے ایک خط کا ذکر ہے جو لندن ٹائمس میں چھپا تھا۔ اس کا یہ اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے :-

” جب تک معاملات سلطنت ہند میں ہم ہندوستانیوں کی

صلاح نہ لینگے کبھی وہ معاملات بہتری کی طرف رجوع نہ کریں گے “

۱ اگست کے اخبار میں حضرت سلطان دوم کی نئی کشتی ’کیک‘ کا تذکرہ اور تصویر بھی ہے ۲۳ اگست کے اخبار میں ناصر الدین شاہ ایران کی تصویر اور بوشہر کا نقشہ ہے - ۳۰ اگست کا اخبار ’روتہ ستمبر‘ کا حال اس طرح لکھتا ہے :-

” دریڈولا روتہ ستمبر یعنی اُس قسم کی دیل گازی جو کلکری کی کچی سوک پر چلے بنی ہے ہندوستان میں یہ روتہ ستمبر راولپنڈی سے جہلم تک واسطے روانگی تاک اور مسافروں کے جاری ہوئی —

۲۹ نومبر سنہ ۷۱ کے اخبار میں ایک وحشت ناک خبر مٹنوی کی صلف میں نظم کر کے لکھتے ہیں - عنوان ہے ” ظلم ایک زنگی مردم خوار کا “ ملاحظہ ہو :-

اخبار نسیم جونپور کا	ہے واقع ظلم یہ سنانا
جبرالتر اک جگہ کا ہے نام	زنگی کوئی واں تہا بدسر انجام
اس نے لوکا کسی کا پکڑا	شہرگ سے سب اس کا خون چوسا
ہر چلد وہ چپخا اور کیا غل	یہ پی گیا خون بے تامل
اس پر یہ نیا ستم دکھایا	اک ہونٹ بھی اس کا بھون کھایا
ہیں ’مہجر‘ جہاں میں ایسے بھی مرد	جن کو ہم جنس کا نہیں درد

بدیا بلاس | جموں کا اخبار بدیا بلاس اپنی دسمبر سنہ ۷۳ کی اشاعت میں سرکار انگریزی کی فوج کے مصارف کے سلسلہ میں یہ

دلچسپ اعداد شایع کرتا ہے :-

” ایک مابڑی توپ خانہ گھوڑے کا خرچ ایک لاکھ پانچ ہزار
دو سو چالیس روپیہ سالانہ ہے ایک رجمنٹ سواران فوج گورہ
کا خرچ تین لاکھ ساٹھ ہزار پانسو تیس روپیہ سالانہ ہے -
ایک ہندوستانی سواران رسالہ کا خرچ دو لاکھ انتالیس
ہزار چھ سو دس روپیہ سالانہ ہے “

اخبار انجمن پنجاب | ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۳ ع کا اخبار انجمن پنجاب
راوی ہے کہ :-

” مسٹر کروم صاحب بہادر نے شہر کے شکار کے لئے ایک عجیب پوشاک
ولایتی ثاث کی بنائی ہے اس میں بہ وسیلہ چمڑے کے لوہے
کی تین تین انچ لمبی مہنچیں نوکدار اور نہایت پائدار
لگائی ہیں اور دوسری یہ خوبی ہے کہ جس جگہ شیر اپنا
پلجہ یا منہ مارے تو خود زخم شدید کھاوے اور شکاری کو
کسی قسم کی ایذا نہ پہنچے - یہ پوشاک سرسے پانو تک اسی
قسم کی بنائی گئی ہے “

ترجمان شرق | یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ استنبول سے ایک اخبار ’دار الخلافہ‘
فارسی زبان میں نکلتا تھا - سنہ ۱۸۷۸ میں وہیں سے

ایک اخبار اردو زبان میں بھی نکلتا شروع ہوا - اس کا نام تھا
اخبار ’ترجمان شرق‘ اس اخبار کے نکالنے والے آیا ترک ہی تھے یا
کوئی ہندوستان سے گھا ہوا شخص تھا ؟ یہ نہ معلوم ہو سکا - بہر حال

یہ اخبار بین ایشیاٹک تحریک کا علمبردار معلوم ہوتا ہے - یہ اخبار پندرہ روزہ تھا اور اخبار دار الخلافہ والے ہی اس کے بھی سر براہ کار تھے - ایک اقتباس اس اخبار کا ملاحظہ ہو :-

”دوس و ترک‘ ضاع شملہ کے باب میں (نہوارفوس) نام اخبار لکھتا ہے کہ روسی شہر مذکور کے قریب ہوتے جاتے ہیں چنانچہ دو فرقہ ہو کر ایک پندرہ پلٹن اور دوسرا بھی پندرہ پلٹن اور ایک آلائی سواری سے مرکب ہونے کے لئے ہر دو فرقہ عسکر (قرۃ کوز کوئی) کو آیا ہے اور اسی ہر دو فرقہ عسکر کی پس آٹھ ہاتر یا توپ ہونے سے تیس ہزار نفر کے لئے یہ اس قدر توپیں بہت زیادہ خیال کی جاتی ہیں - ضلع شملہ میں جو خبریں شایع ہوئی ہیں اون کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شملہ اور وارانہ کی قلعوں میں عساکر دولت علیہ سے صرف دس پلٹن رہیں گی باقی سب عساکر شاہانہ وہاں سے نکل جائیگا “

یہ شملہ اُس وقت کی ترکی یا اس کے توابعات میں معلوم ہوتا ہے - اس تحریر کی زبان اور اسلوب سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہوئی نہیں - فوج کے حصہ کے لئے ’فرقہ‘ اور ’عساکر‘ (جمع عسکر) کے لئے فعل صیغہ واحد استعمال ہوا ہے - اس کے علاوہ ساری عبارت کا اسلوب انوکھا ہے - اور اہل اردو کے قلم سے نہیں معلوم ہوتا —

دوس اور دوم کی سنہ ۱۸۷۷ ع کی جنگ کے | نصرت الاخبار - دہلی
دوران میں سرکار برطانیہ کسی طرف نہ ہوئی -

اس لئے تمام رعایا کو فہر جانب داری کی تاکید کی گئی جو ہندوستان پر بھی عاید ہوئی۔ یہاں زخمی اور بھروسے اور جنگ کے یتیموں کی امداد کے لئے چلے ہوئے۔ سرسید احمد خاں شاید مزید احتیاط کی رو سے اس فائدہ میں چلے دیئے کے بھی خلاف تھے۔ نصرت الاخبار نے اس کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۷ کے اخبار میں لکھا ہے:-

”وایے بر حال ان مسلمان اشخاص کے جو خود تو سعی نہ کریں اور اگر کوئی کرے اس میں ہارج ہوں ... ایسے اشخاص مسلمان گاہیکو ہیں برادر زادگان دوسرے سمجھنے چاہئیں۔ اور بیش در بیش باعث حیرت و بوالعجبی یہ ہے کہ ہندو صاحبان صرف بوجہ محبت اہل اسلام ہندو مساعی جہیلہ اعانت دہم میں فرمادیں اور بعض اشخاص باوجود ادعائے اسلام مخالفت دہم کا تشقہ اپنی پھشانی پر کھجوائیں ... کوہ کسولی میں منشی گلگا بشن صاحب نے ۱۰ ماہ جون سنہ ۱۸۷۷ کو مسجد کسولی میں مسلمانان مقام مذکورہ کو جمع فرما کر ایک نہایت دلچسپ طولانی اسپیچ واسطے اجتماع چلے امداد بھوگان و یتیمان عساکر سلطان دہم خلد اللہ ملکہ بڑی عمدگی سے ادا فرمائی جس کی پر تاثیر ہونے کے سبب سے اسی جلسہ میں دو سو روپیہ جمع ہو گئے اور اب دگسائی اور سہاتو و کسولی ہر سہ مقامات پر منشی صاحب کی جانب سے واسطے اجتماع چلے کے اور کوشش جاری ہے۔“

۱۱ جولائی سنہ ۷ ا ع کے اخبار میں ایک مضمون ہے جو ہندوستان

کے اقتصادی بھی خواہوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوگا۔ لکھتے ہیں:-

ہندوستانی بھپارے کوئی چیز بناویں تو اول کوئی قدر نہیں کرتا مثلاً تلوار گجرات کی کہ روے زمین پر مثل اس کے نہیں ہوتی مگر راجپس کا ہی دم بھرتے ہیں۔ اور پارچہ زرین بنارس کا کہ پائدار عمدہ ہوتا ہے مگر دلاہتی کی قدر ہے۔ خصوص عمارت کہ دو دو ہزار برس کی موجود ہیں ...۔“

۱۱ نومبر سنہ ۷۷ کا پرچہ ایک خبر نہایت عجیب سنا تا ہے :-
” نواب صاحب لوہارو کو اوس لیاقت کے صلہ میں جو انہوں نے انگریزی میں حاصل کی ہے گورنمنٹ نے دو توپیں معہ کل سامان کے انعام دی ہیں۔“

۱۱ جنوری سنہ ۷۷ کا اخبار ’ہندوستانیوں کا قصاص‘ کے عنوان کے نیچے لکھتا ہے :-

” قائدزاف انڈیا کا لندن سے ایک کارسہاندانت لکھتا ہے کہ ایسپرسات انڈیا نے ویسراے صاحب کو ایک خط اس مضمون کا لکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے انگریز جو ہندوستانیوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے خون کی کچھہ بھی سزا نہیں پاتے اس کی باہت آپ کو چاہئے کہ انگریزوں کو ایسا کرنے سے جہاں تک آپ سے ہو سکے روکیں اور ان کو ایسا کام کرنے پر سزا لایقہ بغیر کسی لحاظ کے دیں۔“

آگرہ اخبار مطبوعہ ۷ جون سنہ ۱۸۷۷ میں سید امجد علی
آگرہ اخبار - آگرہ | اشہری ایک مضمون بڑی تحقیق اور تلاش کا لکھتا

ہیں اس کا عنوان ہے ہندوستان میں فارسی زبان - سنہ :-

” حالات و واقعات بادشاہان سلف و بعض رسائل و اذکار سے

جس قدر مستعبط ہوا عرض کرتا ہوں کہ پیشتر جب اس ملک ہندوستان میں صرف ہندو ہی ہندو راج کرتے تھے اور مسلمانوں کی سلطنت یا حکومت کہیں نہ تھی تب بھی راجگان ہند کی طرف سے جو تحریریں بادشاہان ایران و امراے افغانستان کو جاتی تھیں وہ پارسی میں ہوتی تھیں اور جیسے اب انگریزی لکھنے کو ریاست ہائے اسلام میں انگریزی داں مقرر ہیں اسی طرح اس زمانے میں پارسی لکھنے کے لئے راجاؤں کے پاس پارسی داں منشی دھتے تھے۔ چنانچہ رسالہ تحقیق اللسان تالیف منشی قمر الدین لاہوری میں لکھا ہے کہ پیش از سلطنت اسلام نیز رایان و راجگان ہند با سریر آرایان ایران و افغانستان نامہ ہا و مکاتیب بزبان پارسی می نوشتند و پیغامہا بہ زبان سفیر پارسی می گذاشتند۔“

اس سے پہلے کہ اس قرن کو ختم کیا جائے یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دہلی کے اکمل الاخبار کی سنہ ۱۸۷۳ ع کی جلد میں ان بیس معاصرین کے حوالے موقع بہ موقع آئے ہیں :- ۱ اردو گائیڈ - ۲ اخبار انجمن پنجاب - ۳ پنجابی اخبار - ۴ کوہ نور - ۵ دہلی گزٹ - ۶ لارنس گزٹ - ۷ سہن تھنک علی گڑھ - ۸ پایونیر - ۹ اودہ اخبار - ۱۰ کارنامہ - ۱۱ نور الانوار - ۱۲ پٹیالہ اخبار - ۱۳ بدیا بلاس - ۱۴ نجم الاخبار - ۱۵ شعلہ طور - ۱۶ اندھین مرور - ۱۷ دبدبہ سکندری - ۱۸ احمد آباد ساچار - ۱۹ کبی بچن سدھا بھارس - ۲۰ نور الابصار -

تیسرے دور پر تبصرہ

۱۔ سیاسی جذبات اور قومی احساسات۔ اس قرن میں بھدار ہونے

لگے تھے - انکم ٹیکس کے خلاف زور سے صدائے احتجاج بلند ہوئی - سول سروس کی عمر - انگلستان کے ساتھ ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان قائم کرنا - جوتے کا معاملہ - ہندوستانیوں کے خون کا قصاص - تعلیم یافتوں کی بے روزگاری - اور سالانہ بجٹ پر نقد و نظر - یہ باتیں اس دور کے خاص واقعات ہیں - آریہ سماج کا قائم ہونا سوامی دیانند اور سید احمد خاں کی اصلاحی تلقین کا پراپیگنڈا ملک کی ذہنیت پر قبضہ کر رہا تھا - شمال مغربی سرحد کے معاملوں میں اب زیادہ دلچسپی لہے لگے - مختصر یہ کہ سیاسی دلچسپی حقوق کے مطالبات اور قومی غیرت و خود داری کا عنوان شروع ہو گیا تھا - اور مفید عام مضامین اب زیادہ نکلتے لگے —

اردو ادب کی تاریخ میں بھی اسی دور نے عہد جدید قائم کیا یعنی سنہ ۱۸۷۳ء میں نئی شاعری کی بنیاد پڑی اور فسانہ آزاد اردو اخبار کے ضمیمہ کی طور پر نکلتا شروع ہوا —

انشا | انگریزی سے ترجمہ اب اردو انشا پر اثر ڈالنے لگا - فارسی کی کسی کے ساتھ انگریزی لفظ داخل ہو رہے تھے - مثلاً انسٹی ٹیوشن - لائف ممبر - کار سپانڈنس - ڈپوٹیشن - آرٹکل وغیرہ وغیرہ - اگرچہ اخباری انشا میں فارسی کا وہ عمل دخل نہیں رہا تھا جو اس سے پہلے دور میں تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا بہت بد نما اثر ڈال رہا تھا - مثلاً ”پنجاب کے کالجوں“ کے بدلے ”کالج ہائے پنجاب“ یا اہالیان ڈپوٹیشن - ممبران کمیٹی - ماسٹران کالج و مڈل سکول - وغیرہ وغیرہ - کون سا امر مانع تھا جو وہ کمیٹی کے ممبر اور کالج اور مڈل سکول کے ماسٹر لکھتے - اس کے ساتھ ہی بعض عجیب اختراعیں اور گھونٹیں بھی اس عہد کی انشا میں پائی جاتی ہیں - مثلاً ’ہمصحایف‘ بہ معنی ہم عصر یا معاصر کے - یہ استعمال

قطعاً غلط تھا۔ 'طالب علم دفعہ چہارم' معلوم نہیں ہوتا کہ یہ دفعہ کس تعزیرات میں سے اخذ کی گئی۔ 'کلاس' کی جگہ دہلی اور پنجاب میں 'جماعت اور-یوپی اور اودہ میں' درجہ بولتے تھے اور یہ استعمال ان کا اول سے چلا آتا ہے۔ مگر یہاں دفعہ استعمال کیا گیا۔ ریکروت کو ہم رنکروت کہتے ہیں۔ انہوں نے اصلی لہجہ کا پاس کر کے اسے ریلنگروت بنا دیا۔ یہی حال ہتھال کا ہے۔ اگرچہ اب ثقل تلفظ کی وجہ سے اس کو ہوتال کہتے ہیں۔ پھر ایسی ترکیبیں ان کے ذہن پر فارسی اسلوب کی غلامی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ مثلاً واسطے تباہ کرنے جہاز دشمنوں کے۔ برف بھی پڑتا تھا۔ شہر و بکری۔ رونق افروزی شہزادہ ویلز الہ آباد۔ بلتھیں مر رہی ہیں۔ جو باتیں بیان کہیں ہیں۔ کامیابی اختیار کی۔ ہال انجمن پنجاب۔ لکچر کا لفظ ایک ہی تحریر میں مذکور بھی اور مونث بھی استعمال کرنا۔ اس کے ساتھ بعض اچھی اختراعیں بھی ہوئیں جیسے 'سپیشل ترین' کو 'خاص ریل' لکھنا اور 'مال ترین' وغیرہ۔ اور ایسے فقرے گاریاں تکرے تکرے ہو گئیں، نظم سے رغبت اب بھی ویسی ہی رہی چنانچہ ایک خبر کا عنوان ہے۔

کرتی ہے اندھا ہوس انسان کو

نیک و بد کچھ بھی نظر آتا نہیں

"ٹیکس کے مادہ میں تحریک؛" اس میں انگریزی لفظ میٹر کا ترجمہ

کر دیا گیا وہ بھی غلط اس لفظ کے بہت سے معنی ہیں اور تھ۔ وہ معاملہ لکھ سکتے تھے۔ ایک اور بات جو اس دور کے اکثر اخباروں سے متعلق ہے یہ ہے کہ وہ سرکاری گزٹ کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ عنوان دیا کرتے تھے :- 'تقرر'،

توقی، 'ترخص' تبدیل تفعیل کا وزن برابر چلتا تھا۔

۱۸۸۱ء

۱۸۸۱ء میں اس دور نے کوئی ترقی نہیں کی سوائے اس کے کہ وقتہ
 یعلیٰ تیش کا استعمال ہونے لگا۔ اور ہر خبر یا مضمون کے ختم پر
 لفظ 'فقط' لکھا دینا 'اس وقت اور 'اس ملک' میں الف کے سوا باقی سب
 حروف کو ملا کر لکھا اب تک جاری تھا۔ پہلے دور میں 'شالا مار' کو 'شعلہ
 مار' بنا دیا تھا۔ اب لال تین کے الف کو عین سے بدل دیا۔ شاید اس زمانے
 میں ساری لال تینیں سرخ شہسے کی ہوتی ہوں گی۔ 'انچ کے آخر میں دو
 چشمی' ہر ماہ دیتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سنہ ۱۸۸۰ ع سے سنہ ۱۸۸۳ ع تک

۱۸۸۰ء اخبار

پہلے ہندوستان کے والیان ریاست کی نقل و حرکت اور
 آپس میں ملے جلنے پر سرکار اور انگریز اخباروں کی
 خاص نظر دھتی تھی۔ ۲ جنوری سنہ ۱۸۸۰ ع کا اودہ اخبار لکھتا ہے:-
 ”ناظرین اخبار کو یاد ہوگا کہ مہاراجہ سیلدھیہ پچھلے دنوں
 واسطے عیادت مہاراجہ صاحب اندور کے رونق افروز ہوئے
 تھے اس پر اخبار 'بمبئی ریویو' نے وہ باندھو باندھا کہ
 الہی توبہ۔ انگریزی مہذب اخبار اور ایسے لاطایل ڈرپوک
 خیالات۔ کچھ اسی اخبار پر ملخص نہیں بلکہ بمبئی ٹائمز
 بھی اخبار ”بمبئی ریویو“ کا اس خاص معاملے میں ساتھی
 ہے وہ لکھتا ہے:- ”مطلب اس سے (مہاراجہ سیلدھیہ کے اندور
 جانے سے) یہ ہے کہ اگر وسط ایشیا میں کچھ بوی فتور پڑا
 تو مرہٹوں کی ریاستیں اور حیدرآباد کی ریاست بالکل ہر
 خلاف ہو جائیگی۔ اس قسم کی بدگمانی اور بد باطنی انگریزی
 اخباروں کو شایاں نہیں ہے۔“

بعض آدمیوں کا بھولا پن بھی کٹھا مزے کا ہوتا ہے - فسانہ آزاد اودہ اخبار کے ضمیمہ کی شکل میں ابھی نکل رہا تھا کہ ایک صاحب کے خاتون فسانہ وغیرہ کے وطن اور مکان کا پتا پوچھ ہی تو لیا - اس کا جواب حضرت سرشار ۶ جنوری کے اخبار میں اس طرح دیتے ہیں :-

”جی بے چکے“

”بت طناز پھاری حسن آرا بیگم اور ان کی ہمشیرہ سراپا انداز سپہر آرا بیگم اور انکی دادی جان بڑی بیگم کے مکان اور وطن مالوف کا پتا مولوی کریم الدین صاحب المتخلص بہ مضطر ہم سے دریافت کرتے ہیں - ہم حضرت مضطر کی خدمت میں ملتمس ہیں کہ عنوان مضمون ہذا ملاحظہ فرمائیں - خوب اچھا سوال کیا - حضرت ہم نہ بتا ئینگے“

۳۰ جنوری سنہ ۱۸۸۰ ع کے اودہ اخبار کا ایک اندراج اس وقت کے

سیاسی جد و جہد پر روشنی ڈالتا ہے - لکھا ہے :-

”شاہی اعلان سنہ ۱۸۵۸ ع کی تصدیق :خود لارڈ لٹن نے جلسۂ قیصری دہلی میں کی تھی گو یہ وعدے مہربانی سے ہوئے ہیں کہ سول اور فوجی عہدے ہندوستانہوں کو دیے جائیں گے مگر تب بھی انکو عہدے نہیں ملتے ہیں - امتحان متعہد سول سروس میں ایسی سخت قید لگائی گئی ہے کہ جس سے عمداً ایک ممانعت ہے - ہندو راجہ بموجب ’منو‘ کے قاعدے نے پیدا وار کا آٹھواں حصہ وصول کرتے تھے - مسلمان بادشاہوں نے بڑھا کر چوتھائی قرار دیا لیکن حال کی اوسط

تو کسیقدر نصف سے کم ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ ہندو راجہ اور مسلمان بادشاہ مال گزاری بتائی سے لیتے تھے اس صورت میں پیدا وار اچھی ہوئی تو آمدنی بھی اچھی ہوئی اور کم ہوئی تو آمدنی بھی کم ہوئی۔ لہذا رعایا کو اس زمانے میں تکلیف نہ پہنچتی تھی اب رعایا کو مال گزاری کے لئے روپیہ تلاش کرنا پڑتا ہے خواہ وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش کر سکے یا نہ کر سکے۔ اس کے بعد طرح طرح کی شکایت فوجی مصارف اور ایکٹ اسلحہ اور بہت بڑی فوج ہندوستانی رئیسوں کی اور دیسی اخبارات کے ایکٹ اور آخر میں انکم ٹیکس کی ہے۔“

۱۹ فروری سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار میں ہے :-

”پنجابی اخبار لاہور سے یکتائے زمانہ خوشنویس یگانہ امام ویردی مرحوم و مغفور کے انتقال کی خبر سنکر ہم کو نہایت افسوس ہوا۔ امام ویردی مرحوم فن خوش نویسی میں اپنے وقت کے امام اور میسر پنجہ کش مرحوم دہلوی کے قائم مقام تھے۔“

دہلی کالج کے توڑ دئے جانے کا نہ صرف دہلی والوں بلکہ کل اہل وطن کو

الم تھا۔ ۹ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کا اودہ اخبار لکھتا ہے :-

”نہایت خوشی کی بات ہے کہ دہلی کے چند روسا اور صاید اس غرض سے شملہ پر تشریف لے گئے ہیں کہ دہلی کالج کے ازسرنو قایم کرنے میں حضور لارڈ رین وایسرائے و گورنر جنرل ہند سے اعانت کے خواستکار ہوں یہ کارروائی نہایت ہی مستحسن معلوم ہوتی ہے اور انہوں نے ایسے وقت میں خوب ہی سوچی ہے۔۔۔۔۔“

۱۴ جولائی کے اخبار میں دیسی کتب خانے کے عنوان سے ایک مفید مضمون ہے۔ اس کا یہ تکرار ان حضرات کی توجہ کے قابل ہے جن کے گہروں میں کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ لکھا ہے :-

”ہندوستان کے اکثر شہروں کے خاندانوں میں بظاہر عمدہ عمدہ کتب خانے موجود ہیں اور ایشیائی علوم و فنون کی مختلف کتابیں ان کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں لیکن ایسے شخصی کتب خانوں سے ملک کو مطلق فائدہ نہیں پہنچتا۔ کتب خانوں کے مالک طلبہ کو کتابیں نہیں دیسکتے.....۔“

۲۷ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار میں ایک خاص طویل مضمون ہے جس کا عنوان ہے ”تہرہویں صدی کے جعفر زتلہوں کی طرف گورنمنٹ اور قوم کو متوجہ ہونا چاہئے“۔ یہ کھلی بات ہے کہ اودہ اخبار اور اودہ پلچ کی بہت چلتی تھی۔ حالانکہ حضرت سرشار اودہ پلچ کے اولین نمبر کے نامہ نگار تھے۔ لیکن آگے چلکر اخباروں کے فنیہ شخصیتوں پر غالب آگئے۔

۲۸ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کی اشاعت میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے نئی روشنی۔ اُس وقت یہ روشنی شروع ہوئی تھی اُس وقت دھک دھکی رہی ہے۔ اور مغرب زدہ اور مغرب زدگی کی آوازیں کانوں میں آنے لگی ہیں۔ یہ معلوم کرنا نتیجہ خیز ہوگا کہ اُس وقت اس نئی روشنی کا استقبال کیسا ہوا تھا۔ لکھتے ہیں :-

”..... ہماری اذانت میں بھی تہذیب مغربی دنیاوی

امور میں بالخصوص وہ دنیاوی امور جن میں ذاتی اعتناع ہو اور اپنے عیش و آرام اور ترقی دنیاوی کے باعث ہوں جو

صرف مہذبین مغربی کو مد نظر ہے بہت عمدہ ہے ” -

۷ اگست سنہ ۱۸۸۰ ع کے اردو اخبار میں شکایت کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ زنانہ درجوں کے لئے لیکچری ٹکٹ کلکٹر مقرر ہونی چاہئیں۔ اس پر عمل ہوا تو۔ مگر تجویز کے چوتھائی صدی بعد۔ یکم دسمبر سنہ ۸۰ ع کے اردو اخبار میں آزاد مرحوم کی آب حیات پر مفصل تبصرہ درج ہے۔ اسی ضمن میں - لکھتے ہیں :-

”نہرنگ خیال کے خیالات ابھی پیش نظر تھے کہ پروفیسر آزاد نے ایک اور تازہ طلسم باندھ کر انجمن آراستہ کی - بیچ میں آزاد آب حیات کا پیالہ لئے کھڑے ہیں دور چل رہے ہیں - ایک جلسہ برخواست ہوتا ہے دوسرا جمتا ہے - شعرائے باکمال اردو کے اپنا اپنا کمال دکھاتے ہیں اور آب حیات کا جام پی کر رخصت ہوتے ہیں“ -

”اول یہ کام برسوں کا نہیں ہے - عمروں کا ہے - بلکہ ایک آدمی کی تو عمر کا بھی کام نہیں - بہت سے سن رسیدہ اور صحیحیت یافتہ لوگوں کی کمائی اس میں شامل ہوئی ہوگی - ایسی باتوں کا بہم پہنچانا اور پریشان دانوں کا سمیٹنا کچھ آسان کام نہیں“ -

یہ ذکر کر کے کہ :- ” تعجب ہے کہ مومن خاں صاحب کا حال نہیں لکھا جو کہ شعرائے مندرجہ سے کسی طرح درجے میں کم نہ تھے -“ - بتاتے ہیں کہ ” باوجود ۵۲۰ صفحہ سے زیادہ ضخامت ہے اس کی قیمت ایک روپیہ ہے“ - آج کل ۵۲۲ صفحے بن کر دو روپیہ قیمت ہے -

۱۶ دسمبر سنہ ۸۰ ع کے اخبار میں ’تعلیم نسواں‘ پر ایک مفسون ہے

یہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

” ہندوستان کی حالت پر نظر کر کے بعض اخباروں کی رائے ہے کہ اہل ہند اپنی اپنی بی بیوں کو گھر ہی میں تعلیم دیں اور مشن اسکول کی مسوں کو اپنے یہاں آنے سے روکیں یہ رائے بیشک صحیح اور درست ہے لایکن اہل ہند کو اپنے خاندان کی تعلیم کے واسطے وہ علوم مخصوص کرنے چاہئیں جو فرقہ نسوان کے حق میں مفید ہوں۔“

بنارس گزٹ | ۱۲ جون سنہ ۱۸۸۲ء کے بنارس گزٹ میں ایک مضمون کا عنوان ہے ”کیا تہذیب اسی کو کہتے ہیں“ - لکھتے ہیں: —

” ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں جب کبھی مشرق کی طرف اپنا مقدس قدم بڑھاتی ہیں تو عمرماً یہی حیلۂ شرعی پوش کرتے ہیں کہ ہم پیغمبر تہذیب ہیں - ہمارا مقصود توسیع سلطنت نہیں بلکہ ہم وحشی قوموں کو زیور شائستگی سے آراستہ کرنے کے لیے جاتے ہیں - یہ بیان ان کا جہاں تک صحیح ہو اس سے ہم کو بھگت نہیں لیکن اس قدر ہم ضرور کہیں گے کہ بعض بد تہذیبیاں اس طرف کے ملکوں میں انہیں کے باعث پھیلتی ہیں۔“

۱۰ جولائی سنہ ۸۲ء کے اخبار میں ایجوکیشن کمیشن پر ایک

طویل مضمون ہے —

۲۶ جون سنہ ۸۲ء کے اخبار میں ”شیشہ بنانے کی ترکیب“ پر ایک مفید مضمون ہے - بھٹی کی تصویر اور منسل ہدایتیں ہیں - اسی اشاعت میں ایک مضمون ”یورپ کے معاملات پر ہے - لکھا ہے: —

” آج کل یورپ میں دو ہی مقاموں کی خبروں کی گرم بازاری

ہے - ایک اُٹر لینڈ دوسرے مصر اُٹر لینڈ والوں نے جو شور و فساد مچا رکھا ہے اس میں اب تک کسی نہیں نظر آتی اور ہو کھو نکر قومی اتفاق ہے کہ ٹھٹھا مصر کی حالت اس سے بڑھ کر نازک ہے - خدیو مصر اور درویش پاشا نے دارالسلطنت کو چھوڑ دیا ہے اور اسکندریہ میں موجود ہیں - ہر ایک سلطنت نے جنگی جہاز اسکندریہ کو روانہ کر دیے ہیں تاکہ اس کی رعایا کو جو اسکندریہ میں آباد ہے سوار کر کے وطن پہنچا دے - فرانس اور انگلستان کی حکمت عملی ظاہر ایک ہے لیکن فرانسیسیوں کا کچھ اعتبار نہیں کیونکہ وہ تلخ خو اور ذرا سی بات پر بگڑ کھڑے ہونے والے ہیں - آسٹریا اور جرمنی سلطان کے مددگار ہیں اُدھر یہ ہے اُدھر روس اور جرمنی میں لڑائی کا چرچا ہے —

۱۷ جولائی سنہ ۸۲ کے اخبار میں ”ہندوستان اور ریشم کی کاشت“

پر ایک تہایت مفصل اور عاملانہ مضمون ہے —

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار آفتاب پنجاب | آفتاب پنجاب میں لکھا ہے : —

”جنرل پرنس اف ویلز صاحب جو چار لاکھ کے قرضدار ہیں ان کی طرف سے لارڈ لیسٹیر نے ایک عرضی اس مضمون کی مستقر گلیڈ سٹون صاحب کے ہاں پیش کی کہ پرنس کو اس قرضہ کی صفائی تک ایک لاکھ روپیہ سالانہ زیادہ دیا جائے گلیڈ سٹون صاحب نے اس عرضی کو فرش پر دے پٹکا اور غصے سے کہا کہ قہصرہ ہند ان کو اپنی گروہ سے دینا چاہیں تو دیدیں پر

گورنمنٹ کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ روپیہ کی آگے
ہی ضرورت ہے —

اسی اشاعت میں کتاب 'توبۃ النصوح' پر ریویو درج ہے —

۱۲ فروری سنہ ۱۸۸۱ کی اشاعت میں آزاد مرحوم
مہر نمروز - بجلور | اس پر تھاک استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو تذکرہ

آب حیات کا کیا گیا - اسی ضمن میں فرماتے ہیں :-

” اکثر ذوق و شوق کے وقت تھے کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے
مضامین لکھنے میں از گئے - بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتہ
تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا - وہ
کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر نتیجہ سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر
محنت لی - جاننے والے جانتے ہیں کہ انسان جب تک آپ پختہ
نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا -
پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بلانا - لکھنا اور مٹانا - بدھا ہو کر
بچہ بلنا پڑا - پھرتے چلتے - جاگتے سوتے بچوں ہی کے خیالات میں
رہا - مہینوں نہیں برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے
کھلونے تیار ہوئے —

کیا ملک کی مختلف ٹکست بک کمیٹیاں ان اصولی باتوں پر غور کرنا
مناسب سمجھیں گی جو اوپر کے اقتباس سے اخذ ہوتی ہیں۔ یعنی ابتدائی
مدرسوں کے لئے نصاب کی کتابیں کیونکر بلانی جائیں اور کون اس کام کا
اہل ہے - اسی تحریر میں آزاد مرحوم فرماتے ہیں :-

” خیر میرے پیارے اہل وطن! یہ تمہاری خدمت ہے وہ
تمہارے بچوں کی خدمت تھی - مگر کاش وہ دن جو مہری

عمر کی فصل بہار تھی۔ طبیعت جوان تھی۔ جوش تھکتے تھے۔
مقام میں برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے ان تصنیفات میں خرچ
ہوتے جن سے میرے اہل وطن کی فلاح و اصلاح ہوتی.....
میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں۔ جو وقت نوکری
کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم
سوتا تھا۔ اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیالات پیدا
ہوتے تھے لکھتا جاتا تھا۔ اسی میں سے یہ اوراق پریشاں نکالے
ہیں جو 'آب حیات' کا جام بنا کر تمہاری ضیانت طبع کے
لئے حاضر کئے ہیں۔

آفتاب پنجاب | ۱۱ - مارچ سنہ ۱۸۸۱ کی اشاعت میں لکھتا ہے :-

"گورنمنٹ بمبئی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ دیسی
اخبارات کی تحریرات سے ہرگز بغاوت نہیں پھیلتی۔ البتہ
جب سرکاری افسر رعایا کی کسی تکلیف کو دفع نہیں کرتے
تو اس وقت وہ ملکی ہمدردی سے بڑے جوش کے ساتھ تحریر
کرتے ہیں اور ایسی صورت میں ان کی تحریر سے کارآمد
اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔"

اس اخبار نے ۳۰ - جنوری سنہ ۱۸۸۲ کی اشاعت میں
دیفارمر - لاہور | اعتراض کیا کہ عیسائی قاضیوں (چیپلین) کو ہندوستان

کے خزانے سے تلخوواہ دینا نہیں چاہیے۔ اس نے لکھا :-

"گورنمنٹ کی پالیسی یہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص مذہب کی
وہ حمایت یا اعانت کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ گرجا
گہروں کے لیے جو چیپلین متعصب عیسائی مذہب کی وعظ کرنے

کے لیے مقرر ہوتے ہیں ان کو اس ملک کے روپیہ سے تلخو اہیں دی جائیں۔ یہ گارروائی گورنمنٹ کی انصاف پر مبنی نہیں ہے۔“

اسی اشاعت میں ایک صاحب جن کا نام رحیم بخش ہے صدر بازار ملتان سے ”ایک عجیب بد رسم“ کی مذمت کرتے ہیں اور تملیم یافتوں کو سوشل اصلاح میں کام کرنے کی دعوت دے کر لکھتے ہیں: —

”اہل اسلام کی مستورات محترم میں عشرہ کے دن فصد کھاواتی ہیں۔ اس کے یہ معنی رکھے گئے ہیں کہ ہمارے آقا اور سردار امام (رض) جو اس روز شہید ہوئے ان کی تکلیف میں ہم بھی شریک ہوں..... جس میں ذرا بھی عقل ہوگی وہ اس بات کے قبول کرنے میں حجت نہیں کرے گا کہ یہ رسم بد ہی ہے.....“ —

یہی اخبار ۶ - فروری سنہ ۸۲ کی اشاعت میں ’تیرتہ‘ کے موضوع

پر لکھتا ہے: —

”تیرتہ جاترا میں ہمارے ہندو بھائی بہت روپیہ صرف کرتے ہیں اور تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اگرچہ بعض لوگ صرف تماشے کے لیے جاتے ہیں مگر اکثر لوگ ثواب حاصل کرنے کی ہی غرض سے تیرتہ کو جاتے ہیں.....“ —

خاتمہ پر شو جی کا یہ بچن لکھا ہے: —

”اے پاربتی بے وقوف لوگ، یہ تیرتہ ہے یہ تیرتہ ہے ایسا کہتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں وہ لوگ روحانی تیرتہ کو نہیں جانتے پس ان کی نجات کیونکر ہو“ —

لارڈ لٹن کی حکومت میں جو ورنیکولر پریس ایکٹ ملک میں

جاری ہوا تھا اور جسے لوگ ”گینگنگ ایکٹ“ کہتے تھے لارڈ رین کی گورنمنٹ نے اسے منسوخ کیا۔ اس پر اطمینان اور خوشنودی کے اظہار کے لئے انڈین ایسوسی ایشن کی تحریک سے جو جلسہ ۲۳ - مارچ سنہ ۱۸۸۲ کو باشندگان لاہور کا ہوا تھا اس کی کیفیت ۳ - اپریل سنہ ۸۲ کے ریفارمر میں درج ہے۔ اسی اشاعت میں ایک مضمون ”تہذیب (سویلیزیشن)“ پر ہے جس کا ”راقم لاجپت رائے طالب العلم گورنمنٹ کالج لاہور“ ہے۔ یہ راقم ضرور زندہ جاوید لیڈر لالہ لاجپت رائے ہیں۔ گنجائش کی قلت کی وجہ سے صرف ایک سطر اس میں سے اقتباس کی جاتی ہے جس سے پتہ کے پانو پالے میں دیکھ جاسکتے ہیں۔ وہ سطر یہ ہے : —

”ہمارے تعلیم یافتوں میں یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے علم

و عمل کو ایک نہیں کر سکتے“ —

۲۲ مئی سنہ ۱۸۸۲ کاریفارمر الہ آباد کے ہائی کورٹ کے بلیج پر مستر سید محمود کی تقرری کی خبر شایع کرتا ہے —

۲۶ جون سنہ ۸۲ کاریفارمر لاہور سے دو نئے برچوں کے نکلنے کی خوشخبری سناتا ہے۔ جن میں ایک تو ہندی کا ہفتہ وار اخبار ’ہمتیشی‘ ہے اور دوسرا ماہوار رسالہ ہے جس کا نام ’سوانح عمری‘ ہے۔ پہلے کے مالک اور ایڈیٹر پلڈت ہز مکند شاستری تھے جو اورینٹل کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور دوسرے کے مملشی نٹھو رام آنند برہم سماجی تھے۔

اب لارڈ رین کی قانونی کونسل میں وہ قانونی مسودہ پیش

اخبار عام

ہو گیا تھا جو البرٹ بل کے نام سے مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنارس کے راجہ شو پرشاد جو دو ایک سال بعد انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کے علم برداروں میں شامل ہو گئے اُس وقت اس تاریخی بل کے

حق میں تھے اور سر سید احمد خاں اس کے خلاف ۱۲ مئی سنہ ۱۸۸۳ کا اخبار عام اس پر ایک تیز مضمون لکھتا ہے —

پایا جاتا ہے کہ کونسل میں ان کے وطن کی ہمدردی سے دور رویہ سے غضب ناک ہو کر پبلک نے کلکتہ میں ان کا پتلا جلایا تھا۔ جس کی تفصیل ۵ مئی سنہ ۱۸۸۳ کے اخبار عام میں ہے —

۲ مئی سنہ ۸۳ کے اخبار عام میں آب حیات کے دوسرے اڈیشن کا اشتہار مصنف کی طرف سے دیا گیا ہے۔ اب اس کی قیمت بعض مضامین کی ایزادی کی وجہ سے ایک روپیہ کی جگہ سوا روپیہ ہو گئی۔ ۳ جنوری سنہ ۸۳ کا اخبار عام ناردن سٹیٹ ریلوے پر انٹر مہذیت کے کھلمے کی خبر دیتا ہے —

• جنوری سنہ ۸۳ کے اخبار عام کا افتتاحیہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :-

”موجودہ امتحان سول سروس کے خوفناک قواعد سے اس

امید کو منقطع دیکھو کہ اس امتحان میں دیسی لوگوں

کا کامیاب ہونا ناممکنات سے ہے ہم مجبور ہوتے ہیں کہ گورنمنٹ

سے درخواست کریں کہ یہ امتحان بالکل موقوف کیا جائے“ —

• مارچ سنہ ۸۳ کے اخبار عام میں ایک نظم ہے۔ جس کے چلند

شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

اے ساکنان خطۂ ہندوستان بڑھو آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو

تانا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشان بڑھو

بیٹھے ہو پائو تروڑ کے کیوں کلج غم میں تم دیکھو ذرا نشیب و فراز جہاں بڑھو

ہم لوگ تم میں ہیں کہ جس گاراں میں ہے چلا رہا ہے طوطے ہندوستان بڑھو

۱۴ اپریل کے اخبار عام میں ہندوستانیوں کے والنتور بلنے کی

اجازت پر ایک نوٹ ہے۔ ہوا یہ تھا کہ والنتیئر بلڈے کے لیے ہندوستانی ہونے کی جو روک تھام تھی وہ ہٹا دی گئی۔ مگر ان کی والنتیئر فوجیں الگ قائم نہیں ہوئیں اور صرف یہ ہوا کہ انگریزی والنتیئر فوجوں میں وہ شامل ہوسکتے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قید آزانی کا نتیجہ واقع میں کچھ نہ نکلا۔ انگریز والنتیئروں نے شاید کسی ہندو یا مسلمان کو اپنے میں شامل کیا ہو۔ ہاں پارسی دو چار ضرور شامل کر لیے تھے۔

دہلی اخبار دہلی | ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۸۱ء کا ریختی اخبار مولوی فتح الدین بسمل مالک اخبار پنجاب پنچ عرف اخباروں کا قبلہ گاہ کی وفات پر افسوس کرتا ہے۔

خبر خواہ ہند۔ دہلی | یکم نومبر سنہ ۱۸۸۱ء کا اخبار ایک خبر دیتا ہے۔ امید ہے اس کو آج کل کی فلم بڈانے والی کمپنیاں دلچسپی سے پڑھیں گی۔ وہ یہ ہے :-

”لندن سے ڈاک روانہ ہونے سے ایک آدھ روز پہلے رسل سٹریٹ میں جو ڈروری لین تھیٹر کے عقب میں ہے یہ واقعہ ہوا۔ اس تھیٹر میں بڑے دن کے واسطے تماشوں کا سامان ہو رہا تھا اور اشتہار دیا گیا تھا کہ سو لیدیاں جوان، کم عمر سڈول جسم کی درکار ہیں۔ اشتہار دیکھتے ہی رسل سٹریٹ میں سو کی جگہ پندرہ سو آگئیں اور تمام تھیٹر کو گھیر لیا سڑک پر گازیوں سے راستہ بند تھا۔“

یہی اخبار متیہا برج کلکتہ کی ایک خبر دیتا ہے۔ جہاں اودہ کے

معزول بادشاہ واجد علی شاہ رہا کرتے تھے۔ وہ خبر یہ ہے :-

”ذوالفقار الدولہ پرنالہس دایر ہوئی ہے۔ صاحب عالم بہادر

مستغیث ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ ذوالفقار الدولہ کی ایک جابرانہ

مانعت سے نواب تابار محل کی زندگی میں خلل آیا۔“

۱۹ دسمبر سنہ ۸۱ کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ ۲۴ دسمبر سنہ ۸۱ کو

لاہور میں ایک نمائش کھلی تھی یہ پنجاب کی غالباً پہلی نمائش ہو۔

۲۴ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ کا پرچہ لارڈ رپن کے دوسرے معرکہ الہٰذا

بل یعنی لوکل سلف گورنمنٹ بل کے پاس ہونے کی خبر دیتا ہے۔ یہ معلوم

کر کے آپ محظوظ ہوں گے کہ ایلنگو انڈین اخبار برسوں تک اسے بکاؤ کر

لوکل سلف لکھتے رہے۔

علم کی پیاس یہاں تک اور علمی کتابوں کی کمی اتنی تھی کہ

بلذت دھرم نارائین ہاکسر نے جان ستوارت مل کی پولیٹیکل اکونومی

کا چو ترجمہ اردو میں کیا تھا وہ امرتسر کے سزیر ہلد میں سنہ ۱۸۸۰ ع

میں بہ اقساط چھپتا رہا۔

تبصرہ

اب ہم اپنے قایم کئے ہوئے آخری عہد سے بھی رخصت ہوتے ہیں۔

آپ کو خیال رہے کہ اس عہد کو اب پورے پچاس برس گزرے۔ ہمارے

اس دور کا آخری سال یعنی ۱۸۸۴ ع دو امور کے لیے بہت ممتاز ہے۔

ایک تو یہ کہ اسی سال مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصلیہ نے دہلی

سے ایک اخبار محض صنف نازک کے لئے نکالا۔ جس کا نام ’اخبار النساء‘

تھا۔ اور دوسرے یہ کہ اسی سال ملشی محرم علی چشتی صاحب کے

اخبار رفیق ہلد کا جنم ہوا۔ اس اخبار نے پنجاب کی صحافتی دنیا

میں نئی روح پھونکی۔

۱۔ یہ دور اگرچہ مدت میں اور دوروں سے نصف اور کسی سے اور بھی کم زمانہ کو احاطہ کرتا ہے لیکن اس کی اہمیت کسی سے کم نہیں ترمیم ضابطہ فوجداری - لوکل سلف گورنمنٹ بل - مہاراجہ دلیپ سنگھ کا معاملہ - دہلی کالج کے حق میں اچی ٹیشن - ڈاکٹر لائٹنر وغیرہ کے خلاف اظہار نفرت جلسوں نے ایجوکیشن کمیشن میں مخالفانہ اور انگریزی زبان کی تسلیم کے خلاف شہادت دی تھی - سر سید اور ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک اور اس کی مخالفت - ہندوستانہوں کے خون کے قصاص کا مطالبہ - اٹلانک وائسرائے کی قانونی کونسل میں غہر سرکاری ممبر گورنمنٹ کی پسند سے نامزد ہوتا تھا لیکن ایک خاص ممبر کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ممبر قوم فروش ہے اسے ممبری سے الگ کر کے جس پر پبلک کو اعتماد ہو اسے ممبر بنایا جائے - یہ اور ایسے کئی امور جو تفصیل کے محتاج نہیں ان چند سالوں کے عرصہ میں ایسے پھس آئے جو ملک میں بیداری اور جاننداری کا بین ثبوت ہیں - بات یہ بھی ہے کہ پریس کا وہ گل گوٹھو قانون بھی منسوخ ہو چکا تھا - لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ کانگریس ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی - اس کا جلم سنہ ۱۸۸۵ء میں ہو گا - سیاسی بیداری کے ساتھ لوگوں میں سوشل اصلاح اور معاشرت کے دوسرے شعبوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی چیٹنگ بھی شروع ہو گئی تھی - یہ سب کچھ تو تھا لیکن ملیات کے لوٹ سے اردو صحافت کا دامن اب تک بالکل پاک رہا - اسی سلسلے میں ایک امر کا واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے - وہ یہ کہ جذبات چکبست مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا (ان کے مضامین کا مجموعہ چھپ گیا ہے) کہ سوائے لارنس گزٹ کے پرانے اردو اخبار سیاسی معاملات سے منہ نہیں

دکھتے تھے - مرحوم کی نظر تلقید اور ذوق تحقیق کو تسلیم کرتے ہوئے
محبوب افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معاملہ اس نے بالکل برعکس ہے -
لارنس گزٹ کی کئی جلدیں مہرے ہاں موجود ہیں مگر ان میں کہیں
بھی سیاسی دلچسپی کا کوئی مضمون نہیں ملتا برخلاف اس کے اور اخبار جو دلچسپی
سیاسی معاملوں میں لیا کرتے تھے اس کے نمونے آپ ابھی دیکھ چکے ہیں -
۲ - زبان کے بارے میں اودہ اخبار اور اکمل الاخبار سب سے آگے پائے
گئے ان میں بھی اودہ اخبار کو فوقیت حاصل ہے - انشا سے فارسی اسلوب
اور جملے کے ارکان کی ترتیب اب قریب قریب غائب کے تھی - اور اردو
نے اردو کا خانہ ساز جامہ پہنا تھا - ہاں انگریزی کے الفاظ اس چار
پانچ برس کے دور میں بہت دخل پائے - جیسے :- اڈیٹوریل - پولیٹیکل
ایٹما سنٹر - پسمسٹ - آپٹیمسٹ - وغیرہ - قلمی کتابیں جنہیں
آج کل قاموسی نام 'مخطوطات' دیا جاتا ہے اس دور میں 'دستی'
کتابوں کے نام سے پکاری جاتی تھیں - قصہ مختصر صحافت کی زبان
منہجی لگی تھی - اودہ اخبار کا ایک جملہ دیکھئے اور آج کل کی
اخباری زبان کا اُس سے مقابلہ کیجئے لکھا ہے :- "دہلی کالج جیسے نام آور
کے ثوت جانے سے دہلی کے باشندوں کے دل ثوت گئے - ان کی آنکھیں دہلی
کالج کو دھونڈ رہی ہیں" صدف نازک کی تعلیم و تربیت اور ان کے
لئے خاص اخبار کا اہتمام بھی اس عہد کی بالغ نظری کا ثبوت ہے -

۳ - اہل میں بھی قدرے اصلاح ہوئی - قلمی عموماً استعمال ہونے
لگے - اقتباس کے لئے واوین بھی مستعمل ہوئے - مگر اول لفظ کے الف
مفوم کے ساتھ 'واو' کا پن چھلا اور 'پہنچنا' میں واو کی
ایزادی وغیرہ چیزیں قائم رہیں - پائے آخر لفظ کا امتیاز ابھی تک

قائم نہیں ہو سکا —

اس عہد کے اخباروں میں اشتہاروں کی تعداد اور نوعیت میں بہت ترقی ہوئی۔ ہالوی صاحب کا مرہم اور گولیاں تو اس بارے میں اولہت کا امتیاز رکھتی ہیں اب گریمالت کمپنی کا سرپ آف ہائی پوسٹ آف لایم بھی اشتہاری کالموں میں داخل ہو گیا۔ ان دو تین دواؤں کے سوا بدیشی چیزوں کے اشتہار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ہاں دیسی صنعت و حرفت کی چیزوں کے اشتہاروں کی تعداد ترقی پر تھی۔ اور ایک صوبے کی چیزوں کے اشتہار دوسرے صوبوں کے اخباروں میں نکلنے لگے تھے۔ ایک بات اور نوٹ کے قابل ہے۔ اب تک بعض گھٹیا اخباروں کی چلندے کی شرح میں بہ اعتبار خریداروں کے جو فرق و امتیاز تھا وہ اب بھی جاری رہا۔ مثلاً خیر خواہ ہند دہلی کی قیمت ’نوابان والا‘ شان و راجاں بلند مکان و سرکار انگلشیہ کے لئے پیشگی سالانہ ۳۰ روپے کے لئے ۱۵ روپے۔ ملازم آدمیوں سے بہ حساب تذخواہ اگر پچاس روپیہ ہو چار آنہ ماہوار اور جو صاحب کم مقدور ہوں وہ صرف دو روپیہ پیشگی سالانہ اور محصول ڈاک دے دیا کریں۔ اس میں بہت گڑبڑ ہے۔ اسی حیثیت کے دوسرے اخباروں نے صرف تین نرخ رکھے ہوئے تھے یعنی گورنمنٹ اور والیان ریاست۔ دوسرا و معزین اور عام پبلک کے لئے چلندے کا یہ امتیاز کوہ نور۔ اودہ اخبار اور اخبار ہام جیسے اخباروں نے نہیں رکھا تھا۔ ان کا چلندہ ہر ایک کے لئے یکساں تھا۔

خاتمہ

۱۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ خود ہی باندھے لئے

اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں سنہ ۱۸۹۶ ع کے پچیس اخبار کی ایک

اشاعت کا منسل ذکر کرتا - سر دست صرف اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ
ملشی محبوب عالم مرحوم کے مشہور پیسہ اخبار کا ۷ - نومبر سنہ ۱۸۹۹
کا برجہ ایک خاص اور تاریخی نمبر تھا - اس لئے کہ اس کے تمام
ملدراجات نظم و نثر خواتین کے قلم سے نکلے ہوئے تھے -

پوشتر اس سے کہ میں آپ سے رخصت ہوں چند اعداد و شمار کا
پیش کرنا منظور ہے جو سرکاری ریپورٹوں وغیرہ سے ماخوذ ہیں - سرکاری
کافذات سے صرف صوبہ پنجاب کے اردو اخباروں سے متعلق یہ دریافت ہوا
ہے کہ ان کی مجموعی اشاعت سنہ ۱۹۱۷ ع میں دو لاکھ چھیالیس ہزار -
سنہ ۱۹۱۸ ع میں تین لاکھ بیس ہزار - سنہ ۱۹۱۹ ع میں تین لاکھ بیالیس
ہزار - سنہ ۱۹۲۰ ع میں تین لاکھ اٹھاون ہزار اور پچھلے سال یعنی سنہ
۱۹۳۳ ع میں چھ لاکھ کے قریب یعنی پانچ لاکھ چورائے ہزار تھی -
حال میں جو اعداد پنجاب کی قانونی کونسل میں بتائے گئے وہ صرف
چند مشہور روزانہ اخباروں سے تعلق رکھتے ہیں - اس فہرست میں اور
زبانوں کے بھی اخبار شامل ہیں جس سے بالمقابل موازنہ خوب ہوسکے گا -
پنجاب لجیس لہگو کونسل کے اجلاس میں جو ۲۴ - اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ کو
لاہور میں ہوا فنانس ممبر نے ایک سوال کے جواب میں پنجاب کے بڑے
روزناموں کی اشاعت کے یہ اعداد پیش کئے :- (۱) تریبیوں پذدرہ ہزار -
(۲) سول ایلڈ ملہتری گزٹ بارہ ہزار - (۳) دلی ہرلڈ پانچ ہزار -
(۴) ایسٹرن ٹائمز ایک ہزار تین سو چھاس کہ آپ جانتے ہیں یہ سب
اخبار انگریزی کے ہیں - (۵) ہندی ملاب پانچ ہزار - (۶) اکالی پتوگا
دو ہزار تین سو - اب اردو کے اخبار شروع ہوتے ہیں - (۱) پرتاب
گہارہ ہزار دو سو پچیس - (۲) ملاب گہارہ ہزار دو سو پچیس - (۳)

بلدے ماترم تین ہزار - (۴) ویر بھارت دو ہزار پانچ سو - (۵) انقلاب
تین ہزار چار سو پچھتر - (۶) زمیندار تین ہزار دو سو اسی - (۷)
سیاست ایک ہزار —

بہر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ اُردو اخباروں کی تعداد اور
اشاعت روز بروز بڑھ رہی ہے —

یہ بتانا آپ کو متعجب کرے گا کہ پنجاب میں انگریزی صحافت کے
بانی بھی اہل اُردو تھے۔ انگریزی اخبار لاہور کرائیکل دہلی کے متعدد عظیم
نے سنہ ۱۸۳۹ ع میں لاہور سے جاری کیا۔ یہ بزرگ پنجاب کے مشہور مورخ
سہد محمد لطیف کے والد تھے۔ لاہور کرائیکل پنجاب کا پہلا انگریزی اخبار
تھا۔ لاہور کرائیکل نام اور ملکیت بدلتے بدلتے اس وقت آپ کے لاہور
کے سول ایلتڈ ملٹیپری گزٹ کی شکل میں موجود ہے۔ یہ امر واقعہ بھی
ہر مخلص مزاج کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اہالی اُردو اور دیسی زبانوں
کے حاسد یا دشمن ہرگز نہ تھے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجابی زبان
کا سب سے پہلا اخبار بھی انھیں بزرگ متعدد عظیم موصوف نے لاہور سے
سنہ ۱۸۵۶ ع میں نکالا۔ اس کا نام بھی 'پنجابی' تھا۔ یہ اخبار پنجابی
زبان میں اور گور سکھی اور پہلو بہ پہلو فارسی حروف میں چھپتا تھا
اور سنہ ۱۸۹۰ ع تک زندہ رہا —

ایک بات اور کہنی ہے اس سے پہلے کہ میں ختم کروں۔ وہ یہ کہ
آج کل ہمارے انگریزی خواں ارباب وطن مغرب کی پیروی میں ہر موضوع
کا بالمقابل مطالعہ اور موازنہ طلب کرتے ہیں۔ اس لکچر میں اس طرح
کی کمپیئریتو سٹڈی کے نتیجے پیش کرنا غیر ممکن ہے۔ لیکن میں نے پہلے
ہی اس کا کسی قدر خیال رکھا ہے۔ اُردو پریس کے بھان کے ساتھ اور

ورنیکولر زبانوں کے اخباروں کے کوائف پیش کرنا تو یہاں نہایت دشوار ہے لیکن یہ بتایا جاسکتا ہے کہ جہاں سے ہندوستان کا سب سے پہلا اخبار نکلا تھا وہاں یعنی کاکتہ میں بلکالی پریس کا کپ جنم ہوا - تحقیق سے پایا جاتا ہے کہ بلکال میں دیسی زبان کے کئی اخبار انیسویں صدی کے اول ربع میں نکلے ان کے نام اور تاریخ اجرا پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

۱ - سما چار درپن - ۲۳ - مئی سنہ ۱۸۱۸ ع - بعض محققوں کی رائے ہے کہ یہ اخبار سنہ ۱۸۲۱ ع میں جاری ہوا تھا -

۲ - برہمن سبدهی - ستمبر سنہ ۱۹۲۱ ع -

۳ - سمباد کومڈی - ۴ - دسمبر سنہ ۱۹۲۱ ع - یہ اخبار راجہ رام موہن رائے نے 'رسم سٹی' کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کو نکالا تھا -

۴ - سما چار چندرکا سنہ ۱۹۲۱ ع اسے بابو بھبانی چرن بلدیو پادھیایہ نے نکالا تھا -

۵ - سمباد تمونا شک سنہ ۱۸۲۳ ع -

اس اجمال سے یہ امر واضح ہوگا کہ ہمارا اُردو پریس بلکال کے بلکالی پریس سے بہت پیچھے نہیں رہا - بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ بلکال میں دیسی زبان کے پریس کا ظہور سنہ ۱۸۲۱ ع یا سنہ ۱۸۱۸ ع سے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا - کہوں کہ اہل بلکال سنہ ۱۷۸۱ ع سے پریس کی ہستی سے واقف ہو چکے تھے -

اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں اور ایک بات جو شروع میں عرض کی تھی اب پھر عرض کرتا ہوں کہ جو واقفیت قدیم اور اب سے نصف صدی سے بیشتر کی صحافت سے متعلق آپ کی خدمت میں پیش کی گئی اس کی نسبت مکمل ہونے کا شریک ادعا نہیں - ہاں اقتباس

کی صحت کا میں ذمہ دار ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ لٹریچر کے اس اہم شعبہ کی توادیم کی تکمیل کا کام مجھ سے زیادہ اہل اور زیادہ وسائل تلاش رکھنے والے حضرات اپنے ذمہ لیں یا اس کام میں مہری اعانت فرمائیں تاکہ یہ کام پورا ہو جائے۔ ورنہ یہ تو سنکتے ہی آئے ہیں:-

کار دنیا کسے تمام نہ کر د



ضرب الامثال اور ان کے ماخذ

از

جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

(۲)

دودہ کا دودہ پانی کا پانی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی مقدمہ میں حاکم نہایت مصلفانہ فیصلہ کرے۔ یا کسی معاملہ میں خود ہی قدرت کی طرف سے دو ٹوک فیصلہ ہو جائے کہتے ہیں کہ یہ مثل اس طرح مشہور ہوئی کہ ایک حلوائی دودہ میں پورا آدھا پانی ملا کر فروخت کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح دودہ بیچ کر اس نے دوسو روپے جمع کئے۔ جب دوسو ہو گئے تو اس نے ان کو ایک ہمیانی میں رکھا اور اپنی کمر سے باندھ کر وطن کو روانہ ہو گیا۔ راستہ میں دریا پڑتا تھا وہ کنارے پر کچھہ دیو کے لئے تھو گیا۔ ہمیانی کمر سے کھول کر نیچے زمین پر رکھ دی اور خود دریا پر ہاتھ مٹھ دے اور پانی پیئے لگا۔ اس ساری کارروائی کو ایک بلندر درخت پر بیٹھا ہوا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ جب حلوائی پانی پیئے کو ذرا نیچے جھکا بلندر جھٹ درخت سے اتر کر چپکے چپکے آیا اور ہمیانی اُٹھا درخت پر جا بیٹھا۔ حلوائی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بلندر ہمیانی اُٹھائے لئے جا رہا

تھا۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑا مگر بے سود۔ اب ستم ظریفی سامنے۔ بلندر نے درخت پر اطمینان سے بیٹھ کر ہمدانی کہولی۔ اور اس میں سے ایک روپیہ نکالا اور تھوڑی دیر تک اُسے دیکھنے کے بعد دریا میں پھینک دیا۔ حلوائی نے بیتاب ہو کر کہا۔ ”ہے ہ ظالم! کہا غضب کرتا ہے۔ مہری سالہا سال کی گاڑھی کماٹی کو یوں پانی کے راستے بھاتا ہے۔ بلندر نے جہت دوسرا روپیہ نکالا اور اسے تاک کر حلوائی کے سر پر مارا۔ اگرچہ چوت تولگی۔ لیکن اس بات کی امید بندھ گئی کہ اب بلندر سارے روپے خشکی ہی پر پھینکے گا۔ بلندر نے اب تیسرا روپیہ نکالا۔ اور دریا میں ڈال دیا۔ پھر چوتھا نکالا اور خشکی میں پھینک دیا اور اس طرح آدھے روپے اُس نے دریا میں پھینک دیے اور آدھے خشکی پر۔ اُس وقت حلوائی نے کہا ”میں سمجھ گیا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ جتنے دودھ کے دام تھے وہ مہرے پاس آگئے۔ جتنی پانی کی قیمت تھی وہ پانی میں مل گئی۔“

دھم دھم ہیچ نہ غم، مرے سو ہم

یہ مثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے۔ جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ سب سے زیادہ مصیبت اور آفت میں ہم ہی ہیں۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ عوام میں مشہور ہے کہ ایک بلخا اتفاق سے سفر پروانہ ہوا۔ راستے میں اسے پیاس لگی۔ دوری لگا اس کے پاس تھی۔ تھوڑی دور پر ایک کنواں مل گیا۔ اس نے دوری کو کھول لیا کوئیں میں ڈال بھرنی چاہی۔ ابھی پانی سے بھری ہوئی لٹیا کنویں میں آدھے ہی راستے پر تھی کہ دوری میں سے نکل کنویں میں جا پڑی۔ بلخے نے سوچا یہ تو کچھ نہ ہوا۔ مگرت میں لٹیا ہی کا نقصان ہوا۔ یہ نقصان اسی

طرح پورا ہو سکتا تھا کہ کدوئیں میں اتر کر لٹیا کو لایا جائے۔ چنانچہ لٹیا لانے کے لئے بنیا کدوئیں میں اتر پانی تک پہنچا ہی تھا کہ دیکھا ایک کالا سانپ عین پاؤں کے نیچے بیٹھا پھنکادیں مار رہا تھا بنیہ کے اوسان جاتے رہے۔ افتان و خیزاں واپس لوٹا۔ ابھی تھوڑی دور اوپر چڑھا تھا۔ کہا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا شیر کدوئیں پر کھڑا دھم دھم کر رہا ہے۔ نیچے نظر کی تو سانپ کو یہ کہتے سنا کہ ہوج نہ غم (ہمیں کیا پروا ہے۔ شیر تجھے پھاڑے گا) اس وقت بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ”مرے سو ہم“ یعنی ہمارے قضا آگئی۔ نیچے اترتا ہے تو سانپ تیسے گا۔ اوپر جاتے ہیں تو شیر کھائے گا۔ جب ہی سے یہ مثل بولی جانے لگی۔

دیکھہ سُرْدُوں کی پھیروی، یہ ماں میری یا تیری

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں۔ جب کوئی آدمی اپنے خیال میں کسی شخص کو دھوکا دینے اور الو بلانے کی کوشش کرے مگر وہ شخص اس آدمی سے بھی زیادہ چالبا ز ثابت ہو۔ اس کی ابتدا کے متعلق یہ مزیدار قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک مہیاں بیوی میں یہ بحث ہوئی کہ دونوں میں سے کون زیادہ ہشیار ہے عورت کہتی تھی میں اور مرد کہتا تھا نہیں میں۔ آخر یہ طے پایا کہ دونوں ایک دوسرے کا امتحان لیں۔ دونوں میں سے جو دوسرے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے وہی زیادہ ہوشیار مانا جائے۔ خیر بات گئی گزاری ہوئی۔ اور دونوں فکر میں رہنے لگے کہ موقع پڑے تو دوسرے کو دھوکہ دیں۔ بہت دنوں کے بعد ایک دن جب کہ عورت نے خیال کیا کہ اب خاوند اُس دن کی شرط کو بالکل بھول گیا ہوگا۔ اُس نے پلنگ پر اہٹ کر چلانا اور شور مچانا شروع کیا۔ خاوند کھرہی

میں تھا۔ وہ دروازہ ہوا آیا اور کہنے لگا کیوں کیا ہوا؟ عورت نے کہا اس وقت بیٹھے بیٹھے سر پھٹا جا رہا ہے۔ جلدی کچھہ دروازہ کرو۔ ورنہ میں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ خاوند بیچارہ دروازہ دروازہ گیا۔ حکیم کو بلا کر لایا۔ دوا پلائی۔ مگر کچھہ افاتہ نہ ہوا جب پے در پے بہت سی دوائیں استعمال کرنے کے بعد بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی تو بیوی نے درد سے کراہتے ہوئے مہمان سے کہا کہ مجھے ایک سیانے نے سر کے درد کا ایک نہایت مجرب عمل بتلایا تھا اگر تم وہ کر سکو تو یقین ہے کہ مجھے فوراً شفا ہو جائے گی۔ خاوند نے کہا۔ میں ضرور کروں گا۔ بتلاؤ وہ کس طرح ہے؟ بیوی نے کہا اُس نے بتلایا تھا کہ اپنی ساس کے سر کے بالوں کی ایک لت اگر تو اپنے تکیے کے نیچے رکھ دے گی تو کبھی سر کا درد نہیں ہوگا۔ اور اگر درد ہو رہا ہوگا تو فوراً دفع ہو جائے گا۔ میں نے اب تک تم سے اس لئے نہیں کہا کہ شاید تم برا مانو! اور مجھے پر ناراض ہو۔ مرد نے جواب دیا۔ واہ! تم نے اب تک مجھے کیوں نہ بتایا؟ تم ایک لت کہتی ہو میں سارے سر کے بال اُتروا کر لے آتا ہوں۔ یہ کہتے ہی وہ بھاگا بھاگا کمال ہوشیاری کے ساتھ بجائے بیوی کی ساس یعنی اپنی ماں کے اپنی ساس یعنی بیوی کی والدہ کے پاس پہنچا اور ہانپتا ہوا کہنے لگا۔ تمہاری بیٹی کے اس وقت سر میں نہایت شدید درد ہو رہا ہے۔ کسی نے اُسے یہ بتایا ہے کہ تمہارے سر کے بال اُس کے تکیے کے نیچے رکھ جائیں تو فوراً آرام ہو جائے گا۔ ماں بیچارہ مامتا کی ماری حواس بافتہ ہو گئی اور اُس نے فوراً اپنے سر کے سارے بال اُتروا داماد کے حوالے کئے خاوند صاحب اُن کو لئے ہوئے خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے لو میں بال لے آیا ہوں۔ بالوں کو دیکھتے ہی بیوی صاحبہ کھل کھل کر ہنس پڑیں

اور کہنے لگیں - دیکھی تم نے عورتوں کی چالاکی - کس ہوشیاری کے ساتھ میں نے تمہارے ہی ہاتھوں سے تمہاری ماں کے بال اُتروا لئے اور تمہیں شہہ بھی نہ ہوا کہ کیا چالاک کی جا رہی ہے - مرد مسکرایا اور کہنے لگا اچھا ذرا تھرو میں ابھی آتا ہوں - تھوڑی دیر میں وہ پھر واپس آیا اور اُس کے ساتھ دو عورتیں تھیں - ایک ساس اور ایک والدہ اس نے دونوں کو لاکر بیوی کے سامنے کھڑا کر دیا - اور ہنس کر کہنے لگا - ”دیکھہ مردوں کی پھیری (یعنی چالاک کی) یہ ماں مہری یا تھری“ - جب عورت نے دیکھا کہ بجائے مہری ساس کے مہری ماں کے سر کے بال سارے اڑے ہوئے ہیں تو وہ نہایت خفیف اور خجل ہوئی - اس نے مرد کو دھوکا دینا چاہا تھا - مرد بھانپ گیا اور اس نے عورت کو ایسا چکمہ دیا کہ ساری عمر یاد کرتی ہوگی -

دیکھئے اونٹ کس کروت بیٹھتا ہے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں - جب کسی بات کا انجام معلوم نہ ہو اور امید و بیم کی سی حالت ہو - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کسہار اور ایک سبزی فروش نے شراکت میں ایک اونٹ کرایہ پر لیا - اور اس کے ایک طرف ترکاری اور دوسری طرف مٹی کے برتن باندھ کر دونوں شہر سے اپنے گاؤں کو چل پوے راستہ میں اونٹ گردن پیہر کر ترکاری کھاتا جاتا تھا - یہ دیکھہ کر کسہار سبزی فروش کا مذاق اڑانے لگا - سبزی فروش نے کہا ”میرے نقصان پر کیا ہنسنا ہے - ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ ”اونٹ کس کروت بیٹھتا ہے“ - اس کے بعد پتہ لکھکا کہ نقصان کس کا زیادہ ہوا ؟ اتفاق کی بات کہ منزل مقصود

پر پہنچ کر اونٹ برتنوں کی طرف بیٹھا - جس کی وجہ سے سارے برتن چکنا چور ہو گئے - اب تو کنبڑے کی بن آئی اور کہنے لگا کہ ”میں نہ کہتا تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کروت بیٹھ - اب میری تو تھوڑی سی ترکاری اونٹ نے کھائی اور تیرے سارے مال کا صفایا ہو گیا تب سے یہ مثل بولی جانے لگی —

تو با بنس کبیر کا جو جاے پوت کھال

رام رام دھن بیچ کے لائے چار ہنواں

یہ مثل ایسے موقع پر ہواتے ہیں جہاں اولاد کے متعلق یہ بتانا مقصود ہو کہ وہ نہایت نالائق اور ناخلف ہے - مثل کا سلیس ترجمہ یہ ہے کہ کبیر کی نسل ہلاک ہو گئی جس میں کمال جیسا لڑکا پیدا ہوا - جس نے عاقبت کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کیا - ہذا وال کے معنی گدھے یا خچر کے ہیں - اس کا قصہ یوں مشہور ہے کہ کبیر بھگت کے زمانہ میں کسی راجہ کا لڑکا اتنا شدید بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے - ہر چند علاج کئے مگر مرض بڑھتا ہی گیا - جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو ایک دن کسی شخص نے راجہ کو صلاح دی کہ کبیر کا لڑکا شاہ کمال بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے - اگر راجہ اس کے پاس جائے اور اپنے لڑکے کے لئے اُس سے صحت کی دعا کرائے تو یقین ہے کہ اس کی دعا سے لڑکے کو تندرستی حاصل ہوگی - راجہ مصیبت کا مارا شاہ کمال کے پاس پہنچا - اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شاہ کمال کی دعا سے راجہ کے لڑکے کو صحت ہو گئی - اس پر راجہ نے بطور اظہار شکر گذاری کے بہت سی اشرفیاں چار خچروں پر لدوا کر شاہ کمال کے حضور میں بطور نذر بھیجیں - شاہ کمال نے اُن کو قبول

کر لیا ۔ اور اُن کا قہیر اپنے مکان کے صحن میں لگوا دیا ۔ اس وقت کھر میں کبیر بھگت موجود نہیں تھے ۔ کہیں باہر گئے ہوئے تھے ۔ واپس آئے تو دیکھا کہ انگنائی میں اشرفیوں کا قہیر لگا ہوا ہے ۔ بڑا تعجب ہوا کہ یہ اشرفیاں کہاں سے آئیں ۔ بیٹے نے سارا واقعہ باپ کی خدمت میں عرض کیا ۔ یہ سن کر کبیر بیٹے پر بہت ناراض ہوئے کہ تو نے یہ اشرفیاں لے کر اپنی خود داری اور استغنا کو بٹہ لگایا ۔ اور دعا کے بدلے میں یہ اشرفیاں کیوں وصول کیں ۔ اُس وقت انہوں نے یہ دوہا پڑھا ۔ جو بعد میں زبان زد عوام ہو گیا ۔ اور بعد میں عام طور پر ایسے شخص کے متعلق بولا جانے لگا جو اپنی نازیبا حرکتوں سے اپنے آباؤ اجداد کو بد نام کرے ۔

توم کا تیر خدا جھوٹ کرے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی مشکل میں پھنس جائے اور وہ اپنی مصیبت کو عام لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہو ۔ یا کوئی شخص کسی بالکل ظاہر بات کو چھپانا چاہے اُس وقت بولتے ہیں ۔ اس کا قصہ اس طرح مشہور ہے کہ ایک دفعہ اتفاقاً کسی قوم کی دان میں ایک تیر لگ گیا ۔ اور زخم سے خون بہنے لگا ۔ لوگوں نے دیکھا تو ہمدردی کا اظہار کرنے لگے ۔ مگر قوم زخم پونچھتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا ۔ خدا نہ کرے کہ میرے تیر لگے ۔ خدا کرے کہ لوگوں کا یہ کہنا جھوٹ ہو جائے کہ میرے تیر لگا ۔ تماشائیوں نے سنا تو ہنسنے لگے کہ بے وقوف جب تیر لگ چکا تو اب کہا جھوٹ ہو گا ۔ اُس وقت سے یہ مثل بولنے لگے ۔

رام رام دونیاں گلے مل چو نیاں

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی عیار اور چالاک شخص بہ نسبت غیروں کے اپنے دوستوں اور واقفکاروں کو کسی خرید و فروخت کے معاملہ میں زیادہ لوٹے - اردوں سے اگر کسی چیز پر مثلاً چار آنے نفع لیتا ہو تو اپنے دوست سے آٹھ آنے نفع وصول کرے -

اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بھئی مجھے بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے - کوئی ایسی دوکان بتلاؤ جہاں سے چیز سستی بھی ملے اور عمدہ بھی - دوست نے جواب دیا - فلاں دوکاندار نہایت دیانتدار اور ایماندار ہے - اُس نے اپنا یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ گاہک کے ہاتھ ہمیشہ اچھی اور عمدہ چیز بیچے گا اور نفع نہایت ہی کم لیگا - یعنی صرف ایک پیسہ فی روپیہ - آج تک کوئی گاہک اُس کے پاس اُس کی چیز کی شکایت لے کر نہیں آیا - اُس کے ہاں سے بہتر آپ کو اس شہر میں اور کہیں چیز نہیں مل سکیگی - میرا پرانا واقف ہے اور میرا بہت لحاظ کرتا ہے - یقین ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے میری خاطر سے آپ کو چیز اور بھی سستی دے دیدیگا - چلئے اُس کے ہاں چلیں اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو وہاں سے لے لیں - چنانچہ دونوں دوست اُس کی دوکان پر پہنچے - اور بہت سا سودا خریدا - جب لے کر گھر آئے اور بیوی نے ہر ایک چیز کے دام پوچھے تو چونکہ عورتوں کو عام طور پر عام استعمالی اشیاء کے بہار معلوم دیتے ہیں - اس لئے اُس نے کہا کہ یہ چیزیں تو تم بہت مہنگی اُتھا لائے؟ شوہر نے بازار میں جاکر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ دوسرے دوکاندار دونی فی روپیہ

منافع لیتے ہیں مگر اُس ”دیانتدار“ دوکاندار نے فی روپیہ چوٹی کے حساب سے منافع لیا۔ جس میں دلال صاحب کا جو ساتھ تھے پورا نصف کا ساچھا تھا۔ تب اُس شخص نے مذکورہ بالا جملہ کہا اور اُس وقت سے یہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔

دیوڑی کے پھیر میں آگئے

یعنی کسی بڑی مصیبت اور چکر میں بھلس گئے۔ مقدمہ بازی میں گرفتار ہو گئے یا قرض کی آفت میں مبتلا ہو گئے۔ یا کوئی اور ایسی مشکل آپڑی کہ دن رات بھیچھنی ور پریشانی میں بسر ہونے لگی۔ اس مثل کی ابتدا یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ چلد نوجوان اور بے فکرے دوست بیٹھے ہوئے خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ جازوں کے دن تھے۔ ایک دوست نے کہا۔ بھئی! ہم تو اُس کو بہادر جانیں جو اس طرح دیوڑیاں کھائے کہ پہلے ایک پھر دو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر مرتبہ دو گنی کرتا جائے۔ یہاں تک کہ دس دفعہ کھائے۔ دوستوں میں سے ایک جو خیر سے ذرا زیادہ عقل مند واقع ہوئے تھے چہت بول اٹھے کہ ”واہ یہ کیا مشکل ہے۔ لاؤ میں کھاتا ہوں“ چنانچہ شرط بدی گئی اور دیوڑیاں آگئیں۔ اُن صاحب نے شروع میں تو بظاہر اس کو بہت ہی آسان کام سمجھا تھا اور خیال کیا تھا کہ صرف چند دیوڑیاں کھانی پڑیں گی۔ اور شرط منت میں چہت جاوے گا۔ مگر جب دیوڑیاں کھانے بیٹھے اور حساب کیا کہ اگر ہر مرتبہ دیوڑیوں کو دو گنا کھا جائے تو دس مرتبہ مہیں کتنی دیوڑیاں ہوں گی۔ تو معلوم ہوا کہ اس طرح ایک ہزار اور تین سو دیوڑیاں کھانی پڑیں گی۔ اب تو یہ صاحب بڑے چکراے مگر کر کیا سکتے تھے۔ شرط کر چکے تھے۔

چند نچہ بادل نا خواستہ دیوڑیاں کھانی شروع کیں۔ مگر آخر کہاں تک ۱۰۲۳ دیوڑیاں کھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کھاتے کھاتے منہ دیکھنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں یہ نوبت ہو گئی کہ منہ چلتا ہی نہ تھا۔ اب دوستوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ اور کہنے لگے دیکھا کھا خوب پھلے۔ آخر دیوڑی کے پھر میں آگئے نہ۔ دوست مذاق اڑا رہے تھے اور ان صاحب کا نہ پوچھو کہ کتنا پتلا حال دیوڑیاں کھاتے کھاتے ہو گیا تھا۔ آخر کوشط ہار گئے۔ ان سے دیوڑیاں نہ کھائی گئیں اور تھک کر فرش پر لہت گئے۔ اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔



ساتھہ گاؤں بکری چر گئی

جب کسی بڑے نقصان کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت علی العوم یہ مثل بولتے ہیں۔ اس کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ کوئی بادشاہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ وہاں اتفاق سے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اکیلا رہ گیا۔ بھوک پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر ایک کسان کے چھوٹے میں چلا گیا۔ اور اُس سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ۔ میں مسافر ہوں اور سخت بھوکا ہوں۔ کسان نے اُس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ فوراً پانی لایا۔ بادشاہ کا ہاتھ مدہ دھلایا پھر لسی کا ایک پھالہ بھر کر دیا۔ پھر روٹی اور چنے کا ساگ لایا۔ اور بادشاہ کے آگے رکھ دیا۔ بادشاہ بھوکا تو تھا ہی ایسا توت کر روٹی پر گرا کہ تھوڑی سی دیر میں ساری روٹیاں ختم ہو گئیں۔ اُس وقت وہ روٹیاں اُس کو اعلیٰ درجہ کے لذیذ کھانوں سے بھی زیادہ مزے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہ کسان کی خاطر مدارات اور مہمانداری

سے نہایت خوش ہوا اور کہنے لگا ”دراصل میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ اور تمہارے اس سلوک سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوئی ہے۔ تمہارے اس چہوتے سے مکان میں میں نے بہت آرام پایا ہے۔ میں تمہیں ساتھ گاؤں جاگیر میں دیتا ہوں۔ تاکہ تم ہر مسافر کی اچھی طرح خاطر مدارات کر سکو۔“ چونکہ وہاں سند لکھنے کے لیے کاغذ نہ مل سکا۔ لہذا بادشاہ نے ایک پیپل کے پتے پر کسان کو ساتھ گاؤں کی سند لکھ کر دیدی اور چلا گیا۔

اب اتفاق یہ ہوا کہ کسان کی بکری جو شام کو جھونپڑے میں آئی تو وہ پتہ رکھا ہوا تھا۔ اسے کیا پتہ کہ یہ پتہ اس وقت کتنی قیمتی دستاویز ہے۔ وہ اسے اُٹھا اور کہا گئی۔ کسان کی نظر بکری پر اس وقت پڑی جب آدھا پتہ بکری کے منہ کے اندر اور آدھا باہر تھا۔ یہ دیکھ کر کسان کی جان ہی تو نکل گئی۔ وہ دوڑا کہ بکری کے منہ میں ہاتھ ڈال کر پتے کو نکال لے۔ مگر اتنے دوڑتا رہا اتنے بکری پتے کو نکل گئی۔ اب سوائے افسوس کے کیا رکھا تھا۔ مجبوراً کسان دوتا پیٹتا دارالخلافتہ میں پہنچا۔ مشکل سے بادشاہ سلامت تک رسائی ہوئی۔ اس بیچارے نے اپنی مصیبت کی کہانی دو دو کر بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ سن کر ہلسا اور کہنے لگا ”تو یوں کہو کہ ساتھ گاؤں بکری چر گئی“ یہ کہہ کر دوسری دستاویز اسے لکھدی اور وہ خوش خوش گھر واپس چلا گیا۔



سارا گھر جل گیا تب چوریاں بوجھیں

یہ مثل ایسے موقع پر کہتے ہیں جب کہیں بہت کچھ نقصان ہو چکے کے بعد اپنی قدر دانی ہو۔ نام و نمود اور دکھاوے کی خواہش

میں اپنا نقصان کر لینے کے موقع پر بھی یہ مثل بولتے ہیں۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ کسی شہنشی باز عورت نے عید کے موقع پر بڑی بھش قیمت چوڑیاں پہنیں۔ اور اس امید میں کہ لوگ مہری چوڑیوں کی تعریف کریں گے۔ ہر ایک کے آگے ہاتھ مٹکاتی پھری۔ مگر بد قسمتی سے نہ تو کسی نے چوڑیوں کو دیکھا۔ اور نہ ان کی تعریف کی۔ اب تو عورت کو بڑا غصہ آیا کہ میں نے تو اتنے دام خرچ کئے۔ اور کسی نے چوڑیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مگر غصہ ظاہر ہے کہ فضول تھا۔ اور دوسرے آدمیوں پر کیا اثر کر سکتا تھا؟ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکھب اس کے ذہن میں آئی۔ چنانچہ وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گھر آئی۔ اور دیا سلائی کھینچ مکان کو آگ لگا دی۔ مکان دھوا دھو جلتے لگا۔ لوگ دوڑ پڑے۔ بہ مشکل آگ بجھائی اور عورت سے پوچھا کہ آگ کس طرح لگی؟ عورت نے ہاتھ اٹھا کر چولہے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اور کہنے لگی۔ ”اس چولہے میں سے کوئی چٹکادی آ کر کمرہ میں جا پڑی اور اس سے سارے مکان میں آگ لگ گئی“ کسی کی نظر چوڑیوں پر بھی جا پڑی کہنے لگا۔ چوڑیاں تو بڑی خوبصورت ہیں۔ کہاں سے بلوائیں؟ عورت نے کہا۔ کم ہمت پہلے سے نہ پوچھا جب سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں۔ پہلے سے پوچھ لیتا تو مہرا گھر کھوں جلتا؟ اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔



ساس مرگئی اپنی ارواح تو فبے میں چھوڑ گئی

یعنی مرنے کے بعد بھی مصیبت باقی رہی۔ اس مثل کی ابتدا اس

طرح بیان کرتے ہیں کہ کوئی ساس تھی۔ بڑی ظالم و جلد۔ اپنی بہو کو

نہایت ستاتی اور بیحد پریشان رکھتی - نہ اچھا کھانے کو دیتی - نہ بھرپور پہلنے کو - اور کام لیتی بے انتہا - غریب بہو کی مجال نہیں تھی جو اس کے سامنے دم بھی مار سکے - بیچاری بڑی خاموشی کے ساتھ اس کے سارے ظلم برداشت کرتی اور زبان سے اُف نہ نکالتی - خیر جب ساس کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے بہو کو بلایا - بہو قری کہ دیکھئے اب کھا آفت آتی ہے - قری سہمی ساس کے پاس گئی اور چھکی کھڑی ہو گئی - ساس نے کہا بہو - مجھے اپنا آخری وقت قریب معلوم ہو رہا ہے - خیر خدا کی مرضی اسی طرح تھی - مگر دنیا سے جاتے ہوئے میں تجھے ایک وصیت کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ زندگی میں تو جو کام کیا کرتی تھی میری مرضی اور اجازت سے اور میرے حکم سے کیا کرتی تھی - اب جب کہ میں نہ ہوں گی تو کس سے اجازت لیا کرے گی - اس لئے اب میری بجائے تو اس تونبے کو سمجھئے - جو کام کریو پہلے تونبے کے آگے بیان کیجئے - اور پھر اسے کیجئے - خیر دار جو اس کے خلاف ہوا - میری روح اس تونبے میں رہے گی - اگر تو نے میرے کہنے کے خلاف کیا تو پھر سمجھ لے کہ تیری خیر نہیں —

تھوڑی دیر کے بعد ساس کا انتقال ہو گیا - اور قری کی ماری پہلے ساس کے حکم کی تعمیل بڑی راسخ الاعتقادی سے کرنی شروع کی - جو کام شروع کرنے کو ہوتی پہلے مفصل طور پر تونبے کے سامنے بیان کرتی اور قری دھتی کہ ساس کی روح جو تونبے میں بیٹھی ہے کہیں ناراض نہ ہو جائے - اور سب کچھ بیان کر چکنے کے بعد پھر اس کام کو کرتی - ایک زمانہ بیچاری مصیبت کی ماری بہو پر اسی طرح گذر گیا - ایک روز اس کی ایک سہیلی آئی ہوئی تھی - اس نے جو یہ تماشا دیکھا تو بڑے تعجب

سے پوچھا کہ تو نے اس وقت یہ کیا حماقت کی؟ یہ سلتے ہی بھو کا رنگ مارے در کے فق ہو گیا اور کہنے لگی۔ چپ چپ ساس کو خبر ہو گئی تو مجھے کچی کہا جائے گی۔ سہیلی بولی۔ پاگل ہوئی ہے۔ اُسے تو مرے ہوئے بھی دو برس ہو گئے۔ اب ساس رکھی ہے۔ اس کی تو ہڈیوں کا بھی پتہ نہ ہو گا۔ بھو نے جواب دیا۔ اری پگلی ساس تو بیشک مر گئی ہے مگر اپنی ارواح اس تونبے میں چھوڑ گئی ہے۔ اسی لیے تو میں نے اس سے اجازت لی تھی۔ اماں کی وصیت تھی کہ ہر کام کرنے سے پہلے اس تونبے سے پوچھ لیا کروں۔ سہیلی نے یہ سن آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ تو نہا اتھا زمین پر دے مارا۔ وہ توت گیا تو کہنے لگی۔ لے اب بتا۔ تیری ساس کہاں دھے گی۔ تو نہا تو توت ثات ختم ہوا۔ اس وقت بھو کو معلوم ہوا کہ یہ ساری کارروائی محض میرے درانے کے لیے تھی۔ نہ روح تونبے میں آئی اور نہ وہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ چونکہ تو نہا ہی نہ رہا تھا لہذا اس روز سے بھو کو چھٹی مل گئی۔ وہ جو چاہتی اپنی مرضی سے کرتی۔ نہ اس سے کوئی پوچھنے والا تھا نہ اسے کسی کا خوف تھا۔

سوت کی انتی اور یوسف کی خریداری

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی معمولی حیثیت والا آدمی کسی عظیم الشان کام میں ہاتھ ڈالنا چاہے۔ تھوڑی بساط ہو اور بڑا حوصلہ رکھے۔ اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بھان کی جاتی ہے کہ جب ایک قافلے والے حضرت یوسف کو کلویں میں سے نکال کر بھجئے کے لیے مصر لے گئے۔ تو وہاں ان کے حسن و جمال اور لیاقت و قابلیت کا بڑا شہرہ ہوا۔ بڑے بڑے امہر ان کی خریداری کے لیے آئے۔ اور گاہکوں کا

بڑا ہجوم ہوا۔ اسی ہجوم میں ایک بہت غریب بڑھیا بھی موجود تھی۔ جس کے لباس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور پھٹی ہوئی جوتھیاں پاؤں میں پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں ایک سوت کی انتی تھی۔ کسی نے پوچھا۔ بڑی بی تم نے اس ہجوم میں آنے کی کیوں تکلیف کی؟ بڑھیا کہنے لگی۔ بیٹا یہ سوت کی انتی دے کر یوسف کو خرید لوں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ نہایت لائق اور بڑا خوبصورت غلام ہے۔ لوگ ہڈی لگے۔ لیکن بڑھیا بد ستور سنبھیدہ بنی ہوئی تھی۔

سوکن تو چوں کی بھی بڑی

یعنی اگر عورت کی سوکن نہایت ہی معمولی اور بے حیثیت بھی ہو شوہر پر اس کا کچھ بھی اثر اور دباؤ نہ ہو تب بھی عورت کے دل پر سانپ ہی لوتتا رہتا ہے۔ اور اس کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ کہتے ہیں کہ کسی آدمی کی بھوی بہت درشت مزاج بد خو اور زبان دراز تھی۔ خاوند نے یہ کام کہا کہ چونی کی ایک بڑی سی عورت بلائی۔ اس کو اچھے اچھے پہنائے اور اسے لاکر بھوی کے کمرے میں رکھ دیا۔ جب گھر میں آتا تو بجائے بھوی سے بات چیت کے اس چونی کے پتلے کی غور و پرداخت اور بناؤ سلکار میں مصروف رہتا۔ بھوی بیٹھی بیٹھی دیکھتی اور جلتی کہ مجھ سے تو ایسی الغرضی اور اس فرضی سوکن کی اتنی خاطر۔ مگر آخر کار بھوی کو سمجھ آگئی۔ اُس نے خیال کیا کہ مٹھن مہری درشت مزاجی ہی خاوند کی بے التفاتی کا سبب ہوئی ہے۔ اس نے خاوند سے اپنے پچھلے قصوروں کی معافی مانگی۔ اس چونی کی سوکن کو

باہر پہنکوا یا اور دونوں مہاں بھوی ہنسی خوشی دھنے لگے —

سونا سنار کا ابھرن سنسار کا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص کمال ہوشیاری سے کسی شخص کو الو بنا کر اپنا مطلب نکالے۔ یا کسی بھلے آدمی کو بڑی چالاکئی کے ساتھ دھوکہ دیکر اپنا کام بنائے۔ اور آدمی باوجود چوکنا دھنے کے دھوکہ کھا جائے۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی نہایت چابکدست اور مشہور سنار سے بادشاہ نے پوچھا کہ ایمان ایمان سے بتانا۔ اگر تمہیں کوئی آدمی کوئی سونے کی چیز بلنے کے لیے دے تو اس میں کتنا کھوت ملتا ہے؟ سنار نے عرض کیا۔ حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں بادشاہ نے کہا بیشک تمہیں امن ہے جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے خوفی کے ساتھ کہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بادشاہ کی زبان سے اتنا سن کر سنار بولا حضور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سنا و لوگ روپے میں پورے سولہ آنے کا مال خود ہضم کرتے ہیں اور گاہک کو خالص کھوتا مال بنا کر دیتے ہیں۔ حضور وہ سنار ہی کیا جس نے ذرا سا بھی کھرا مال بنا کر مالک کو دے دیا —

بادشاہ یہ عجیب و غریب بات سن کر نہایت حیران ہوا۔ اور کہنے لگا۔ اچھا اگر ہم تمہیں کچھ مال بلنے کے لئے دیں اور تم پر سخت پھرہ مقرر کر دیں تو پھر تم اس میں کس طرح کھوت ملا سکتے ہو؟ سنار نے عرض کیا۔ حضور خواہ کچھ ہی انتظام کر لیں۔ ہونے والی بات تو ہو کر رہے گی۔ بادشاہ نے کہا اچھا ہم امتحان کرتے ہیں۔ یہ کہ کر سنار کو ایک سونے کی پتلی بنانے کا حکم دیا۔ اور ایک علیحدہ مکان میں اس کی

ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کر دیں۔ اور اس پر دس سپاہیوں کا ایک زبردست پہرہ بٹھا دیا۔ اور انہیں تاکید کر دی کہ خبردار! نہ کسی شخص کو اندر داخل ہونے دینا۔ اور نہ سناں کو باہر نکلنے دینا البتہ جس چیز کی ضرورت سناں کو ہو وہ خود لا دینا۔ اور سناں کو دے دیا کرنا۔ الغرض سناں نے اس سخت قہد میں بیٹھ کر کام شروع کیا۔ جس وقت شام کو سناں کام سے فارغ ہو کر گھر جاتا اس وقت نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی جامہ تلاشی لی جاتی۔ اور جس وقت صبح کو کام پر واپس آتا تو اچھی طرح تلاشی دینے کے بعد اس کو اندر آنے کی اجازت ملتی۔

سناں نے یہ چالاکی کی کہ رات کو گھر پر پھتل کی ایک ویسی ہی پتلی بلانی شروع کی جیسی وہ بادشاہ کی زیر ہدایت سونے کی بنادھا تھا۔ قصہ مختصر سونے کی پتلی بھی بنتی رہی اور پھتل کی پتلی بھی تیار ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن دونوں تیار ہو گئیں۔ اب سناں نے یہ کام کیا کہ ایلی بھیوی سے کہا کہ تو دھی والی بن کر اردھ کی ایک مٹکا سر پر رکھ کر اس طرف آئو جہاں میں کام کر رہا ہوں اردھ کی مٹکے میں وہ پھتل کی پتلی چھپاتی لائو جو میں نے بنا کر فلاں جگہ رکھ دی ہے۔ یہ انتظام کر کے وہ کام پر گیا۔ اور سپاہیوں سے کہنے لگا کہ کام بالکل تیار ہو گیا۔ اب صرف اتنا کام کرنا باقی ہے کہ دھی سے اس کے تمام جسم کو صاف کیا جائے۔ تم کہیں سے تھوڑی سی دھی ملگا دو تو آج یہ کام ختم ہو جائے گا۔ اس پر پہرے والے سپاہیوں میں سے ایک تیار ہوا کہ وہ جا کر بازار سے دھی لے آئے۔ میں اس وقت ایک دھی بچنے والی دھی کا مٹکا سر پر رکھ آواز دیتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ سپاہیوں نے اس کو نہایت غنیمت سمجھا اور اسے بلا کر اندر مکان میں لے گئے۔ اور سناں سے کہا کہ لو

تمہیں دہی کی ضرورت تھی یہ دہی بیچنے والی اتفاق سے ادھر آنکلی۔
 اس سے جس قدر دہی کی ضرورت ہو لے لو۔ اب سنار نے یہ کام کیا کہ
 نہایت ہوشیاری کے ساتھ بڑی پھرتی سے سونے کی پتلی تو متکے میں ڈال دی
 اور پیتل کی پتلی دہی میں سے نکال کر سونے کی پتلی کی جگہ رکھ دی۔ خیر پتلی بادشاہ
 کے سامنے پہنچی تو اُس کے رنگ و روغن۔ آب و تاب اور خوبصورتی و
 صفائی کو دیکھ کر بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ وہ ہرگز بھی نہ سمجھا کہ یہ
 سارا پیتل کا معاملہ ہے اور اس میں ایک رتی برابر بھی سونا نہیں ہے۔
 بادشاہ کو یقین تھا کہ اس کے بنانے میں سنار کوئی چالاکی نہیں کر سکا
 ہو گا۔ چنانچہ اس نے سنار کو بلایا اُس کی صنعت اور کمال کی داد دی
 اور ہلکے پوچھا کہ کہو اس پتلی میں کتنا کھوت ملا یا؟ سنار نے جواب
 دیا۔ جہاں پناہ آپ کے ہاتھ میں خالص پیتل کی پتلی ہے۔ جس میں
 سونا رتی برابر بھی نہیں۔ بادشاہ یہ سن کر بڑا ہی حیران ہوا۔ اور
 جوہریوں کو بلایا۔ جنہوں نے دیکھ کر کہا کہ حضور یہ تو خالص پیتل ہے۔
 اب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ عجیب و
 غریب کارروائی کس طرح کی؟ سنار نے ساری کیفیت من و عن بیان کر دی۔
 یہ ہے مثل کی وجہ تسمیہ۔

سیف تو پت پڑی تھی پر نیچہ کات کر گیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں جس شخص سے کام ہلنے کی
 توقع ہو وہ تو کام کرے نہیں ہاں دوسرا شخص جس سے کچھ زیادہ امید
 نہ ہو وہ کام کر دے یعنی خلاف توقع کام بن جانے کے موقع پر یہ مثل استعمال
 کی جاتی ہے۔ اس مثل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز

ایک نواب صاحب جن کا اسم گرامی سفید خاں تھا اپنی سواری پر بازار میں سے گذر رہے تھے۔ اور ان کے آگے اُن کا بیٹا بٹھا ہوا تھا۔ راستے میں جاتے ہوئے ایک فقیر نے نواب صاحب سے سوال کیا مگر نواب صاحب نے کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ان کے لڑکے نے جھپٹ ایک اشرفی نکال کر فقیر کی طرف پھینک دی۔ اُس وقت فقیر نے فوراً یہ فقرہ کہا - جو فوراً سارے شہر میں مشہور ہو گیا اور بعد میں ضرب المثل بن گیا۔ سفید کے معنی تلوار کے ہیں۔ اور امیر کا نام سفید خاں تھا - اسی مناسبت سے فقیر نے یہ فقرہ چست کیا -

— * —

سیکھہ را کو دیجئے جا کو سیکھہ سہاے

سیکھہ نہ دیجئے باند را کو جو گھر بٹے کا جاے

سیکھہ کے معنی نصیحت کے ہیں - ضرب المثل کا مطلب یہ ہے کہ واضع و نصیحت اس شخص کو کرنی چاہئے جو اسے قبول کرے اور کہتا مانے - بلکہ کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جو غصہ میں آکر بٹے کے ہی گھونسلے کا صفایا کرے - یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی شخص کو نصیحت تو کی جائے - ہمدردی کی خاطر وہ شخص اور اُلٹا نصیحت کرنے والے کے گلے کا ہار ہو جائے - اور نصیحت کرنے والے ہی کو برا بھلا کہنا شروع کر دے - مطلب یہ ہے کہ اُلٹی آنتیں گلے میں پڑیں - اس مثل کے متعلق یہ پر لطف قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی - جنگل کا موقع تھا - ایک درخت پر بٹے نے اپنا گھونسلہ بنا رکھا تھا اور اس میں بھا اور بٹی نہایت آرام اور بے فکری سے بیٹھے تھے - نہ ان تک پانی کی کوئی بوند پہنچتی تھی اور نہ بوچھاڑ ہی آتی تھی - اتنے میں بٹے نے دیکھا کہ ایک بندر بھی سکو اسکو

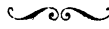
درخت کی ایک تہلی پر بیٹھا ہے - زور زور سے بوندیاں پڑنے لگیں تو وہ اچھل کر دوسری شاخ پر جا بیٹھا۔ وہاں بھی امن نہ ملا تو تیسری پر جا چڑھا۔ غرض سارے درخت پر اسی طرح سراسیمہ اور پریشان پھر رہا ہے اور بھیچارے کو کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی - سردی سے الگ کانپ رہا ہے - تڑا تو جو اولے پڑ رہے ہیں وہ اور بلاے جان ہو رہے ہیں - قصہ مختصر بھیچارے کی جان مصیبت میں آدھی ہے اور کچھ بن نہیں آتا کہ کیا کرے بٹے نے بلدر کی جو یہ حالت دیکھی تو کہنے لگا ”میاں بلدر! اللہ میاں نے تمہیں مضبوط ہاتھ تیز پانچے - پھرتیلا جسم دیا ہے - اگر بوسات آنے سے پہلے ایک اچھا سا گھر بنا لیتے تو اس وقت کیسا آرام پاتے اور اس مصیبت سے بچ جاتے جو اس وقت اُٹھا رہے ہو - مجھے ہی دیکھ لو - تمہارے سے چھوٹا اور کمزور پرندہ ہوں - نہ میرے ہاتھ پاؤں ایسے مضبوط ہیں جیسے تمہارے نہ پانچے ایسے تیز ہیں اور نہ جسم ایسا چست و چالاک ہے - پھر بھی میں نے محنت اُٹھا کر ایسا اچھا گھر بنا لیا ہے کہ اب اس میں بیٹھا ہوا چین کر رہا ہوں - نہ بارش کا خطرہ ہے اور نہ سردی کا خوف - کاش میری طرح تم بھی عاقبت اندیش ہوتے تو یہ بڑے دن کیوں دیکھنے نصیب ہوتے —

بلدر مارے سردی اور اولوں کے پہلے ہی بدحواس ہو رہا تھا - اس بے وقت کی نصیحت سے اپنے آپ میں نہیں رہا - جہت چلنچلا کر ایک آن کی آن میں بٹے کا گھونسلہ نوچ ناچ پھینک دیا - اور کہا ”ہاں اب کہ کیا کہتا ہے - میں نے سنا نہیں تھا“ - غریب بیا اور بٹی دونوں آ کر ایک شاخ پر جا بیٹھے اور اب ان کی بھی وہی حالت تھی جو بلدر کی —

سینک سڑپے تو لالہ جی کے ساتھ گئے اب تو دیکھو اور کھاؤ

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں بہ نسبت پہلے کے اور زیادہ کفایت شعاری کرنے کی تاکید کی جائے۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک بلیا حد درجہ کا کلجوس اور بخیل تھا۔ اُس کے بغل کی انتہا یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے ایک شہشی میں تھوڑا سا گھی لہکر رکھ لیا تھا۔ کھانے کے وقت ایک سینک اُس میں ڈبو کر نکال لیتا اور دال میں دال دیتا خیر اسی طرح گھر کا گزارہ چلتا رہا۔ ارد لالہ جی روپ جوڑتے رہے۔ یہاں تک کہ وقت آپہنچا۔ اور لالہ جی بیہکنتہ باشی ہو گئے اب صاحبزادہ بلند اقبال کی سلیبے۔ وہ جو گھر کے مالک ہوئے تو انہوں نے سارے گھر والوں کو جمع کیا۔ گھی کی قدیمی شہشی سامنے رکھ لی اور فرمانے لگے سنو بھئی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ سر گباشی لالہ جی اس شہشی میں سے دونوں وقت ایک ایک سینک نکال کر دال میں ڈالا کرتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ لالہ جی کی آمدنی کثیر تھی۔ وہ اگر ایسی فضول خرچی کرتے تھے تو وہ تو اپنی نبھا گئے۔ مگر ہم سے نبھتی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح روز دونوں وقت اس شہشی میں سے ایک ایک سینک استعمال کی جاتی رہی تو ایک نہ ایک دن ضرور سارا گھی ختم ہو جائے گا۔ ارد ڈرا سوچنے کی بات ہے کہ پھر اور گھی کہاں سے آئے گا۔ تو بھائیو سینک سڑپے تو لالہ جی کے ساتھ گئے اب تو دیکھو اور کھاؤ۔ بس یہی ترکیب آسان معلوم ہوتی ہے کہ کھانا کھانے بچتے تو شہشی کو طاق میں سے اتار کر سامنے رکھ لیا اس کی خوشبو دماغ میں پہنچتی رہی۔ اور گھر والے کھانا کھاتے رہے یقین جانو اس سونگھنے میں وہ لطف آیا کرے گا جو کھانے میں کبھی نہیں آسکتا۔ چنانچہ سب گھر

والوں نے بہ خوشی خاطر اس زرین تجویز کو منظور کیا۔ اردو پہلے سے زیادہ
کفایت شعار بن گئے۔



عذر گناہ بدتر از گناہ

یہ فارسی ضرب المثل ہے مگر اردو میں بھی بہ کثرت استعمال ہوتی ہے۔
جب کوئی شخص اپنے قصور کی ایسی غلط اور قابلِ مشحکہ تاویل کرے کہ وہ
تاویل اصل قصور سے بھی بڑھ جائے۔ جرم پہلے سے بھی زیادہ سنگین نظر آئے۔
اس وقت یہ مثل بولتے ہیں۔ یہ تو پتہ نہیں لگ سکا کہ اس مثل کی
ابتدا کب اور کس طرح ہوئی مگر اس کے متعلق ایک بڑا ہی پر لطف
تاریخی لطیفہ مشہور ہے جو ہم ناظرین کی تفلن طبع کی خاطر یہاں لکھتے ہیں:-
خلیفہ ہارون الرشید نے ایک روز دربار میں کہا کہ ”عذر گناہ
بدتر از گناہ کا فارسی مقولہ بظاہر نہایت لغو اور فضول نظر آتا ہے۔
بہلا یہ بات کس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ قصور کی عذر خواہی
کی جائے اور وہ عذر خواہی خود اصل قصور سے بھی بڑھ جائے۔ فارس
کے باشندے دراصل ہوتے ہی ہیں بڑے لغوگو اور مبالغہ پسند“ اس وقت
دربار کا مشہور شاعر ابو نواس بھی حاضر تھا۔ وہ جواب دیے بغیر نہ رہ سکا
اور کہنے لگا۔ حضور! مقولہ بالکل درست اور تھیک ہے۔ اور اس میں ذرہ
بزاہر بھی جھوٹ یا مبالغہ نہیں۔ ہارون الرشید نے کہا۔ اچھا اسے ثابت کرو
ابو نواس نے عرض کیا کہ ”بیشک اس کا ثابت کرد گھانا میرے ذمہ ہے۔ حضور
چلے تو قف فرمائیں۔ میں اس کی صداقت کو چلن ہی ثابت کر دکھاؤں
گا۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ جب تک حضور علی طور پر اس کی صداقت
کو ملاحظہ نہ فرمائیں گے اس وقت تک یہ مقولہ ذرا مشکل سے سمجھ

میں آئے گا“ یہ کہہ کر ابونواس خاموش ہو گیا اور بات بظاہر آئی گئی ہوئی۔ اسی دن رات کو ابونواس نے یہ کام کیا کہ خواجہ سراؤں کو کسی طرح راضی کر کے زنانی دیورہی میں ایسے مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں اتفاق سے کچھ اندھیرا تھا۔ بادشاہ جو باہر سے دیورہی میں داخل ہوئے لگے تو جس وقت اس مقام پر پہنچے جہت ابونواس نے پردے کے پیچھے سے نکل کر بادشاہ کا منہ چوم لیا۔ بادشاہ نے گہرا کر کہا۔ کون ہے؟ میں ابونواس! تو ہے۔ اے یہ کیا نامعقول حرکت تھی۔ ابونواس نے بڑی شرمندہ صورت بنا کر کہا کہ افوہ! حضور ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ زبیدہ خاتون ہیں۔ خیر اس وقت تو معاف کر دیجئے آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی“ اس عجیب و غریب جواب سے ہارون الرشید کے غضب کا پارہ آخری دگڑی پر پہنچ گیا۔ اور وہ مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگا اور تپت کر اس نے ابونواس سے کہا ”مردود! کیا بتاتا ہے“ ابونواس فوراً قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا۔ حضور ایسے ہی موقع پر تو بولتے ہیں کہ ”عذر گناہ بدتر از گناہ“ ہارون الرشید ہنس پڑا اور ابونواس کو کچھ انعام دے کر رخصت کر دیا۔

کالی بھلی نہ سمیت دونوں کو مارو ایک ہی کھیت

سمیت کے معنی سفید کے ہیں کہتے ہیں کسی شخص کے دو بیویاں تھیں ایک کالی کلوٹی اور بد صورت اور دوسری گوری چٹی اور خوبصورت مگر تھیں دونوں اول درجہ کی بد طیلت شوہر کو ہمیشہ دق اور پریشان رکھتیں۔ یہاں تک کہ بھیجے کی زندگی اچھون ہو گئی جب گھر میں پوتا دونوں جھڑ کا کانتا ہو کر اسے چمت جاتیں ایک دوسرے کی شکایت

کرتیں۔ شوہر کو صلواتیں سلاتیں۔ قسمت کا گلا کرتیں اور اپنے آپ کو کوستیں۔ یہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ ایک روز کسی دوست نے تذکرۃ ”پوچھا کہ دونوں میں سے زیادہ نیک اور سلیقہ شعار آپ کی کون سی بیوی ہے؟ اس پر جل کر شوہر نے جواب دیا کہ ”کالی بھلی نہ سمیت دونوں کو مارا ایک ہی کھیت“ یعنی دونوں ہی نکمہ اور نالائق ہیں۔ میرا بس چلے تو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی نہ ملے۔

اس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ اور ایسے موقع پر بولا جانے لگا جب کسی آدمی کے دو دشمن ہوں اور دونوں بظاہر ہمدردی کا اظہار کریں۔۔

کچھ تم سمجھ کچھ ہم سمجھ

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں دو آدمیوں کے درمیان اشاروں کلاؤں میں ایسی طنز آمیز گفتگو ہو جسے دوسرے لوگ نہ سمجھ سکیں۔ مگر وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھ کر خاموش ہو جائیں۔ بیان کرتے ہیں کہ کسی مسافر کے پاس ایک ہزار روپے کی تھیلی تھی۔ اور وہ ایک شہر آباد راستہ پر سفر کر رہا تھا۔ پیچھے سے اتفاقاً ایک اور مسافر اس سے آگے۔ اس نے کہا بھائی تو مہرے سے زیادہ طمعور اور مضبوط ہے اور راستہ خطرہ سے خالی نہیں۔ مہرے پاس ہزار روپیہ نقد ہے۔ یہ تو اپنے پاس رکھ لے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر لے لوں گا۔ نو وارد نے جواب دیا۔ نہیں بھائی! میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ اور یہ کہ کر آگے بڑھ گیا۔ اب مسافر نے خیال کیا کہ اچھا ہی ہوا تھا جو میں نے روپیہ اس اجنبی کے پاس نہیں رکھوایا تھا۔ اگر یہ لے کر

چل دیتا تو میں کیا کر لیتا۔ اب ادھر کی سڑیے۔ نوراد مسافر کے دل میں آئے جا کر خیال آیا کہ منت میں رقم آدھی تھی۔ ہاتھ بے دے کر بڑی بے وقوفی کی۔ چلو اب واپس چلو۔ اور رقم ہاتھ آجائے تو لے کر فٹرو ہو جاؤ۔ میرا بنا ہی کیا لے گا۔ یہ خیال کر کے واپس پھچھ کی طرف لوٹا۔ مسافر بیچارا آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا:۔
 مہاں میں نے خیال کیا کہ اگر اپنے سے کسی کا کام ملتا ہو تو اس کا کام کر دینا چاہئے۔ لاؤ روپیہ رکھ لوں۔ منزل پر پہنچ کر لے لیتا۔ اچھا ہے بے فکری سے راستہ طے کر لوئے۔

مسافر ہوشیار ہو چکا تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ یہ اظہار ہمدردی بلا وجہ نہیں۔ اس پر کہنے لگا۔ بھائی آپ کی مہربانی۔ لیکن بات یہ ہے کہ کچھ تم سمجھ کچھ ہم سمجھ۔ ایسا کیا بوجھ ہے۔ خود ہی لے جاؤں گا۔ اسی وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب الامثال استعمال ہونے لگا۔

کر تو تار۔ نہ کر تو بھی تار

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی آدمی کو یہ نصیحت کرنی ہو کہ ہر وقت اور ہر گھڑی خدا سے پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔ نہ معلوم کس وقت کیا آفت آن پڑے۔ کہتے ہیں کہ دو دوست تھے جو بازار میں پاس ہی پاس دوکانیں کرتے تھے۔ ایک روز ایک دوکاندار نے اپنے دوست سے کہا ”بھئی! کر تو تار، نہ کر تو بھی تار“

دوست نے جواب دیا۔ واہ یہ کیا بات ہے۔ اگر برا کام کریں تو تو تاریں بھی۔ جب برا کام ہی نہ کریں تو پھر تارنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجرم ہی کو سہا ہی پکڑتا ہے۔ جس نے کوئی قصور ہی نہیں کیا اسے سہا ہی سے

کہا تو؟ خیر دونوں کا مباحثہ اس مسئلے کے متعلق ہوتا رہا اور دن گذرتے رہے۔ ایک روز ایک امیر آدمی بوا شاندار لباس زیب رتن کھنے دوکان پر آیا۔ اس کے ساتھ اس کا ملازم بھی تھا۔ جو ایک چھوٹے بچے کو کندھے سے لگائے ہوئے تھا۔ خیر آقا نے بہت سا سامان دوکان پر سے خرید لیا۔ اور ملازم سے کہا دیکھو جی یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں یہ سامان گھزلے جانا ہوں۔ وہاں سے آدمی کے ہاتھ قیمت بھیج دوں گا۔ پھر تم واپس چلے آنا یہ کہہ کر امیر آدمی بچہ چلا گیا اور اس کا ملازم دوکان پر بیٹھ گیا۔ دوکاندار مطمئن تھا کہ بچہ اور ملازم دونوں موجود ہیں ابھی روپیہ آتا ہوگا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ملازم نے بچہ کو آہستہ سے دوکان کے فرش پر لٹا دیا۔ اور کہنے لگا ذرا پیشاب کر آؤں۔ دوکاندار نے خیال کیا، کیا ہرجہ ہے بچہ تو سامنے سو رہا ہے۔ بچہ کو چھوڑ کر یہ کہاں جاسکتا ہے؟ جب ملازم کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی اور آقا صاحب کی واپسی کی بھی کوئی امید نہ رہی تب تو دوکاندار بوا گھبرایا۔ جلدی سے اٹھ کر بچہ کو دیکھا تو وہ مردہ تھا۔ اب تو اس نے اپنا سر پھٹ لیا۔ چاہتا تھا کہ پولیس کو اس عجیب و غریب چالاکی کی اطلاع دے کہ یکایک امیر آدمی اور اس کا نوکر سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ اور آتے ہی کہنے لگے۔ معاف کیجئے۔ ہمیں کچھ دیر ہوگئی۔ خیر لیجئے۔ اپنی رقم اور ہاں وہ ہمارا بچہ کہاں ہے؟ اچھا یہ رہا۔ یہ کہہ کر امیر آدمی نے جوں ہی اسے اٹھانا چاہا۔ فوراً ایک چمچ ماری ادر کہنے لگا۔ میں یہ تو مر گیا۔ کیوں میاں دوکاندار! اس معصوم کا کلا کس جرم میں گھونٹا؟ چلو تھانے میں۔ بیچارہ دوکاندار سخت پریشان ہوا کہ اب کیا کرے۔ پولیس کو خبر ہوگئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسی نے اس کا کلا گھونٹا ہے۔ اصل بات کون دیکھتا ہے۔ اس لیے اپنی

ہوٹ بچانے کی خاطر اس نے امیر آدمی کی خوشامد کرنی شروع کی اور بہ مشکل ایک ہزار روپیہ اسے دے کر اپنی جان چھوڑی۔ ملازم نے بچہ کو اتھا کر پھر کدھے سے لٹا لٹا اور دونوں جدھر سے آئے تھے ادھر ہی چلے گئے۔ ان نے چلے جانے کے بعد دوکاندار کو خیال آیا کہ اس جھکڑے میں مال کی قیمت بھی ان سے وصول نہیں ہوئی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا —

دوست نے یہ سارا واقعہ دیکھا اور کہنے لگا - کہوں بھئی کہا اب بھی تم اس فقرے کی صداقت کے قائل نہیں ہو گئے کہ ”کر تو قدر نہ کر تو بھی قدر“ —

— * —

کہاویں خان خانان آراویں میاں فہیم

اس مثل کو دوسری طرح یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مال مند دل بے رحم - یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کمارے کوئی اور آوازے کوئی - اکبری امرا میں سے عبدالرحیم خان خانان نہایت مشہور گُورا ہے - بوا فہاض طبع اور دریا دل انسان تھا - اُس کا ایک نہایت ہی عزیز اور چاہتا غلام تھا فہیم نام - فہیم آقا کے مزاج میں اس قدر دخیل تھا کہ جو چاہتا کرتا اور جس قدر چاہتا خرچ کرتا - کوئی اس کے معاملہ میں بولنے والا اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا - میاں فہیم بے دریغ روپیہ دھونے سے خرچ کرتے تھے اور بڑی شان سے دھتے تھے - انہی فہیم کو دیکھ کر یہ مثل بدائی گئی —

— * —

کھجوری کھاتے پھنچا اُترتا ہے

اس مثل کا استعمال ایسے موقع پر ہوتا ہے جب کہ بہت ہی معمولی

سا کام کرتے ہوئے کوئی بڑی تکلیف اتفاقاً پہنچ جائے۔ نازک مواقع آدمی کے لئے بھی بولتے ہیں۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کوئی نواب صاحب تھے۔ نہایت ہسٹارخور اور بڑے کھاڑ۔ ان کی ایک وقت کی خوراک پندرہ بھس بھر کے قریب تھی۔ ایک روز نواب صاحب کی طبیعت کچھ غلیل تھی۔ حکیم صاحب نے فدا میں کھجوری تجویز کی۔ خیر جب کھجوری پک کر آئی تو ایک بہت بڑے لگن میں بھر دی گئی۔ نواب صاحب کھانے بیٹھے اور پہلچے تک ایک دفعہ ہی اپنا ہاتھ اس میں ڈال دیا۔ کھجوری تھی بہت گرم۔ ہاتھ جل گیا۔ سوزش جو ہوئی تو نواب صاحب نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس میں سے نکالا۔ جتنی کھجوری ہاتھ میں لگی رہ گئی تھی اس کے لئے ہاتھ کو جو زور سے جیتکا دیا تو فوراً پہنچا اُتر گیا۔ اور بڑی مالش کے بعد درست ہوا۔ اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔

— * —

کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے

فارسی زبان میں اس مثل کی مترادف مثل ”گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل“ ہے۔ یعنی ایسی بات جو نہ کہتے بن پڑے اور نہ چپ رہا جائے۔ آدمی تذبذب میں پڑ جائے کہ اب کیا کروں۔ کہتا ہوں تو خرابی نہ کہوں تو مشکل۔ اس مثل کے متعلق ایک بڑے ہی مزے کی حکایت مشہور ہے۔ اللہ کو پتہ ہے کہ کہاں تک سچ ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہے دلچسپ۔ کہتے ہیں کہ درمیاں بیوی تھی۔ اور دونوں میں روزمرہ کا نصیحتی رہتی تھی۔ خاوند بہت سخت تھا اور کوئی دن ایسا نہ جاتا ہوگا جو دو چار مرتبہ بیچاری بیوی پر مارنے پڑ جاتی

ہو - عورت تھی جاہل مطلق - کسی بیوقوف نے اسے بتا دیا کہ اگر تو کسی کتے کو پکڑ کر اور اُسے کات کر اس کا گوشت خاوند کو کھا دے تو خاوند فوراً تیرا ہاتھ باندھا غلام ہو جائے گا - جس طرح تو کہیگی اس طرح کرے گا - اور جو تو حکم کریگی بجالائے گا - بیوی نے سوچا یہ تو بڑا سہل نسخہ ہے - لاؤ کہوں نہ آزماؤں - فوراً ہی ہمسائی کی معرفت ایک بازاری کتا پکڑوا کر منگوایا - اور اس کے گلے پر چھری پھیر گوشت کو صاف کر چولہے پر چڑھا دیا - مصالحوہ اور کھی اس میں کافی ڈالا اور اچھا تر تر تاشوربا کر دیا - شوربا کیا معنی قورما - خیر شوہر صاحب جو باہر سے آئے تو جھٹ خوشی خوشی ان کے سامنے کھانا نکالنے بیٹھی - جب وہ رکابی میں تار تار نکال رہی تھی تو صاحبزادہ بلند اقبال بھی پاس ہی تشریف فرما تھے - جن کی عمر ہوئی کوئی آٹھ سات برس کی اور کتے کے پکڑے ہوئے آنے اور اس کے پکڑنے کی ساری کارروائی نوربصر کے سامنے ہی ہوئی تھی - اور ماں نے اس خہال سے کہ بچہ ہے کیا سمجھے گا اس سے معاملہ کو چھپانے کا کوئی اہتمام نہ کیا تھا - اب جو سالن نکلتا شروع ہوا تو ہر خوردار سوچنے لگا کہ یہ تو بڑی ہوئی - اگر یہ کہتا ہوں کہ میں ابا جان! یہ مت کھانا کتے کا گوشت ہے تو ماں کی آج خیر نہیں - اور اگر چپ رہتا ہوں تو یہ کس طرح گوارا کرلوں کہ والد بزرگوار کتے کا گوشت کھائیں - آخر کو جو آپ کے دل میں تھا آہستہ آہستہ زبان پر بھی آئے لگا - اور آپ نے دبی زبان کھنا شروع کیا -

کہوں تو ماں مادی جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے

باپ کو شبہ ہوا اور اس نے پیاد سے پوچھا - بیٹا! کیا بات ہے؟

آج تو تم ایک نئی بات کہہ رہے ہو - اونگھتے کو تھیلتے کا بہانہ ہوا -

اور میاں صاحبزادہ نے سارا کچا چٹھا باپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔
شوہر نے کڑے تیوروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور بیوی کے :-

کاتو تو لہو نہیں بدن میں

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے ہم ناظرین کے تخیل پر چھوڑتے ہیں۔

— —

گھڑی ادھر اور میں ادھر

یہ مثل ایسے بے وقوف اور احمق کے متعلق بولتے ہیں جس کے منہ سے نادانستہ طور پر جلدی میں ایسی بات نکل جائے جس سے وہ خود ملزم ہو جائے۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک صاحب تھے انہیں جو ہوئی کوئی ضرورت۔ تو سوچتے سوچتے یہ ترکیب ان کی سمجھ میں آئی کہ ہمسایہ کے مکان میں چوری کرنی چاہئے۔ فوراً بہت سا مال ہاتھ آجائیکا۔ اور سب دلدرد ہار ہو جائیں گے۔ دیوار بیچ تو تھی ہی۔ اس لئے کام بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ رات گئے آپ دیوار پھاند ہمسایہ کے مکان میں داخل ہوئے۔ یہاں سب سو رہے تھے اور سناٹا پڑا ہوا تھا۔ آپ نے جو قیمتی قیمتی جھڑیں ملیں اور نقد جو کچھ دستیاب ہو سکا ایک جگہ جمع کیا۔ وہیں سے ایک چادر لی اور اس میں سارے مال فلیٹ کو باندھا۔ اور اُٹھا کر لے چلے۔ ابھی کوٹھ پر نہ پہنچے تھے کہ اُن کی بدقسمتی سے گھر کے لوگ جاگ اُٹھے۔ اور اُنہوں نے وہیں سے چور چور کا شور مچایا۔ یہ گھڑی لے کر بھاگے۔ دیوار جو پھاندنے لگے تو گھڑی سر پر سے گر پڑی۔ فوراً لوگ پہنچ گئے اور گھڑی کو قبضہ میں کیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ یہ دوسری طرف کود چکے تھے۔ اور اُنہیں کودتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ دُک گئے اور چپکے سے جاکر پلنگ

پر لہت گئے - اب مسئلہ کے جس قدر آدمی جمع تھے سب نے اپنی اپنی
 سمجھ کے موافق رات کے واقعہ پر رائے زنی کرنی شروع کی - چور
 صاحب سب انسپکٹر کی طرف مخاطب ہوئے اور کہنے لگے تھانیدار صاحب !
 مہرے تو خہال میں چور اس بیچ والی دیوار پر سے آیا ہوگا - اور
 اسباب باندہ کر اسی طرف واپس کودنا چاہتا ہوگا کہ گھر والے جاگ
 اُٹے - اس کے آگے یہ کہنا چاہتے تھے کہ جلدی میں گھڑی اُدھر گر پڑی اور
 چور اُدھر کود گیا - لیکن اُن کی زبان سے نکلا یہ کہ ”بس جذاب گھبراہٹ
 میں گھڑی اُدھر اور میں اُدھر“ تھانیدار نے مسکوا کر کہا ”ہاں جذاب
 آپ نے سچ فرمایا کہ گھڑی اُدھر اور میں اُدھر - مگر اب تو آپ بھی
 اُدھر ہی آجائیے“ یہ کہہ کر تھانیدار نے سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس
 نے اس اقبالی مجرم کے ہتھکڑیاں لگالیں -

گرہہ کشتن روز اول باید

یہ فارسی کی ضرب المثل ہے جو اردو میں بہ کثرت استعمال ہوتی
 ہے - مطلب یہ ہے کہ کسی کام کا انتظام پہلے دن اور ابتدائی میں کرنا
 چاہئے - جب شروع میں کسی خرابی کی روک تھام نہ کی گئی تو پھر
 بعد میں اُس کا انتظام محال کے قریب ہو جاتا ہے - اور سخت دقتیں
 اور مشکلات پیش آتی ہیں - اس کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا
 جاتا ہے کہ دو تین دوست تھے جو آپس میں بڑی محبت سے رہا کرتے تھے
 مختلف اوقات میں سب کی شادیاں ہو گئیں - اور ہر شخص فکرِ معاش
 میں مشغول ہو گیا - مدت کے بعد جو دوستوں کا آپس میں ملنا ہوا تو ایک نے
 دوسرے سے پوچھا کہ کہو بھئی بھئی کھسی ملی ! ایک صاحب فرمانے لگے -

بھٹی کچھ نہ پوچھو ہماری بیوی تو سخت بد مزاج ہے - بات بات پر
 پھاڑ کھانے دوڑتی ہے - میں تو اس کے ہاتھوں سخت تلک ہو رہا ہوں -
 بن نہیں آتا کہ کیا کروں ؟ دوسرے دوست فرمانے لگے - میاں ! ہماری
 بیوی تو ہمارے سامنے چوں نہیں کر سکتی - حکم کی بلدی ہے - مجال نہیں
 کہ ہمارے کہنے کے خلاف کرے - شامی دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ آخر
 بتاؤ تو سہی تم نے ایسا کیا عمل کیا تھا جو تمہاری بیوی اس قدر تمہاری
 فرمانبردار ہے ؟ ان صاحب نے جواب دیا - میں نے شادی سے پہلے ہی سن
 لیا تھا کہ میری ہونے والی بیوی بہت بد مزاج ہے - اس لئے میں نے یہ
 تدبیر کی کہ پہلے ہی دن ایک بلی کو تمام دن بھوکا رکھ کر شام کو اپنے
 پلنگ سے باندھ دیا - رات کو جس وقت سونے کے لئے پلنگ پر لیٹتا تو بلی
 بھوک کے مارے میاؤں میاؤں کرنے لگی - میں فوراً پلنگ سے کودا - اور
 بڑے فصہ کی شکل بذاکر میں نے کہا اچھا تو کیا تو مجھے سونے بھی نہیں
 دیتی ؟ یہ کہا اور بڑے فصہ میں آکر میں نے تلوار سے بلی کے دو ٹکڑے
 کر دیے - میری بیوی پہلے ہی دن میرے فصہ کو دیکھ کر کانپ اُٹھی - اور
 اُس نے سوچا کہ یہ تو بڑا غصیل اور سخت آدمی ہے - اگر میں نے ذرا
 بھی اس کے ساتھ سختی برتی یا اس کا حکم نہ مانا تو پھر میرا بھی یہی
 حشر کرے گا - بس اُس روز سے جو میرا رعب بیوی پر بیٹھا ہے تو اس وقت
 تک وہی حالت ہے - اور اسی وجہ سے بڑے چہن و آدم سے زندگی بسر ہوتی ہے -
 دوسرے دوست نے یہ عجیب و غریب قصہ سنا تو اپنے دل میں پختہ
 ارادہ کر لیا کہ میں بھی یہی تدبیر کروں گا - تاکہ بیوی کی درشت
 مزاجی سے نجات ملے - چنانچہ آپ نے بھی کہیں سے ایک بلی حاصل کی
 اور اسے اپنے پلنگ سے باندھ دیا - شب کو جس وقت سونے لگے تو اس نے

بلدھے ہونے کی وجہ سے مہاوں مہاوں کرنی شروع کی اس پر آپ فوراً اٹھ بھٹے اور تلوار کھینچ کر چو پہلے ہی سے پاس رکھ لی تھی بلی پر حملہ کیا - اور نہایت فصہ کا منہ بذاکر اس کے تلوار ساری - معاً بھوی نے پیچھے سے ایک دو پتھر رسد کیا - اور کہا کہ آج بھٹھے بٹھارے یہ کہا ضبط سوچھا؟ عقل بھی ٹھکانے ہے - حواس غائب کیوں ہو گئے - میں تم سے پوچھتی ہوں - آج تمہیں کہا ہوا؟ شام تک تو تم اچھے بھلے چل گئے تھے - اب مہاں کیا بولیں - دم بخود پلنگ پر لہٹ گئے اور دم و فصہ میں ساری رات گزار دی - صبح سویرے اُٹھ کر اُن دوست صاحب کے پاس پہنچے جن سے یہ ترکیب سیکھی تھی - اور کہنے لگے - واہ حضرت اچھی ترکیب بتلائی - اور الٹی ہمارے ہی اوپر مار پڑی - دوست نے متعجب ہو کر حال پوچھا - اور کینہت معلوم ہونے پر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا - دوست! گرہہ کشتن روز اول باید - یہ طریقہ تو تمہیں پہلے دن اختیار کرنا چاہئے تھا - اتنے دنوں کے بعد اب کیا بن سکتا ہے - اب تو بھوی کے ہاتھ سے جتنی جوتیاں کھانی قسمت میں لکھوا لائے ہو کھانی ہی پڑیں گی -

گھر کا بھیدی لٹکا تھاے

یعنی بہ نسبت غیر شخص کے گھر کے راز دار سے بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے - شہروں میں اکثر چھوٹی موٹی چوریاں گھر کے واقفوں اور ملازموں ہی کے پتہ بتانے پر کی جاتی ہیں - یہ مثل اس مشہور و معروف واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ رام چندر جی نے سیتاجی کو چھرانے کے لیے لٹکا کے راجہ راون پر حملہ کیا ہے - اور اسے شکست دیکر

لکا کو پھونک دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ لکا کی فتح میں سب سے بڑا ہاتھ راون کے بھائی کا تھا۔ جو رام چندر جی سے مل گیا اور تمام راز کی باتیں ان کو بتلا دیں۔ جس کی وجہ سے رام چندر جی اتنی آسانی کے ساتھ لکا پر قابض ہو سکے۔ اگر وہ یہ غداری نہ کرتا تو شاید رام چندر جی کو لکا فتح کرنے میں بہت کافی عرصہ لگتا۔ یا بالکل ہی فتح نہ ہو سکتی۔

لینا ایک نہ دینا دو

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں نہایت ہی معمولی بات پر جھگڑا ہونے لگے۔ یا مفت میں کوئی شخص مشکل میں پھنس جائے۔ فضول اور بیکار میں پھنس جانے والے کے لیے بھی بولتے ہیں اس کا قصہ یہ مشہور ہے کہ ایک مور اور ایک مہلک کی بڑی گہری دوستی تھی۔ مہلک پانی میں سے باہر آجاتا اور دونوں دیر تک خوب سہر کرتے۔ پھر مور مہلک کو پانی میں چھوڑ جاتا اور اپنے آپ چلا جاتا۔ ایک روز اسی طرح مور مہلک کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا کہ کسی چڑی مار کے جال میں پھنس گیا۔ اور چڑیمار اسے شہر کو لے چلا۔ اب تو مور بڑا گھبرایا۔ اور چڑیمار سے کہنے لگا کہ تم نے آخر مجھے کس فرض سے پکڑا ہے؟ اور تم میرا کیا کرو گے؟ چڑیمار نے کہا کروں گا کیا۔ بازار میں لیجا کر بیچوں گا۔ اور پیسے لیکر بال بچوں کو کھلاؤں گا۔ مور نے کہا اچھا اگر میری معمولی قیمت سے بہت زیادہ قیمتی شے تم کو میرے معاوضے میں مل جائے تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟ چڑیمار نے کہا ہاں مجھے اور کیا چاہئے؟ اس پر مور نے کہا اچھا تو مجھے سلندر کے کنارے لے چلو۔ خیر سلندر کے کنارے پہنچ کر مور نے مہلک کو آواز دی۔ وہ فوراً پانی سے باہر آیا

یہاں دیکھا تو دوست کو جال میں پھنسا پایا۔ مورد نے کہا۔ بھئی اس وقت میں اس چڑیمار کے جال میں پھنس گیا ہوں اور اس بات پر مہری رہائی کا وعدہ چڑیمار کرتا ہے کہ اگر بازار میں جو کچھ مہری معمولی قیمت اٹھے اس سے بہت زیادہ قیمتی چیز اس کو دے دی جائے تو یہ مجھے چھوڑ دے گا۔ اب میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم مہری رہائی کے معاملہ میں مہری مدد کرو۔ میلڈک نے فوراً پانی میں غوطہ مارا اور ایک بڑا سا موتی لاکر اسے دکھایا۔ ارد کہنے لگا لو یہ ایسا موتی ہے کہ ہزاروں روپے کا فروخت ہوگا۔ اور سوائے بادشاہ کے اور کوئی اس کی قیمت نہیں دے سکتا۔ اسے لو اور مورد کو چھوڑ دو۔

اتنے بڑے موتی کو دیکھ کر چڑیمار کو لالچ پیدا ہوا اور کہنے لگا کہ میں تو جوڑا لوں گا۔ میلڈک نے کہا اچھا تم مورد کو چھوڑ دو۔ میں اس کا جوڑا لاتا ہوں۔ چڑیمار نے مورد کو چھوڑ دیا۔ اور میلڈک نے مورد سے کہا بھئی! اب تم تو یہاں سے فوراً ہوجاؤ۔ رہ گیا چڑیمار! تو یہ ایک موتی لیتا نہیں اور میں اسے جوڑا دیتے کا نہیں۔ لہذا لینا ایک نہ دینا دو۔ تم اپنی منزل کھوٹی کیوں کرو۔ جاؤ اب کل ملیں گے۔ یہ کہا اور پانی میں غوطہ مار کر غائب ہو گیا۔ اور بھیچارا چڑیمار کف افسوس ملتا ہوا گھر کو چلا آیا۔

مایا تیرے تین نام پر سا۔ پرسو۔ پرس رام

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کہ کوئی شخص ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے دولت مند بن جائے تو لوگ اس کی دولت کے سبب اس کی عزت کرنے لگیں۔ اور اس کا نام تعظیہ سے لہنے لگیں۔ حالانکہ پہلے اس کو

اس کے معمولی نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ پرسا نام ایک معمولی غریب آدمی کسی قصبہ میں رہتا تھا۔ لوگ اسے پرسا پرسا کر کے پکارتے تھے۔ کیونکہ یہی اس کا نام تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی مالی حالت سدھرنے لگی اور وہ اچھا کھاتا پیتا شخص ہو گیا۔ اب لوگ اسے بجائے پرسا کے ذرا کچھ لحاظ کے ساتھ ”پرسو“ کہنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد اتفاق سے وہ ایک بڑا دولت مند اور امیر ہو گیا۔ اب لوگوں نے اسے تظہماً سیٹھ پرسرام کہنا شروع کیا۔ دولت کے ساتھ ساتھ ناموں کی ان تبدیلیوں کو دیکھ کر ایک شخص نے یہ فقرہ کہا اور آہستہ آہستہ ضرب الامثال بن گیا۔

ملا کی تازہی تبرک میں گئی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی چیز فصول اور بے کار خرچ ہو جائے اور جائز طریقے پر خرچ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ یہ مثل یوں شروع ہوئی کہ کوئی مولوی صاحب تھے۔ جو کسی گاؤں میں وعظ کرنے کے لیے گئے۔ اور وعظ کے بعد حسب معمول کچھ مٹھائیں ان کے سامنے بطور تبرک کے تقسیم کرنے کے لیے رکھی گئی۔ مولوی صاحب جو تبرک تقسیم کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اتفاقاً ایک بال اُن کی لمبی تازہی میں سے گرا۔ اور جاہل دیہاتیوں نے اُسے بھی تبرک جان کر فوراً خود اٹھا لیا۔ دوسروں نے دیکھا تو جھٹ ہاتھ بڑھا مولوی صاحب کی تازہی کے چند بال اُکھیڑ بطور تبرک آپس میں تقسیم کر لیے۔ اُن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی جو اب تک بیٹھے ہوئے یہ تماشا خاموشی سے دیکھ رہے تھے مولوی صاحب کی تازہی پر ہاتھ صاف کیا اور چند بال حاصل کر لئے۔ قصہ مختصر آن

کی آن میں مولوی صاحب کی ساری قارہی تبرک بن کر رہ گئی۔ اور مولوی صاحب جاہل دیہاتیوں کی اس عجیب و غریب تبرک پسندی سے پریشان ہو کر وہاں سے سر پر پیرو رکھ کر بھاگے اور گھر آکر دم لیا۔ یار لوگوں نے جو یہ لطیفہ سنا تو ان کو ایک بات ہاتھ آئی اور گھر گھر مولوی صاحب کے تبرک کا تذکرہ ہونے لگا۔ اور بعد میں یہ راتمہ بطور ضرب الامثال کے بیان کیا جانے لگا۔

موچھوں پر تاؤ دینا

یہ اگرچہ کوئی ضرب الامثال نہیں بلکہ ایک محاورہ ہے۔ لیکن چونکہ اس کے متعلق ایک قصہ بھی مشہور ہے لہذا ضرب الامثال کی ذیل میں اسے درج کیا گیا ہے۔ یہ محاورہ شیعہ باز آدمی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کوئی شیعہ صاحب تھے۔ گھر سے جو نکلے تو موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اور ایلتھتے ہوئے۔ اتفاقاً سامنے سے ایک خان صاحب بھی تشریف لارہے تھے۔ انہوں نے جو شیعہ صاحب کو موچھیں چوہائے موعے آتے دیکھا تو انہیں بڑا غصہ آیا۔ کہنے لگے سنو شیعہ صاحب! کیا تم ہی سب سے زیادہ بہادر اور شجاع ہو؟ اگر تمہیں بہادری کا کچھہ زعم ہے تو آو دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ جو جھٹے وہی اپنی موچھوں پر تاؤ دے۔ شیعہ صاحب بھی نہایت ہوشیار واقع ہوئے تھے۔ سوچنے لگے مقابلہ پر پتہاں بھائی سے در آنا مشکل ہے۔ لاو اس وقت کوئی چال چلو۔ جہت اکثر کر جواب دیا۔ خان صاحب ہم کیا تم سے کسی بات میں ہتھے ہیں؟ مگر یوں لڑنے کا لطف نہیں۔ ایک کام کرو۔ تم اپنے گھر والوں کا صفایا کر آؤ۔ اور میں اپنے بچوں اور

بھوی کو قتل کر آؤں - پھر دونوں بے فکر ہو کر لڑیں گے - آگے نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے - خان صاحب سپاہی آدمی تھے - اس چال کو نہ سمجھ اور جوش شجاعت میں کہنے لگے ”منظور“ اور یہ کہہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے - اور جاتے ہی ایک ایک کر کے سارے گھر والوں کو مار دے - فارغ ہو کر آپ باہر تشریف لائے تو شیخ صاحب بھی سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے - ان کی موچھیں اسی طرح چڑھی ہوئی تھیں - آتے ہی انہوں نے خان صاحب سے ہنس کر کہا ”خان صاحب! اچھا آپ یہ تو بتائیں کہ آپ مجھے سے کیوں ناراض ہیں؟ اور کہوں آپ کو مجھے پرخشہ آ رہا ہے“ خان صاحب نے فرمایا - وجہ ظاہر ہے - تم میرے مقابلہ پر موچھوں کو تار دیتے ہوئے گھر سے نکلے - اس سے زیادہ بڑے معاصمت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس لئے اب یا تو تم ہی دنیا میں رہو گے یا میں ہی رہوں گا - اور مقابلے پر اور نکالو اپنے ہتھیار -

شیخ صاحب نے جواب دیا - واہ خان صاحب! آپ نے اچھی کہی - کہا صرف اتنی سی بات آپ کی ناراضگی کا موجب ہوئی - لاحول ولا قوۃ - بھلا یہ بھی کرئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے اتنا جھگڑا بکھیرا کرنا پڑا - اگر آپ میری موچھیں چڑھانے سے خفا ہیں تو لیجئے میں اپنی موچھیں بھی کر لیٹا ہوں - آپ ناراض نہ ہوں - اور غصہ تھوک دیں - یہ کہہ کر جھٹ اپنی موچھیں بھی کر لیں - اور فوراً وہاں سے چل دیے - پتھان بے چارہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا کہ مقابلہ بھی نہ ہوا اور اہل و عیال بھی سارے موت کے گھاٹ اترے - مگر اب کیا ہو سکتا تھا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا - مگر اس معاملہ کا صدمہ بے چارے خان صاحب کو ہمیشہ رہا - اس وقت سے یہ متاورہ استعمال ہونے لگا -

نہازی کا ٹکا

یہ ضرب الامثال ایسے وقت میں بولتے ہیں جب کہ یہ ظاہر کرنا ہو کہ فلاں کام کی جزا کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بہانہ کی جاتی ہے کہ کوئی لڑکا تھا بڑا شریر اور چالاک - اس کو یہ ایک بری عادت پڑی کہ مسجد میں جب لوگ سجدہ میں جاتے تو ان کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیتا - ایک مرتبہ جو ایک شخص کی ٹانگیں اس نے پکڑ کر گھسیٹیں تو اس نے بڑی نرمی اور شفقت سے اسے پاس بلایا - اور ایک ٹکا جھب میں سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا لو میاں صاحبزادے اس کی دیوڑیاں کھانا ٹکا پا کر لڑکا بڑا خوش ہوا - اور خیال کرنے لگا کہ اس آدمی نے دُر کر مجھے یہ ٹکا دیا ہے تاکہ میں پھر کبھی اس کی ٹانگیں نہ کھینچوں - یہ تو بڑا اچھا روزگار ہے - اگر لوگ اسی طرح دُر کر مجھے روزانہ ٹکے دیا کریں تو پھر تو قسمت میں چپن ہی چپن لکھا ہے - روزمرہ دیوڑیاں کھانے میں آیا کریں گی - چنانچہ اسی اُمید میں اس نے پہلے سے بھی زیادہ مستعدی کے ساتھ یہ فرض انجام دینا شروع کیا - مگر اس نہازی نے دراصل یہ ٹکا اس کو اس غرض سے دیا تھا کہ ٹکے کے لالچ میں جب یہ لڑکا اسی طرح لوگوں کی ٹانگیں کھینچا کرے گا تو کبھی نہ کبھی کوئی ایسا آدمی بھی نکل آئے گا جو اس کو اس کثرت کی پوری پوری سزا دے دے گا - حسب اُمید لڑکے نے ایسا ہی کیا - اتنا تا ایک روز کوئی اجنبی پتھان صاحب بھی نماز پڑھنے مسجد میں آگئے - لڑکے نے حسب معمول ان کی بھی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں اور اُمید کی کہ شاید یہ بھی مجھے ٹکا دے - پتھان صاحب کو جو قصہ آیا تو انہوں نے ایک دو ہتھوڑا ایسا رسید کیا کہ سارا کھایا پیا مذہ کے راستے نکل گیا - اور خون کی تہ جاری ہو گئی - لوگ اسے

کردیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی محنت مشقت اٹھا کر اور اپنا پیٹ
کات کر ایک روپیہ ذرا ذرا سا کر کے روزانہ اخراجات مہیں سے بچایا۔ اور
پورے سو روپے کر دیے جب سو روپے ہو گئے تو اب دونوں میاں بیوی کو
خیال آیا کہ اگر یہ دو سو روپے ہو جائیں تب تو ہم خاصے امیر آدمی
ہو جائیں گے۔ یہ خیال کر کے دونوں نے پور گھر کے اخراجات میں کٹر بیہوش
کرنی شروع کی۔ اور پہلے سے زیادہ کنایت شعار کی معنی بلکہ کلجوسی
کے ساتھ خرچ کرنا شروع کیا۔ گھر کا آرام راحت اور خوشی اس خط
میں سب جاتی رہی۔ اور ہر وقت یہی دہن انہیں لگ گئی کہ کسی طرح یہ
رقم دو سو روپے تک پہنچ جائے۔ کسی شخص نے جو اس مصیبت میں ان
کو دیکھا تو ان کے حسب حال یہ فقرہ کہا اور چونکہ بالکل موزوں تھا بطور
فرب المثل استعمال ہونے لگا۔

— * —

واہ پیر علیا! پکاٹی تھی کھیر۔ ہو گیا دلہا

کسی کام کے بری طرح سے بگڑ جانے کے موقع پر یہ مثل بولا کرتے ہیں۔ اس کے
متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ علیا نامی کوئی پیر صاحب تھے۔ انہوں نے ایک
بڑھیا سے پوچھا کہ بڑی بی کیا پکا رہی ہو۔ بڑھیا نے کھیر چڑھا رکھی تھی
خیال کرنے لگی۔ ان سے کہا کہ کھیر ہے تو ساری چت کر جائیں گے اور مجھ
کچھ بھی نہ بچے گی۔ کہنے لگی۔ پیر جی صاحب! تھوڑا سا دلہا پکا رہی ہوں
اور تو کچھ نہیں۔ خیر پیر جی صاحب خاموش ہو کر چلے گئے تھوڑی دیر میں
بڑھیا نے جو چہنی اتار کر دلتیا کو دیکھا تو واقعی دلہا ہی کھدرد بذر
پک رہا تھا۔ بڑھیا نے دلہا دیکھ کر اپنا سر پیت لیا۔ اور کہنے لگی۔
واہ پیر علیا! پکاٹی تھی کھیر ہو گیا دلہا۔ اب کیا کروں پیر جی کی بد دعا لگ گئی۔

وہ پانی ملتان گیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی شخص سے یہ کہنا ہو کہ تم نے غفلت اور سستی میں وقت گزار دیا۔ اور اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کہاوٹ کا ماخذ یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ بلارس میں کوئی چنار رئیداس نام رہتا تھا مگر تھا ایشور کا بڑا بھگت۔ اور دور دور اپنے زہد و تقدس کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک روز گوردکھ ناتھ نامی ایک بڑے مہاتما اُس سے ملنے کے لیے آئے۔ اس کے ہاں پہنچتے ہی ان کو ایسی پیاس لگی کہ جان بے چین ہو گئی۔ انہوں نے رئیداس سے کہا ذرا سا پانی پلاؤ۔ رئیداس فوراً اُٹھا اور ایک مٹی کے پیالہ میں پانی لا کر گوردکھ ناتھ کے سامنے رکھ دیا۔ اس وقت گوردکھ ناتھ مہاتما کو خیال آیا کہ اوہو یہ تو چنار ہے۔ اس کے ہاں کا پانی کس طرح پاک ہو سکتا ہے۔ خیر جب وہ پانی لایا تو انہوں نے کہا بھئی میری چھاگل میں قال دو اور آپ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُٹھ کر اور چھاگل لے کر چلے آئے۔ اس کے بعد کبیر صاحب کے ہاں پہنچے۔ چھاگل رکھ دی اور کبیر صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں کبیر صاحب کی لڑکی آئی۔ پانی رکھا تھا۔ اسے جو پیاس لگی تو غٹ غٹ سارا چڑھا گئی۔ پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ لڑکی پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اور زمین و آسمان کا سب پوشیدہ حال اس پر ظاہر ہو گیا۔ جب گوردکھ ناتھ پر یہ حال کھلا تو وہ بہت ہی پچھتائے کہ وہ پانی میں نے کیوں نہ پی لیا۔ بھاگے بھاگے پھر رئیداس کے ہاں گئے۔ اور چھوڑتے ہی اس سے کہنے لگے۔ میاں ذرا سا پانی تو پلاؤ۔ وہ اپنے علم کے زور سے سارے حالی سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ کہنے لگا گوردکھ ناتھ مہاراج! وہ

پانی ملتان گیا۔ بات یہ تھی کہ بعد میں وہ لڑکی جس نے پانی پیا تھا اپنی سسرال روانہ ہو چکی تھی۔ جو ملتان میں تھی۔ اسی وجہ سے دھنداس نے کہا کہ وہ پانی ملتان گیا۔ گورکھ ناتھ نے چارے سمجھ گئے کہ اب پھر پانی کا ملنا محال ہے۔ لہذا افسوس کرتے ہوئے گھر کو چلے آئے۔

وہی سرغے کی ایک ٹانگ

یعنی کسی بیجا اور نا واجب بات کے صحیح اور درست ہونے پر اصرار کرنا۔ اپنی ضد پر اڑے رہنا۔ اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کسی صاحب بہادر کا ایک خان ساماں تھا نہایت چالاک۔ ایک مرتبہ صاحب نے اس سے کہا کہ رات کے کھانے کے لیے ایک مرغ پکاؤ۔ چنانچہ خان ساماں نے ایک نہایت ذربہ مرغ کا سالن تیار کیا۔ اور نصف سالن اور ایک ٹانگ خود چمت کی۔ صاحب کے سامنے جس وقت ایک ہی ٹانگ آئی تو انہوں نے خان ساماں کو بلایا اور پوچھا کہ مرغ کی ایک ٹانگ کھا ہوئی؟ بغیر ایک لحظہ تامل کیے ہوئے خان ساماں نے برجستہ جواب دیا کہ حضور! یہ بڑا اصول اور نہایت اعلیٰ نسل کا مرغ تھا جو میں حضور کے لیے بڑی تلاش سے بہت قیمت دے کر لایا تھا۔ اس نسل کے مرغوں کی اور خصوصیات کے علاوہ ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ صرف ایک ٹانگ کے ہوتے ہیں۔ صاحب عقلمند تھے۔ سوچا کہ خان ساماں جو تھیں سمیت آنکھوں میں ہرنا چاہتا ہے۔ ہڈس کر چھیکے ہو گئے۔ دو تین روز کے بعد اتفاقاً صاحب کہیں جا رہے تھے۔ خان ساماں ساتھ تھا۔ کہ راستے میں ایک مرغ ایسا ایک پاؤں پروں میں چوہائے کھوا تھا۔ خان ساماں نے دیکھتے ہی

جہت صاحب کو ادھر متوجہ کیا - اور کہنے لگا دیکھئے حضور یہ مرغا بھی اسی نسل کا ہے جو آپ نے پرسوں کھایا تھا - اس کے بھی ایک ہی ٹانگ ہے اور اس کے بھی ایک ہی ٹانگ تھی - صاحب نے مسکراتے ہوئے تالی بجا کر جو ہش کی تو فوراً مرغا چوکنٹا ہو کر دونوں ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا - صاحب نے خانساماں کی طرف دیکھا - خانساماں بڑا ہی ہوشیار اور حاضر جواب تھا - فوراً بول اٹھا - آج تو حضور نے کمال کر دیا جیسے تالی بجا کر یہاں حضور نے مرغے کی دونوں ٹانگیں پیدا کر دیں ایسا ہی حضور نے کھانے پر اس روز تالی نہ بجائی - نہیں تو وہاں بھی فوراً دوسری ٹانگ موجود ہو جاتی - صاحب کو اس کے اس برجستہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور قصہ آیا گیا ہوا - اس وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا -

ہنوز دہلی دور است

اس فارسی ضرب المثل کے معنی ہیں ”ابھی دلی دور ہے“ یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ کام کے بننے اور مقصد کے حاصل ہونے میں ابھی بہت دیر لگے گی - اور منزل مقصود ابھی کوسوں دور ہے - یہ اگرچہ فارسی کی کہاوت ہے مگر اردو میں بہ کثرت مستعمل ہے - اور اسی لئے ہم اسے یہاں لکھتے ہیں - خوش قسمتی سے یہ مثل ایسی ہے کہ اُس کی ابتدا کے متعلق تاریخ کے روشن صفحات ہماری پوری پوری دہنائی کرتے ہیں اور ہمیں صحیح اور یقینی طور پر اُس کے ماخذ کا پتہ معلوم ہے - تفصیل حسب ذیل ہے :-

خسرو خان نامی ایک نوجوان شخص نے سنہ ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۱۳ ع

میں قطب الدین مبارک شاہ پادشاہ دہلی کو قتل کر کے دارالسلطنت پر قبضہ جمایا۔ اور ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اس شکر میں اس نے دہلی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور زہاد اور صوفیاء عظام تھے سب کو معقول ہدیہ اور نذرانے بھیجے۔ اور تمام مشائخ دہلی کے سرتاج حضرت شاہ نظام الدین اولیاء محبوب الہی کے حضور میں بھی پانچ لاکھ تلکے پیش کئے۔ اُس دربار میں شاہی نذرانے کی کیا وقعت ہونی تھی۔ فوراً حضور نے تمام رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم فرما دی اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔

زمانہ کی بساط القی اور خسرو خاں نے صرف چار ماہ حکومت کے مزے لوٹے تھے کہ اس کو بھی وہی دن دیکھنا نصیب ہوا جو اس نے قطب الدین کو دکھایا تھا۔ یعنی غیاث الدین تغلق کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور اب غیاث الدین دہلی کا بادشاہ تھا۔

بادشاہ ہوتے ہی اس نے تمام مشائخ دہلی کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ جس جس شخص کو خسرو خاں نے ہدیہ اور نذرانے پیش کیے تھے سب واپس لا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ کہوں کہ یہ خسرو خاں کا اپنا مال نہیں تھا۔ بلکہ شاہی خزانہ جو سلطنت کی چیز تھی بے دریغ لٹایا گیا تھا۔ پس جو اشخاص رقمیں واپس پیش نہ کریں گے۔ قسب سلطانی کے مورد بنیں گے۔ چنانچہ مارے خوف کے تمام بزرگوں نے فوراً بلا توقف رقمیں شاہی قاصدوں کے حوالے کیں۔ اور جنہوں نے رقمیں واپس کرنے میں ذرا بھی تامل کیا۔ انہیں سخت تکلیفیں دی گئیں۔ جب شاہی قاصد حضرت سلطان الاولیاء کے حضور میں پہنچا اور فرمان سلطانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ بھئی مہری طرف سے کہہ دینا کہ

روپیہ تو خرچ کرنے اور غریبوں کی امداد کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ نہ کہ چرونے اور حفاظت سے رکھ چھوڑنے کے لئے۔ میں نے تو اسی وقت تمام روپیہ ضرورت مندوں اور مساکین میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب میرے پاس روپیہ کہاں جو میں دے دوں۔

فہات الدین کو اس صاف جواب پر قصہ تو بہت آیا مگر حضرت سلطان المشائخ کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ بادشاہ ان کو گرفتار کرانے یا کسی سزا کے دیئے کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً چپ ہو رہا۔ کینہ توز اور بد باطن اراکین دولت نے جب دیکھا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ سے ناراض ہے تو انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ حضرت کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت محبوب الہی کے خلاف بہت سے اتہامات تراشے اور انہیں خوب نمک مرچ لگا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ حضور وہاں تو ہر وقت محفل سماع منعقد دھتی ہے جو بالکل خلاف شرع اور بدعت ہے۔ فوراً علمائے کرام سے اس کے متعلق استفسار کیا جائے کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہئے جو یوں علانیہ شریعت کی ہتک کرے۔ فرشتہ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

”جمعہ کہ باشیخ عداوت و حسد داشتند و ملکر سماع بودند۔ فرصت یافتہ بہ عرض رسانیدند کہ این شیخ یا جمیع مریدان خود ہر از سماع گارے ندارد و سرود کہ در مذہب حنفی حرام است۔ می شنود۔ پس بادشاہ را واجب است کہ علماء را طلبہ محضرے سازد و او را از ان فعل نامشروع نہی نماید۔“

کتاب سیر الاولیاء کے صفحات ۵۲۰-۵۲۷ پر یہ واقعہ نہایت تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ اور اس میں ان تمام کھیلہ خصلت لوگوں کے نام بھی گناے گئے ہیں جو اس شیطانی ذہل میں شامل تھے۔ چنانچہ علماء نے حسب معمول بڑے ذوق و شوق سے حضرت سلطان الاولیاء کے خلاف کفر اور فسق کے فتوے دے دیے اور اپنے نزدیک ہوی خدمت اسلام انجام دی۔ نتیجتاً یہ ہوا کہ علماء عصر اور حضرت محبوب الہی کے درمیان دربار سلطانی میں ایک زبردست مباحثہ ہوا۔ جس میں علماء کو شکست کی ذلت نصیب ہوئی۔ اور حضرت شیخ واپس گھر چلے آئے۔ اور اس طرح یہ قضیہ نامرئیہ بہ ظاہر ختم ہو گیا۔ مگر بادشاہ کے دل میں دشمنی اور کاوش پیدا ہو گئی۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بادشاہ کو بلکالہ کی مہم پیش آگئی۔ اور وہ وہاں چلا گیا۔ مہم کو سر کرنے کے بعد جب وہاں سے واپس دار السلطنت کی طرف لوٹا تو راستہ ہی میں سے حضرت سلطان الاولیاء کو فرمان بھیجا کہ ہم واپس پایہ تخت کو آ رہے ہیں۔ اگر اپنی خبر چاہتے ہو تو فوراً دہلی کو خالی کر دو۔ اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔ میرے داخلہ دہلی کے وقت اگر تم وہیں ہوئے اور وہاں سے چلے نہ گئے تو پھر تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

حضرت شیخ کے پاس جس وقت یہ فرمان شاہی پہنچا تو آپ پڑھ کر ہلے اور صرف اتنا فرمایا کہ ”ہنوز دہلی دور است“ یعنی بادشاہ نے جو لکھا تھا کہ میں دہلی آ رہا ہوں۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ابھی دہلی بہت دور ہے۔ حضرت محبوب الہی کے منہ سے اس فقرہ کا نکلنا تھا کہ معاً سارے شہر میں مشہور ہو گیا۔ اب سنئے کہ شہنشاہ بڑے شان و شوکت اور تزک و احتشام سے منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا نہایت اطمینان سے دار السلطنت کو واپس آ رہا تھا۔

اور خیال کر رہا تھا کہ نظام الدین کی کیا مجال ہے جو میرے اس قلعہ کو حکم سے ذرا سرتابی کر سکے۔ اور یقیناً میرے داخلہ دہلی سے پہلے دہلی اُس کے وجود سے پاک ہو جائے گی۔ اُدھر بادشاہ کی واپسی کی خبر ملتے ہی دارالخلافہ میں اُسکے شاندار استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں اور تمام شہر دلہن کی طرح سجایا جانے لگا۔ قرار یہ پایا کہ شہر کے تمام معززین اور بادشاہ کے اراکین دربار شہر سے باہر تین کوس پر جا کر شہنشاہ کا استقبال کریں۔ جہاں ایک رفیع الشان محل اس غرض سے تعمیر کیا جائے کہ بادشاہ آن کر اُس میں قیام فرمائیں۔ اور کچھ عرصہ وہاں اپنی تکان دور فرما کر پھر دارالسلطنت میں داخل ہوں۔ غرض ولیمہد نے نہایت سرعت کے ساتھ محل تیار کروایا۔ اور اُسے ہر قسم کے سامان آرائش سے آراستہ کیا۔ جس وقت بادشاہ کے آنے کی خبر ہوئی ایک بڑا جم غفیر معزز لوگوں اور درباری آدمیوں کا بادشاہ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلا اور اُسی قصر میں سب نے اپنی نذرین بادشاہ کے حضور میں پیش کیں۔ ولیمہد نے ایک نہایت پر تکلف دعوت بادشاہ اور تمام حاضرین کی کی۔ لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے اور بادشاہ نے ابھی ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے کہ قہر الہی بجلی بن کر گرا۔ اور بادشاہ کے ساتھ چند اور امرا کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ معاً تمام حاضرین کو ”ہنوز دہلی دور است“ کا الہامی فقرہ یاد آیا۔ اور سب نے نہایت صاف طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بادشاہ کے لئے دہلی صرف تین کوس کے فاصلے پر ہونے کے باوجود کس قدر دور ہے اور ہمیشہ دور ہی رہے گی۔ سب نے حیرت اور تعجب کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اب وہاں ہر شخص کی زبان پر

”ہنوڑ دہلی دور است“ کا جملہ تھا - جس کو دہراتے ہوئے وہ لوگ افسوس کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے - اُسی وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا - چنانچہ عبدالقادر بدایونی اپنی تاریخ کی جلد اول کے صفحہ ۲۲۵ پر لکھتا ہے :-

”مردم چوں دانستہ بودند کہ سلطان بہ سرعت سوار می شود - دست ناشستہ ازاں خانہ بر آمدند - و سلطان بہ تقریب دست شستن از آن خانہ بر نہا مدت دست از حیات شست و قصر بر سر او افتاد سلطان غیاث الدین تغلق با سلطان المشائخ چوں سوء مزاج داشت از راہ لکھنؤ پیغام بہ شیخ فرستاد کہ بعد ازاں کہ من بہ دہلی رسم یا شہخ آں جا باشد یا من - شیخ فرمود ”ہنوڑ دہلی دور است“ وایں سخن ازاں دور ضرب المثل کشتہ شہرت یافت -

دیکھا سلطان وقت نے سلطان المشائخ سے مقابلہ کا انجام! کیا اچھا کہا ہے :-

جو خدا کا ہے اُسے لکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شہروں پر نہ ڈال اے دوبہ زار و نزار

یک من عام را دہ من عقل باید

مطلب یہ ہے کہ محض علم فائدہ مند نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ انسان میں عقل بھی نہ ہو - اردو میں اس مثل کا لفظی ترجمہ بھی بطور ضرب المثل کے مستعمل ہے یعنی ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہئے - اس مثل کی ابتداء کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی

بادشاہ نے اپنے لڑکے کو ایک بڑے ماهر نجومی اور جنار کے حوالے کیا اور کہا کہ اے خوب اچھی طرح نجوم اور جنر کی تعلیم دو خیر پانچ چھ سال کے بعد نجومی نے ایک روز بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ میں نے شہزادہ کو نجوم میں کامل کر دیا ہے اور جو کچھ مجھے آتا تھا سب کچھ اُسے بتا دیا ہے۔ بادشاہ نے ایک تاریخ شہزادہ کے امتحان لینے کی مقرر کی۔ بڑی شان سے دربار آراستہ کیا اور نجومی کو اپنے براہِ بر تخت پر بٹھایا۔ خیر اب امتحان شروع ہوا۔ بادشاہ نے ایک سونے کی انگوٹھی اپنی مٹھی میں دبا کر شہزادہ سے پوچھا۔ بتاؤ! میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ شہزادہ نے تھوڑی دیر کچھ حساب لگا کر جواب دیا ”والا حضرت کے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز ہے جو بیچ میں سے خالی ہے“۔ بات ٹھیک تھی۔ ظاہر ہے کہ انگوٹھی کا چھل بیچ میں سے خالی ہوتا ہے۔ بادشاہ اُس کی مہارت علم پر بڑا خوش ہوا۔ اور کہنے لگا ”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا بتاؤ وہ کیا چیز“۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہ آخر ایسی کونسی چیز ہوسکتی ہے جو درمیان میں سے خالی ہو شہزادے نے جواب دیا جناب! مرے خیال میں تو غالباً آپ کی مٹھی میں چکی کا پات ہوگا“۔ اس عجیب و غریب جواب پر سب ارا کون دربار حیران رہ گئے اور اُس کی عقل پر فلسفے لگے۔ بادشاہ نے شہزادہ کے استاد کی طرف تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ استاد نے دست بستہ عرض کیا کہ ”حضور! جہاں تک علم کا تعلق تھا وہاں تک تو میری تعلیم کے مطابق اُس نے ٹھیک جواب دیا مگر آگے علم نہیں بلکہ عقل کی ضرورت ہے۔ اور یہ میں کہاں سے لاؤں جو اُسے پوچھاؤں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یک من علم را دہ من عقل باید۔ بغیر عقل کے علم بالکل بے کار ہے۔ علم سے اُس نے اتنا تو

بتا دیا کہ مٹھی میں کس قسم کی چیز ہے ۔ مگر اتنی سمجھہ اس میں نہ تھی کہ سوچ سکتا کہ چکی کا پات مٹھی میں کس طرح بند ہو سکتا ہے ۔ تو بس حضور اس میں میرا کیا قصور ۔

یک نہ شد دو شد

یہ مثل وہاں بولتے ہیں جہاں کسی نئی اور عجیب بات یا واقعہ کے بعد دوسرا ویسا ہی واقعہ ظہور پذیر ہو ۔ اس مثل کے متعلق جو حکایت مشہور ہے بڑی دلچسپ ہے ۔ کہتے ہیں کہ ایک کفن چور کو کوئی ایسا ملنگر یاد تھا کہ جب وہ کسی تازہ قبر پر جا کر اُسے پوچھتا تو مردہ کفن سمیت باہر نکل آتا ۔ یہ کفن لے لیتا ۔ اور دوسرا ملنگر پوچھتا ۔ تو مردہ بدستور قبر میں واپس چلا جاتا ۔ اور یہ بازار میں کفن کے کوزے کرتا ۔ یہی اُس کا ذریعہ معاش تھا ۔ کسی طرح ایک اور صاحب کو بھی جو بد قسمتی سے تلاش معاش میں سرگرداں تھے ۔ ان حضرت کی اس کربوت کا پتہ لگ گیا ۔ مصلحت سے بچنا اور حرام خوری کی عادت کچھ آج سے نہیں قدیم سے چلی آتی ہے ۔ ان صاحب نے سوچا کہ چلو اس کفن کھسوت کی شاگردی اختیار کریں ۔ اگر یہ فن آگیا تو پھر ساری عمر چھن ہی چھن ہے ۔ کم از کم ایک کفن بھی روز حاصل ہوا تو روٹی کی طرف سے تو بے فکری ہو جائے گی ۔ یہ خیال کرتے ہی آپ فوراً اُس کے پاس پہنچے ۔ اور ملت سناجت کے بعد اس کے شاگرد بن گئے ۔ مدتوں اُس کی جوتھان سیدھی کیں ۔ مگر اُس نے یہ ”پاک عمل“ ایسے شاگرد رشید کو نہیں

بتایا - جب مرنے لگا تو شاگرد نے کہا اُستاد! اب مرتے ہو اور اُس عمل کو اپنے ساتھ لئے جاتے ہو - اب تو بتا دو - اُستاد نے کچھ سوچ کر وہ عمل بتا دیا - جس سے تازہ مردہ قبر میں سے باہر آجاتا تھا - مگر وہ مقرر نہ بتایا جس سے مردہ واپس قبر میں چلا جائے - نہ ہی ان حضرت کو اپنی کامیابی کی خوشی میں اس کے پوچھنے کا کچھ خیال آیا - خیر تھوڑی دیر کے بعد اُستاد کا انتقال ہو گیا - اور شاگرد صاحب عمل کی صداقت آزمانے کو خوشی خوشی قبرستان پہنچے - اور ایک تازہ قبر پر کھڑے ہو کر وہی عمل پڑھا - معاً مردہ قبر میں سے نکل آیا اور کفن ان کے حوالے کیا - انہوں نے کہا - بس بھائی! تیرا شکریہ - جا تو اب واپس جا - لیکن مردہ کھڑا رہا اور تیس سے مس نہ ہوا - اُس وقت اُن کو خیال آیا کہ ارہو میں اُستاد سے وہ عمل تو پوچھنا بھول ہی گیا - جس سے مردہ دو بارہ واپس قبر میں چلا جاتا ہے - بڑے شش و پنج میں ہوئے اور سوچنے لگے یہ تو بڑی مشکل ہوئی اب کیا کرنا چاہئے - آخر سوچتے سوچتے یہ تدبیر ذہن میں آئی کہ چل کر اُستاد سے پوچھنا چاہئے - واپس ہونے کے لئے مڑے ہی تھے کہ مردہ بھی ساتھ چل پڑا - انہوں نے ہر چند اُسے روکنا چاہا - مگر وہ بھلا کہوں دکنے لگا تھا - آخر یہ اُسی حالت میں اُستاد کی قبر پر پہنچے اور وہی عمل پڑھا - معاً اُستاد کا مردہ پاہر آگیا - اور کفن اتار کر ان کے حوالے کیا - انہوں نے کہا - اُستاد! میں کفن لہلے نہیں آیا - مشکل میں پھنس گیا ہوں - مہری مدد کھجئے - اور اس مہیبت سے نجات دیجئے - مگر اُستاد صاحب خاموش کھڑے رہے - اور کچھ جواب نہ دیا اُس وقت شاگرد کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ ”یک نہ شد دو شد“ یعنی

ایک تو ساتھ تھا ہی - یہ دوسرا اور گلے پڑا —

— * —

یہ تو بڑی تیز ہی کھیر ہے

یہ مثل ایسے کام کے لئے بولا کرتے ہیں جس کے کرنے میں مشکلات اور دقتیں ہوں اور جو آسانی کے ساتھ بلتا نظر نہ آئے - یہ مقولہ سب سے پہلے کس شخص کے منہ سے نکلا اس کے متعلق یہ قصہ ادب کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک نابینا فقیر سے جو جلم کا اندھا تھا کسی نے پوچھا کہ بڑے میاں کھیر کھاؤ گے؟ فقیر بیچارے نے کھیر کھانی تو درگزار آج تک اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا - کہلے لگا ”بابا! کھیر کھسی ہوتی ہے اُس نے جواب دیا ”بالکل سفید ہوتی ہے“ فقیر کی سمجھ میں اب بھی خاک نہ آیا - کیونکہ اس نے سفید رنگ بھی کبھی نہیں دیکھا تھا - ناچار کہلے لگا ”بابا! میں تو سفید بھی نہیں جانتا کہ کیسا ہوتا ہے؟ ذرا مجھے سمجھاؤ تو سہی - اب اس شخص نے کہا کہ ”بڑے میاں! سفید رنگ کو ایسا سمجھو جیسا کہ بگلے کا پر“ - بھلا اندھا کیا سمجھتا کہ بگلا کس رنگ کا اور کیسا ہوتا ہے؟ مجبوراً اُس نے پھر پوچھا ”میاں! میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے؟ اب وہ شخص سوچنے لگا کہ میں اسے کس طرح بتاؤں کہ بگلا کیسا ہوتا ہے؟ خبر کچھ سوچنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ کو تیز ہا کیا اور بگلے کی کچھ شکل سی بنا کر کہلے لگا کہ دیکھو بگلا ایسا ہوتا ہے“ - فقیر نے اس کے ہاتھ کو خوب اچھی طرح تٹول کر دیکھا اور پھر کہلے لگا ”بابا! یہ تو بڑی تیز ہی کھیر ہے - مجھ سے تو نہیں کھائی جائے گی“ -

— * —

یہ منہ اور مسور کی دال

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں طنز کے طور پر کسی شخص کے متعلق یہ بات ظاہر کرنی ہو کہ وہ اس کام کے لائق نہیں - یا یہ بات اُس کی طاقت اور ہمت سے بالاتر ہے - مندرجہ ذیل واقعہ ممکن ہے کہ اس مثل کی شاید اصلی وجہ تسمیہ نہ ہو لیکن قصہ چونکہ سچا اور دلچسپ ہے لہذا ہدیہ ناظرین ہے :-

جب اودہ کے شاہی خاندان پر انقلاب آیا اور 'جد علی شاہ' متہوا ہوچ کلکتہ میں نظر بند کر دیے گئے تو محلات کے ہزار ہا ملازمین تعزیر ہو گئے - جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا - انہی میں ایک شاہی باورچی منو مہاں نامی بھی تھا - جس کے متعلق صرف یہ خدمت تھی کہ وہ مسور کی دال پکایا کرے اور بس اس خدمت کا معاوضہ اسے سو روپے ماہوار ملتا تھا - خبر بیچارہ باورچی تلاش معاش میں در بدر پھرتا رہا - اور پھرتا پھرتا بتالہ پہنچا - جو پنجاب ضلع گورداسپور کا مشہور قصبہ ہے - یہاں ایک سیٹھ صاحب سودا رہاگ سنگھ نام رہتے تھے - جن کی امارت کے سارے قرب و جوار میں چرچے تھے - باورچی ان کی خدمت میں پیش ہوا اور نوکری کی درخواست کی - سیٹھ صاحب نے پوچھا بھئی بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ باورچی نے ساری داستان الم بیان کی اور کہا کہ حضور کا نام سن کر در دولت پر حاضر ہوا ہوں کہ شاید روٹی کا تھکانا حضور کی بدولت ہو جائے اور زندگی کے باقی دن اطمینان سے حضور کے زیر سایہ کت جائیں -

اگرچہ منو مہاں تلاش معاش میں لکھنؤ سے نکلے تھے مگر تھے اس شان سے کہ ایک اچھے خاصے رئیس معلوم ہوتے تھے اور کبھی معلوم نہ ہوتے

آخر شاہی باورچی تھے - جسم پر ایک نہایت سفید اچکن - پاؤں میں کامدار جوتا - ایک تویٹہ کلدھے بر پڑا ہوا - ہاتھ میں ایک چھری - سیٹھ صاحب نے اُن کی یہ نوابی شان دیکھی اور مسکرا کر کہا اچھا تو آپ شاہی باورچی ہیں - مہومیہاں نے جواب دیا - ہاں حضور برسوں اس سرکار کا نیک کھایا اور عیش اڑایا ہے - اب جس وقت وہ زمانہ یاد آتا ہے تو کلیچہ پر سانپ سا لوث جاتا ہے -

سیٹھ صاحب نے کہا - شاہی مطبخ میں تمہارے سپرد کیا خدمت تھی؟ مہومیہاں نے جواب دیا کہ حضور! میں صرف مسور کی دال تیار کرنے پر ملازم تھا - اور کوئی خدمت میرے سپرد نہ تھی - سیٹھ صاحب نے کہا - تب تو مسور کی دال تم نہایت اعلیٰ درجہ کی پکاتے ہو گے - مہومیہاں نے جواب دیا - حضور ارشاد فرمائیں تو نموناً ذرا سی بنا کر دکھاؤں - سیٹھ صاحب نے کہا ”بھشک“! اور یہ کہہ کر ملازم کو آواز دی - اور اسے حکم دیا کہ دیکھو مہومیہاں کو جس جس چیز کی ضرورت ہو وہ ان کو لادو - اور باورچی خانہ ان کو بتادو - یہ مسور کی دال تیار کریں گے - اتنا کہہ کر سیٹھ صاحب اپنے کام میں مصروف ہو گئے - اور مہومیہاں اپنے کام میں -

کھانے کا وقت آیا تو دسترخوان پر منجملہ اور چھڑوں کے ایک چھوٹی سی طشتری میں مسور کی دال بھی موجود تھی مگر اتنی خوشبو دار کہ سارا دسترخوان مہک رہا تھا - سیٹھ صاحب نے تو کھانے میں ایسی خوشبو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی بہت ہی شوق کے ساتھ سب سے پہلے اسے ہی کھانا شروع کیا - روٹی کا پہلا ہی نوالہ منہ میں گھا تھا کہ حلق تک معطر ہو گیا - ان کے وہم میں بھی کبھی

یہ بات نہیں گذری تھی کہ دال بھی اس قدر نفیس اور ایسی لذیذ ہو سکتی ہے۔ منو میاں کی بے حد تعریف کی۔ سارے کھانوں کو چھوڑ دیا اور نہایت مزے لے لے کر دال کھانی شروع کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ منو میاں کی تعریف بھی ہر نوالہ پر کرتے جاتے تھے۔ جو اس وقت سامنے ہی کھڑے تھے کھاتے کھاتے کچھ خیال آیا اور کہنے لگے کہ ”منو میاں! دال تو تم نے آج ایسی کھلائی ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں کھائی تھی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس طشتری پر لاکٹ کیا آئی؟ منو میاں نے بڑی ہی لاپرواہی سے جواب دیا کہ حضور! زیادہ لاکٹ نہیں لگی۔ ایک پائی کی دال تھی اور اُس پر صرف چونتیس روپے خرچ کے آئے ہیں۔ چونتیس روپے کا نام سلتے ہی سردار بھاگ سلگہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور انہوں نے بہت ہی گھبرا کر کہا ”ہیں کیا کہا؟ چونتیس روپے۔ اس قدر خرچ اور صرف ایک پائی کی دال پر!! تم نے بھی غصہ کر دیا!!!“ —

چونتیس روپے کا لفظ منو میاں کے لئے تو نہایت معمولی تھا کیونکہ انہوں نے تو وہ سرکار دیکھی تھی جہاں ہزاروں روپے کی بھی کچھ قیمت نہیں تھی اور سینکڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی کسی نے نہیں پوچھا کہ کتنا خرچ ہوا؟ انہیں کھا اندازہ ہو سکتا تھا کہ چونتیس روپے کے لفظ نے بھیچارے بھاگ سلگہ کے ساتھ کس قدر روح فرسا برتاؤ کیا۔ اور صرف دال کی ایک طشتری کی تھاری پر چونتیس روپے کا نام سن کر اُس کی کیا حالت ہوئی۔ اندازہ ہونا تو درگزار۔ وہ تو ان الفاظ کو بوی برداشت نہیں کر سکے جو سردار صاحب نے بڑی گہراہٹ میں کہے تھے۔ انہیں اس وقت اپنے آپ پر بڑا غصہ آ رہا تھا کہ ایک بخشل اور کمجوس کے ہاں آکر ناحق ذلیل ہوا۔ نہ اس کو چیز کی قدر ہے

اور نہ اس نے کبھی آنکھ کھول کر شاہی کھانوں کی بوسونگھی ہے -
 بلدر کیا جانے ادرک کا سواد - اور شیخ کیا جانے صابن کا بھاڑ - یہ
 خیال آنا تھا کہ منو مہاں کو یار اے ضبط باقی نہ رہا اور قصہ سے بیتاب
 ہو کر انہوں نے فوراً چٹب میں سے چونکتےس روپے نکال سیٹھ صاحب کے آگے
 پھینک دیے اور کہنے لگے ”لو - انہیں پھر تمہارا کلہجہ پہٹا پڑتا تھا -
 اب تو تھنڈک پڑ گئی ہو گی - تمہاری حیثیت مسور کی دال کھانے کی
 ہر گز نہیں ہے - یہ منہ اور مسور کی دال“ —

یہ کہہ کر بغیر جواب کا انتظار کئے ہوئے منو مہاں سیٹھ صاحب
 کے مکان سے فوراً باہر نکل آئے - اور پھر کبھی بھول کر بھی ادھر کا
 رخ نہیں کیا —



قاضی نذرا لاسلام کی تین نظموں کے ترجمے

(قاضی نذرا لاسلام بنگال کے پرجوش اور انقلابی شاعر ہیں ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے اس کا جوہر اور زور ایک تلامذہ خیز طوفان کے مشابہ ہے جو بدش اوقات کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اس کے کلام میں ایک آگ بھڑی ہوئی ہے جس کے سامنے عامیانه خیالات اور ہماری شاعری کے معمولی مضامین گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اختر حسین صاحب رائے پوری، سہتیہ لنگار، بی اے کے بہت مہلک ہیں کہ انہوں نے اردو خواں اصحاب کے لئے بنگالی زبان سے ان کی تین نظموں کا ترجمہ عنایت فرمایا ہے۔ شعر کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے بلکہ بدش اوقات محال ہوتا ہے۔ لیکن لائق مترجم نے بڑی کاوش اور خوبی سے ترجمہ کیا ہے جس میں اصل کی بہت کچھ قوت پائی جاتی ہے اور شاعر کا اصل رنگ پھیکا نہیں ہونے پایا ہے۔

(ادیٹر)

صور اسوافیل

تم سب انقلاب کے نعرے بلند کرو تم سب بغاوت کے گیت گاؤ۔

دیکھو طوفان اور آندھیوں میں بھی سرنگوں نہ ہو کر وہ دور جدید

کا پرچم لہرا رہا ہے۔

قیامت کے نشہ میں معزول ہو کر تباہی و بربادی کو اشاروں پر

نچاتا ہوا وہ وحشی آپہلچا اور اس نے سلسلہ کے سوتوں پر نشتر لگا دیے۔

اس کے مہیب اور ڈراونے چہرے پہ موت تبسم بن گئی ہے۔ عزرائیل

کا معشر انگیز آبادہ اوزھے اجل سے زیادہ عہقی اندھے کلوں سے سر نکال کر مشعل برق روشن کیے جب وہ تہقہہ لگاتا ہو —

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گھٹ گاؤ۔
جب وہ اپنی زلفوں کو پہلا دیتا ہے تو ان میں سے شرفساد کی چلکاریاں نکل کر آسمان میں آگ لگا دیتی ہیں —

دمدار ستارۂ کی شرر بار نگاہیں اس کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہیں۔
دنیا کے دل و جگر سے خون نکال کر وہ اپنی تلوار کو دھوتا ہے جیسے
کی بے پناہ جھنکار سن کر سب خاکی و نوری دم بخود رہ جاتے ہیں —
جب وہ فضا کو خاموشی کے سبق پڑھاتا ہو

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گھٹ گاؤ۔
آفتاب سوا نہڑے پر آکر اپنی تمام گرمی اس کی ڈریدہ نظروں
میں ڈھال دیتا اس کے پریشان بالوں میں فریادیں آکر چھپ جائیں گی۔
سمندر خشک ہو ہو کر اس کی آنکھوں کے آنسو بن جائیں گے —
جب خود زمیں اس کے کاندھوں کا سہارا لے کر شور قہامت پڑ
گوش بر آواز ہو جاؤ گی —

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گھٹ گاؤ۔
خبردار ! ہوشیار ! اس بار قہامت برف کی سلیم دنیا کے سیلے
پر دکھ دے گی —

بوزھوں اور مردوں کے لیے اس ہلکام حشر میں کہیں جگہ نہیں —
کل جب یہ ہلکامہ فرو ہو جائے گا تو بلیت نور بھرہ ہو چکی ہو گی اس
کے ماتھے کا سہلدر — صبح کی لالی غائب ہو چکی ہو گی — چاند کے ذرات
انکارے بن کر صبر و سکون میں آگ لگا دیں گے

پھر کہوں نہ تم نعرۂ انقلاب بلند کرو کہوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔
وہ دیکھو دجال نے اپنا خونیں عصا سلجھا لا اور قہر و غضب کے دیوتاؤں
کو آتش و باد کے کفن پہنا دیے۔
اور لو برق و رعد نے طوفان اور اندھی نے اپنے ترنم سے آسمان کے
تاروں کو منتشر کر دیا۔
اس کی تھوکروں سے ستارے ٹکرا ٹکرا کر شہاب ثاقب بن گئے اور آسمان
میں شگاف ڈالنے لگے۔

زلزلوں نے کلوں کو یوں اچھال دیا کہ وہ میدان بن گئے۔
اور ایسے ہی موقع پر اگر وہ رخصت قہر و ستم پر سوار آ جائے
تو تم سب کہوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کہوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ
مگر شور قہامت سے تو کہوں لرزہ بر اندام ہو رہا ہے؟
یہ تو ایک نئی دنیا کی آفریدش کا پیغام ہے۔
وہ زمانہ آرہا ہے جب کہیں کثافت اور نفرت کا نام نہ رہے گا۔
قہامت کی ان بربادیوں کے باوجود جو چھڑ باقی رہ جائے گی وہ
جمال باری ہے جو از سر نو حسن و رنگینی کی دنیا بسائے گا۔

جب ہر شے حسن و رنگین بننے والی ہے۔
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں کہوں نہ بغاوت کے گیت گائیں
یہ تو تعمیر و تخریب کا کھیل ہے اس سے خوف و خطر لا حاصل ہے۔
دلہنوں سے کہہ دو کہ سہاگ کے گیت گائیں دوشیزاؤں سے کہہ دو کہ
چراغ جلا دیں۔ اب دنیائے حسن تاریکی و تباہی کا لباس پہننے والی ہے۔
جب حسن کی تخلیق بھی بربادی کے ہاتھوں ہوتی ہے
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں کہوں نہ بغاوت کے ترانے لایں۔

پیام شباب

میں اس شباب کے گیت سناتا ہوں —

جو آج تلوار لیے ہوئے اس نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہوا ہے

جس کی برباد کن تاریخ میں ماضی کے اوراق کم ہو جائیں گے

جس کی سانسوں کی لہٹ میں دقیانوسی کتابیں جل جائیں گی

جو ان عبادت گاہوں کو تاخت و تاراج کرتا چلتا ہے جنہیں بزدل

بوزھوں نے گناہ و معصیت کا مرکز بنا رکھا ہے —

جس کی زندگی کی روانی میں رسم و رواج کی چٹانیں بہہ جاتی

ہیں قدامت کی ہڈیاں چکڑا چور ہو جاتی ہیں

جو بلا خوف و خطر فریب و تزویر کی کسلوں کو تار تار کڑا لٹا ہے

جس کی جرأت زندانہ قہمت کی پابندیوں کو ٹھکرا دیتی ہے

جو گرد غریباں کے ان پھولوں کو مسئلہ الٹا ہے جن کے بہار زندگی آج پہلے ہوتی ہے۔

یہاں میں اسی شباب کے گیت سناتا ہوں —

میں ان کے گیت گاتا ہوں

جو چوگان ہستی میں آج سب کے پیش رو ہیں —

صبح تک بھی وہ مسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اس اندھیری رات

کو تلاطم خیز دریا میں اپنی ناز و قال دی تھی —

اسی دیوانہ کی یاد میں میں نالہ فہم شبی میں مصروف ہوں -

چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا میں چاہتا ہوں کہ فیضان کی

صورت میں وہ آ جائے —

جہاں نو گاہہ جوہا — منزل نامم کا وہ مسافر جو رات کی تاریکی

میں سما گیا تھا، صبح بھی نہ لوٹا۔

جس کے خوف سے موت کا فرشتہ ہمیشہ لرزہ بہ اندام دھتا ہے۔

وہ، جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے

ہیجان میں، فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما دھتا ہے۔

وہ، جو تخت الثریٰ میں گورہ شب چراغ کی تلاش میں جا پہنچتا ہے۔

وہ، جسے دس کر ناگ خود زہر مار ہو جاتے ہیں۔

وہ، جس نے بادل کی ہتھکڑیوں کو کلیز بنا رکھا ہے جو بجلی کو اپلی

متھی میں پکڑے رکھتا ہے۔

وہ، جس کی فرمان برداری طوفان کھا کرتے ہیں۔

میں اسی کے آستانہ پر سر جھکتا ہوں اور اسی کے گہت گاتا ہوں۔

میں اس کا نڈا خواں ہوں، اس کا حمد گو ہوں۔

پہانسی کی دسی جس کے گلو گہر ہوتی ہے

جس کے خون سے شفق سرخی حاصل کرتی ہے

تہ خانہ میں جس کی خدمت کے لئے آزادی کی دیوی آتی ہے۔

میں اسی کے گہت گاتا ہوں۔

— * —

یاد ایام

میرے محبوب!

تجھے میں نے پہچانا بھی تو کب۔

جب میرا مقصد حیات صرف یہ رہ گیا ہے کہ دھول ناگن کی طرح اپنی آنکھوں

میں خاک جھونک کر دن رات ایک خونیں دائرہ میں رقص شر کرنا پھروں۔

اور اب محسوس ہوا کہ میں تو تجھے روز ازل سے جانتا ہوں۔
 تیرے گلے میں مچلتی اور زبان پر تھرتھراتی ہوئی اس راگلی کو
 ان غلامی آنکھوں کو، اس آئینہ جہیں کو۔
 اس جان جہاں آرا کو، راج ہنس کو شرمائے والی اس لغزش مستانہ کو۔
 ہر ادا کو میں پہچانتا ہوں، ہاں خوب جانتا ہوں۔
 اسی لئے زندگی کے بے آب اور آتشیں سر چشمہ میں تھرتی ہوئی یہ
 جان حزیں پیہم تجھے پکارا تھتی ہے۔
 مری فریاد کی صرف ایک لہ ہے۔ میں تجھے جانتا ہوں میں
 تجھے پہچانتا ہوں۔
 نہ تو اقلیم محبت کی ملکہ تھی نہ گداگر۔ تو پریم ملدر کی جوگن
 اور پجاردن تھی اور بس۔
 مجھے سلگ دل پر تو نے کس کس طرح عشق کے نقش بٹائے تھے۔
 خود کو جلا کر میرے سیہ خانہ دل میں محبت کی لو بھڑائی تھی۔
 اپنی پوجا کے پھولوں سے اس بے برگ و ثمر پیڑ کو ہرا بھرا کر دیا تھا۔
 زندگی کی صبح و شام میں اور حیات و ممات کی الجھلوں میں
 میں نے تجھے دیکھا ہے۔
 مگر تو مجھے سے جدا ہو گئی ہے۔ ایک اجنبی دیس میں مجھے بیچارگی
 و تلہائی کے عالم میں چھوڑ کر تو رخصت ہو چکی ہے۔



جب شفق آفتاب سے معزوم آسمان کے خون تما کو نمایاں کرتی ہے،
 تو میرے آنسو بھولے ہوئے افسانوں کو از سرنو زندہ کرتے ہیں۔
 وہ دن یاد آتا ہے — جب بہار خزاں کی طرف حسرت و یاس

سے تک رہی تھی۔ اور وہ رنگینہوں میں شرابور مبارک رات میرے گھر آئی
 تھی جب میری آنکھیں تیرے چہلکتے ہوئے پیمانوں میں ڈوب گئی تھیں۔
 اس وقت میں جوانی کے در پر ٹھٹکا ہوا کہوا تھا۔ لڑکپن کی نغم باز
 آنکھیں شباب کے فتلے جگا رہی تھیں۔ جوانی کی حرساں نصیبی شوق کی
 لالی کی طرح اپنا رنگ بچ رہی تھی۔ دور سے آتی ہوئی نغمہ کی صدا
 میں ڈوب جانے والی ہڈی کی طرح جوانی کی سرمستوں میں میری
 معصومیت معدوم ہو رہی تھی۔

گم کردہ راہ بادِ سوم کی مانند میں راہ بھٹک کر کس پردیس میں آ پہنسا۔
 اب میں ہوں اور وہ اشکِ ہائے درد آشنا جو کسی غریب الوطن کے
 غم گسار ہوتے ہیں۔

صبح سویرے جب میں نیند سے بیدار ہوا تو تو میری طرف دیکھ
 کر کس دلسوز انداز میں مسکرائی تھی۔

اور اس تبسم میں میرے آنسوؤں نے چمک کر پوچھا تھا کہ تیرا
 آشیانہ کہاں ہے؟ کس نے تجھے اسیر بنا رکھا ہے؟۔

تیری نگاہیں کتلی نازک تھیں۔ میں تو سمجھا کہ میرے نغمہ فراق
 میں تو ہی سوز و گداز بن کر اتر آئی ہے۔

جیسے بادِ بہار کی نفور سے کلیاں چٹک جاتی ہیں اور ہر نہاں
 راہ بھول جاتی ہیں۔

پھر آدھی رات آئی اور تو رخصت ہونے لگی تو میں نے وہ ترانہ
 الاپا جس کے سرگم آنسوؤں میں گلدھے ہوئے تھے اور جس میں میری بے قراری
 محفل رہی تھی۔ کہہ نہیں سکتا کہ ان گیتوں کی روشنی میں میں
 کسے اپنے خانہ دل میں تلاش کر رہا تھا۔ وہ دل جس میں ہمیشہ تاریکی

اور ویرانی چھائی دھتی تھی —

اتنا یاد ہے کہ کچی نیند سے جاگی ہوئی تیری مضمور چشم کے گلابی

توروں میں مہری پلکیں جھپک رہی تھیں —

یہ بھی یاد ہے کہ ان پلکوں میں حیرت و مسرت نے نمی پیدا کر

دی تھی گویا یہ دردِ فرقت کی گھاوت تھی —

جب تو میرے حال زار پر ترس کھا کر کانپ اٹھتی تو محسوس

ہوتا کہ لہلاے شب نے کسی کا سوگ لیا ہے —

جان جان! تیری آنکھوں میں محبت اور ہمدردی نے جو جوت جگائی

تھی اس میں مہری پھاسی آنکھیں کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں —

جب میں نے ہلسی ہلسی میں تجھے پکارا تھا تو نہ معلوم کیوں تیرے

غرورد عشق کو تھپس لگی اور آنکھوں کی کشتی جذبات کے تلاطم میں بہہ نکلی —

اور ساحلِ رخسار دم بھر میں آبِ آلودہ ہو گیا

مہری پجاردن بتلا تو سہی ایک ذرا سی چھپر اور یہ معشر جذبات؟

مہری خاطرِ یدِ عز و ناز کیوں کہ تیرا اکھلایا ہوا چہرہ فرط شرم سے اور نہلا

سا دل وارفتگی شوق سے تصویرِ درد بن گیا —

مہری آواز کو سلتے ہی تیرے آنسو ان خواب آگئی دریاچوں سے

کیوں جھانکنے لگے؟

میں اس نامعلوم راستہ کا اجنبی مسافر تھا۔ تیری معصوم آنکھیں

مہری جدائی کے صدمے سے کیوں اشک فشاں ہو گئیں؟

مجھے دیکھ کر تو سب لوگ ہلسا کرتے تھے —

بد دعاؤں کے اثر سے مہری سانس اتنی گرم ہو گئی تھی کہ اس سے

آشہانے جل کر خس و خاشاک ہو جاتے تھے —

مہری مسکراہٹ کو سانپ کا من سنبھہ کر لوگ جب اٹھانا چاہتے
تو وہ زہر آمیز پھن بن کر انھیں ڈس لیتی تھی —
دنیا جس سے دہر کر گھبرا کر دور بھاگتی تھی اس بد بخت کو تو نے
گھوں گلے کا ہار بنالیا —

اور پھر اسی وحشت زدہ کے لئے تو کہوں سیلہ فکار ہو رہی ہے —
کہا تجھے اور کوئی پھار نہیں کرتا؟ اور کوئی تیرا ناز بردار نہیں
بلیتا؟ کہا تو اوائل زندگی سے جوگن ہے؟

یہی ہے ورنہ آنسوؤں کا یہ دریا اور کسی کو کب میسر!.....
نہیں یہ نہیں ہے دل کے اندر سے کوئی کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا —
بارہا طالبانِ دید کو محروم تماشہ دیکھا ہے — پھر بھی تو تشلہ محبت
تھی اور تشلہ محبت رہی —

مگر صرف مجھے ہی شرابِ عشق سے سرشار کرنے کے لئے تو کہوں بصد تھی؟
مہری رانی یہ راز نہ تجھے معلوم ہے اور نہ مجھے 'صرف عشق کو
اور دل کو اس بھید کا پتا ہو سکتا ہے کہ یاس و حسرت بلا سببِ رگ
رگ میں کس طرح ساری ہو گئے ہیں —

تجھے نہ جانتے ہوئے بھی اس روز محسوس ہوا کہ میں تجھے ہمیشہ
سے پہچانتا آیا ہوں —

تو وہ 'لہذا' ہے جو جنگل میں بھٹکنے کے لئے اکھلی چھوڑ دی گئی تھی —
تو وہ ہے جس کی آرتی کی تھالی ہمیشہ تھکرا دی گئی
جس کی مالا ہمیشہ ہلسی ہلسی میں مسل دی گئی

تو وہ دیوی ہے جسے دنیا میں دھلے کی بد دعا دی گئی تھی — تو
خاموشی سے ان کلتوں کو برداشت کرتی رہی —

پہلی ہی نظر میں تو سمجھ گئی کہ تو مجسمۂ شباب ہے اور میں شعرِ مجسم -



پھر — پچھلے پھر مہری روح تیرے نغموں میں مرتعش ہوئی تھی — ان

گھٹوں میں جو لاج کے مارے تھرا رہے تھے —

نہ جانے کیوں ان الفاظ کے معانی میرے لئے صرف اس جملہ میں

سٹ آئے تھے — تو مجھ جانتا ہے روزِ ازل سے پہچانتا ہے —

متھرا پہنچ کر جب شہام ، دادہا کو بھول گیا تو شاید وہ اس کی یاد

میں بھی گھٹ گنگایا کرتی تھی —

نیل جب دامن کو جنگل میں تلہا چھوڑ کر چلا آیا تھا تو شاید

وہ بھی انہیں معشرِ انگیز سروں میں اس کی یاد کیا کرتی تھی —

جنگلی پھولوں کے ہار گوندھتے ہوئے جب سکنتلا کو پیغم یاد آتا تھا

تو وہ بھی یہی یاس آفریں گیت گایا کرتی تھی —

پھاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھانکتے ہوئے مہادیو کی یاد میں

گوری نے یہی نغمہ چھوڑا تھا —

ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے —

لیکن اس وقت شبابِ محو خواب تھا ، تجھے دل نشیں نہ کر سکا -

صرف تیری نغمہ آفرینی کو روح میں بسا کر میں دورِ دراز کے سفر پر چلا گیا -

دوسرے ہی دن گو معنی کے نشاطِ افزا کناروں پر دل میں چھپی

ہوئی تیری یاد نے مجھے وطن کے اس آہو کی طرح تڑپا دیا جواپے

سہلہ میں نافۂ مشک رکھ کر اس کی تلاش اپنے آس پاس کرتا ہے -

میں دھونڈتا پھرا کہ کس کی یاد مجھے یوں محروم قرار رکھتی

ہے یہاں تک کہ میرے داویلوں نے زمیں و آسمان کو فراقِ آشنا بنا دیا -

پھول پتھار 'ندی' اور پہاڑ سب مہرے ہم زبان ہو کر بھاگ کے گھٹ گئے تھے۔
ساتھ ہی مہرا ہیٹھا نصیب آتش شہاب میں تپ کر مہرے دل کی
گہرائیوں میں پھاس سے بیتاب ہوا تھا۔

یہ جان حزیں جو ملول مقصود سے نا آشنا تھی چینگ چینگ اتھی کہ
کون سا ہے وہ دیس جہاں پہاڑ کا مول لگتا ہے؟

زندگی اُداس سی دھتی تھی، دل ڈوبا ڈوبا سا دھتا تھا۔
میں سوچتا تھا کہ جوانی کا زمانہ ایک طویل آہ کے سوا کچھ نہیں۔
آنکھوں کے آگے ہمیشہ دھوپ چھانو کے پردے سے لگے دھتے تھے۔

یہ نکہت یار کہاں سے آکر مہری روح میں سائی جا رہی تھی۔
مہرا دل آہرے رمبہ کی طرح آپا پے سہلہ میں پوشیدہ مشک کی تلاش
میں خیران و سرگرداں تھا۔

یہ خودی کا عشق کتنا عجیب و غریب تھا! اپنی محبت سے اپنی
نمنا کی خلص مٹانے کی کوشش کتنی حسرتناک تھی۔ مہری جوانی کی
تشنہ لبی کی انتہا نہیں۔ محبت کے دریا اوس کی بوندوں کے مانند اس
کے ہونٹوں تک آتے آتے خشک ہو جاتے ہیں۔ الہی! اس پھاس کی
کوئی حد بھی ہے!

کھسے بچھے؟ یہ پھاس کھسے بچھے؟ کہاں ہے وہ ناپید اکنار دریائے
عشق جو اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔

مجھے لاابالی رند لم یزل کی تشنگی کو کون بجھا سکتا ہے!۔
وہ کہاں ہے جسے کہو کہ یہ ساری دنیا مہرے لئے ہیچ ہے جہاں
سکون میرے لئے حرام ہو گیا ہے۔

کچھ دور اور چل کر دیکھوں۔ اس راستہ سے کئی مستانہ خرام دو شہزائیں

گڈرتی ہیں۔ ان کے پیچھے یہ پریم پیما سادل اندھوں کی طرح دوڑنے لگتا ہے اور اگر کوئی ایک ناکہ فلتا انداز ڈال جاتی ہے تو خود داری کے احساس سے آنکھیں دبتا جاتی ہیں۔

یہ دیکھ کر وہ مجھے پر ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کوئی دروازے پر آکر پوچھتی ہے 'بھیک لے گا؟'

یہ سن کر دل بے مایہ دو دو اٹھتا ہے۔ درد و غرور سے میرے قیامت خیز جذبات میں آگ سی لگ جاتی ہے۔

اور جب وہ چنچل لڑکی لجائی چٹونوں سے بھیک کا پیالہ میری طرف پڑھاتی ہے تو میں اسے تھکرا دیتا ہوں۔

وہ روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے اور خوف کے مارے کوئی میرے پاس نہیں آتا۔ 'گوتم' کی طرح یہ جان عزیز کشکول گدائی لئے محبت کی بھیک مانگنے لہر در صدا لگاتی پھرتی ہے۔

میری آواز سن کر کتلے آتے ہیں کتلے چہرے و نرد لے کر لوٹ جاتے ہیں۔ کسی کے دل میں تھپس لگتی ہے 'کسی کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ میں بھیک میں مایہ حیات مانگتا ہوں پھر بھلا یہ دنیا دار میرے سوال کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

پہلے تو وہ تمسخر اڑاتے ہیں اور پھر خود بھی پشیمان ہو کر روتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔

پوچھتے ہیں کہ مسافر کہہ تو سہی تو چاہتا کیا ہے؟ تھری آواز میں یہ سوز کہوں ہے؟ تھری آواز میں کس کی آتش تنہا سلگ رہی ہے! کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کوئی تن میں لاتا ہے 'کوئی معام حسن' کوئی دولت جمال۔

کوئی مفرد راجکاری دولت کے نشہ میں چور ہو کر مجھ پر جوانی کے ملنگ پھونکتی ہے۔

مگر ان سب کی طرف میں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا - مایوس ہو کر میں بادیہ پیمائی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

آہ! مری وہ پجاردن کہاں ہے جو کہے کہ مرے مالک میں تیری خاطر جوگن بنی تھی - کیا تو مجھے پیار نہ کریگا؟ میرے پاس محبت کے سوا کچھ نہیں ”کیا تو اس تصنف کو قبول نہ کریگا!“

اس ریگستان میں آبلہ پائی سے کیا حاصل جہاں یہ پیاس شدید تر ہو جاتی ہے۔

سراب صحرا بن کر کوئی آنکھوں کے آگے آتا اور پھر اوجھل ہو جاتا ہے - صرف یہ ندا جرس کارواں بن کر کانوں میں آتی ہے -
’میرے مالک نہیں بھوک نہیں تجھے چاہتی ہوں - میں تجھے جانتی ہوں اور تو مجھے پہچانتا ہے -

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ میری ہی صدائے بازگشت ہے - نہ یہ دریا ہے اور نہ ساحل - یہ سراب صحرا کے سوا کچھ نہیں۔

* ————— *

میں جب تیری نگری میں آیا تو میری زندگی خون آلودہ اور کانتوں سے چھدی ہوئی تھی -

اس وقت تک مجھے خبر نہ تھی کہ میری چہن تیرے سہلے میں پھوست ہو کر کسک بن جاتی ہے

تھم محسوس ہوتا تھا کہ تیری مضمون کن قرابت میرے تمام مصائب کو دور کر دے گی -

ہندم! معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل میں تیری یہ فریاد تڑپ رہی ہے۔ 'مسافر' یہ کانتا مجھے نکالنے دے۔ بتلا تو سہی کہ درد کہاں ہے اور کہوں ہے؟ بے زبانی تیری زبان تھی، خاموشی تیری گویائی تھی، آہ تیرا نغمہ تھی۔ اسی لئے یہ دل تلک سب سن کر بھی نہ سمجھ سکا کہ اس العجا میں ناکام محبت داد طلب ہے۔

اس کشمکش کے عالم میں جب اندھیری رات موسلا دھار بارش میں نہار ہی تھی، نہ جانے کہاں سے میری ماں آئی اور مجھے گود میں اتھا کر ان روتی ہوئی آنکھوں کو بار بار چوم لیا۔

پھر نہ وہ بے راہ روی رہی نہ وہ شورش طلبی۔ اس کے ہوسوں نے آتش غم کو سرد کر دیا۔ ناکامی کی تھرگی میں ماں کی مامتا جگنو کی طرح جگمگا اٹھی۔

ایک عرصہ دراز کے بعد وہ آشفتم مزاج خانہ زاد آوارہ گردی سے تھک کر گھر لوٹ آیا۔ ارد اسے سکون ملا تو ماں کی شفقت میں۔ اس کے آوارہ ترانوں کی گونج شفقت مادری کی تیز ہواؤں میں کم ہو گئی۔

مگر ایک بار اور میں اپنے راستہ سے بہتکا :-

جب یہ معلوم ہوا کہ ایک شوخ حسینہ میرے در کی زنجیر کھٹکتا رہی ہے تو مجھے یاد نہ رہا کہ اب تک میں کس کی تلاش میں کھویا ہوا تھا یہ بھی بھول گیا کہ میں کس پوجا کے پھولوں کا طلبگار تھا۔ حسرت و یاس کا پتہ نہ رہا۔

گویا شادیء مرگ سے دل کے بلند بذر کھل گئے، بے اشک آنکھیں

پھر آنسوؤں سے چمک اٹھیں۔ کسی کی عطر بیزی سے روح مہک اٹھی۔
فراق و وصل کی ہلکامہ خیزیوں میں زندگی، بھنور میں پڑی ہوئی
کشتی کی طرح ڈگمگا نے لگی —

ایک بار بیچ کر یہ گل دیدہ بلبل پھر دام صیاد میں آ پھنسا...
مندر کی صورت مہرے خون میں دوب گئی تو بھی وہ پتھر کی
صورت بیعتس ہی رہی —

یوں ذلیل ہو کر غرور عشق انتقام کی آگ میں کود پڑا اور میں
اشہب بغاوت پر سوار ہو کر بادلوں کو چھوڑا اور نعرے لگاتا ہوا اس
خداے قہار کی طرف جھپٹ پڑا جو سارے مصائب و آلام کا خالق ہے۔
نقیب تھامس ستارۂ تخریب بن کر میں نے اس عالم صحرائی میں جو
آب محبت سے یکسر خالی ہے خون اور آگ کے دریا بہا دیے —

لیکن یہ فریب ہستی! مہرے محبوب! بیچ بیچ میں محسوس ہوتا
تھا کہ تیری بانسری کہیں درد مہرے نام کی رت لگائے ہوئے ہے۔
اس نامعلوم دور افتادہ منزل کی طرف دیکھتے ہوئے ان آنکھوں
میں درد ملدی کے آنسو تیرے لگتے تھے جن کی یلکھیں خون آلودہ تھیں۔
مجھے یقین ہو گیا کہ ایک تو ہی جنگل کی وہ شہزادی ہے جو مہرے
لئے پھول چٹا کرتی ہے اور بڑے جتن سے ایک ہار بنا کر اپنے پاس رکھ
چھوڑتی ہے۔ مہری بوکاردن! معلوم نہیں شرم و حیا کے پھولیں میں کتنی
مدت سے تیری صحبت کا سدا بہار پھول کھلا ہوا ہے۔

دل کے اندر موجیں مارتا ہوا دریائے اندرہ کھلکھلا کر کہتا ہے۔
”پہچان گیا۔ جسم مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی۔ یہ آواز تو اس کی
ہے جس کے بغیر اسی وسیع دنیا میں تجھے کہیں سکون مہسر نہ تھا۔

مگر ساتھ ساتھ نالہ و شیون کی یہ روح قوسا صدائیں کہسی ؟ -
 جیسے کوئی پوچھے سے پکار کر کہتا ہو دوست ! بھی وقت نہیں آیا -
 تو بھی میں نے سلی ان سلی کردی - چشم زدن میں بچا ہوں پر بیتھے کر
 تھری دگ جاں سے بھی قریب آ گیا -

نہ معلوم وہ راہ فنا، وہ خرنیں پر چم، وہ آتشیں رتھہ کیا ہوے - اٹھا
 یاد ہے کہ تھرے آغوش میں سکون و اطمینان کے پھول بکھرے ہوئے تھے -

اس کے بعد میں جو کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے الفاظ نہیں ملتے -
 اب نہ دل میں دھڑکن باقی ہے نہ آنکھوں میں آنسو اور نہ امید میں تقویت -
 اب جو کچھ کہوں گا وہ گیت نہ ہوگا - یہ وہ نوحہ ہے جسے خون دل
 ناکامی کی زبان میں بھان کر رہا ہے -
 تم سوچتی ہوگی کہ اس کلکال کی بے حیائی کی بھی کچھ انتہا
 ہے کہ شرف و عزت کا متمنی رہتا ہے -

دراصل یہ حقیقت کتنی حیرت انگیز ہے ! اب میں بھی ان باتوں
 کے تصور سے ہلکس دیتا ہوں -

مگر میرے محبوب نہ بھول کہ در در کی خاک چہان کو میں
 تھکا ہارا تھرے پاس آیا تھا - سچے پیار کی جو تہوڑی بہت کاٹاٹ
 رہ گئی تھی اس کا ہدیہ میں نے درتے درتے تھرے سامنے پیش کیا تھا -
 اے ستنگر ! کس ذوق و شوق سے میں نے اپنی کم مائیگی کے احساس
 کے باوجود تھری پوجا کے سامان کئے تھے -

سوچا تھا کہ جس بار کو یہ ہوسناک دنیا نہ اُٹھا سکی اسے تو خوشی
 سے سنبھال لےگی - اس ازلی باغی کو تو پابند محبت بنالہگی - سوچا

تھا کہ اس سرکش و خود سبر پر فتح پا کر تیرا عشق روشن ہو جائے گا۔
بعد ازاں میسرے ناتواں بازوؤں میں تیرا خلوص وہ زور پیدا کر دے گا
کہ میں نعرۂ بغاوت بن جاؤں گا اور تو بغاوت کی بجلی۔

دل میں یہ آرزو تھی اور اس کی تکمیل کی یہاں تک جدات
تھی کہ میں دنیا کی ساری رنگیلہوں کو تجھے پر نثار کر سکتا تھا۔
لیکن آہ! نہ وہ تو ہے نہ وہ ولولے نہ وہ خلش و تہس!

یکایک تو زمانہ کی طرح بدل گئی۔ عجب کہ تو بھی مکر و فریب
کے دام میں لپے بچھانے لگی۔

میرا سہمہ ہمیشہ حقیقت سے منور رہتا ہے۔ اس کی دور بین نگاہیں
خون کی ایک ایک ہوند کو پرکھ سکتی ہیں۔

تیری پوجا کو جس لالچ نے آج گناہ آلودہ کر دیا کیا، وہ مجھے
سے چھپی ہوئی ہے؟ آج تو اسے بھولنے کی کوشش کر رہی ہے کل تک تو نے
دل و جان جس کے سپرد کر رکھا تھا۔

میں حیران ہوں کہ تیرے شفاف دل پر گناہ کی لکیر کس نے
کھینچ دی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بھی فریب دنیا سیکھ جائے۔

اگر یہ سچ ہے تو کون فریب خوردہ نہیں کہوں نہ اس چھوٹی دنیا
میں آگ لگا دی جائے!

میں اور تو، چاند اور سورج، ارض و سماسب فریب زندگی کے شکار ہیں۔
جلا دے اے پھدا دگر اس چھوٹی دنیا کو اپنی عشق طرازی سے جہاسا دے

— * —

آج جو میں تیری طرے نظر اٹھاتا ہوں تو خود داری بجلی بن
ہی کر دل کے آسمان میں کوندے لگتی ہے۔ تیری بھوفائی اور اپنی

بے حیائی کا احساس سوهان روح بن جاتا ہے - جی چاہتا ہے کہ زمین
 شق ہو جائے اور اپنی اس حسرت نصیب اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹ لے
 جب کبھی امجد کی ایک آدہ کرن چمکتی ہے تو اس کی طرف
 دیکھتے ہی سارے حوصلے پست پڑ جاتے ہیں۔

ہائے! کہاں ہے وہ پتھارن، وہ جوگن - کیا یہی بیدرد، تند خو، وہ
 پیکرِ معصیت ہے؟

مہری زندگی کو اس نے کھلونا کیوں سمجھ لیا؟ میرے ارمانوں کو
 اس کیج ادائی سے وہ کیوں کچل رہی ہے؟

ان بتوں کے آگے وفا شعاری کی کوئی قیمت نہیں - مروت کی ہوس
 کی انتہا نہیں - ایک کی پرستش ایسے مطمئن نہیں کر سکتی - وہ ہمیشہ
 بہت سے چاہنے والوں کی جو یا رہتی ہے - جس کے لیے میں خدا کی
 عبادت سے منحرف ہو گیا آج وہی یوں مجھے قبرِ مذلت میں کر رہی ہے۔

— * —

معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں
 موت در آفوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستوں میں کس کی یاد
 میں میں فریاد کرتا پھروں؟

کیوں نہ اس بار آتش فشاں پہاڑ اپنے غارت گر دہانے کھول دیں؟
 کیوں نہ مہری گرم گفتاری بغاوت کے جھلکے لہرا دے اور موت کے فرشتے
 سوزے ہم سخن بن جائیں؟

لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو ہلکام قیامت کے صور - نکالو
 زہر و آتش میں بجھے ہوئے تھر - برباد کر دو اس دنیائے معصیت کو -
 تھکا دو یہ خونین شراب عزرائیل کے گلے میں - وہ و بالا کر دو اس معصاں

کدہ کو اپنی ٹھوکروں سے! —



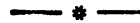
در آن حالیکہ دل صد چاک میں غصب کی جلن ہے، تو بھی اواہالم! مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک میں تجھے قابل اعتدائے سمجھتا تھا، جب تک میں محبت کی ابلے فریبوں سے ناواقف تھا تب تک تو حریم محبت کی گداگر تھی۔ مہری بے التفاتی تیرے نازک احساسات کا افسانہ آنسوؤں سے لکھا کرتی تھی۔ سہاگ کے دو چار تھکے چلتے کے لئے تو کس طرح مہرے استغناء کی جیبوں ساٹی کرتی تھی۔

میں تیری نظر فریبوں سے بچا رہا آج کہا تو اسی کا انتقام لے رہی ہے۔ اب میں موت سے ہم آغوش ہو کر سسک رہا ہوں۔ بیدرد! کہا مہرا دل اسی لئے تھا کہ یوں چور چور کر دیا جائے۔

اس کرم کی نگاہ کے بعد اس کور چشمی کو میں کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں۔ صورت! اگر مرد تیرے جذبات کی یوں تحقیر کرتا تو تو اے کہا کہا دشنام نہ دیتی؟ —

سوچتا ہوں کہ کہا ہر معصوم دو شہزاد کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ دل میں داغ بن کر رہ جائے۔

نہیں، یہ نہیں ہے۔ نسیم کلی کے دل کو گدگدا کر پھول کھلاتی ہے مگر صرف بھونرے کو معلوم ہوتا ہے کہ کہوں کر پھول کا دل چاک کیا جاتا ہے۔



جب بہار کا چل چلاؤ تھا میں آہستہ خرام بادبھاری کے ساتھ اس دیس کو چل دیا، جہاں نہ حیات ہے نہ موت، ہمیشہ اندھیری رات کا سایہ رہتا ہے۔

اس دن کو یاد کر کے آج بھی میں لہریز مسرت ہو جاتا ہوں، جب میں الوداع کہہ رہا تھا اور آنکھیں فرط انبساط سے رونے لگی تھیں - میں جب تجھے پھار نہ کر سکا تھا، تو نے بھی پہلے پہل میرے ہونٹوں سے پریم پھالہ لگایا تھا -

اب تک میرا بے تاب آغوش اُن حیات آفریں سانسوں کی لہٹ کو محسوس کرتا ہے جو دوشیزگی کی دنیا سے چلی تھیں -
اخلاص و محبت کی اُن رنگیلوں سے یہ زندگی چمک اُٹھی، اس حد تک کہ اب میں موت میں کوئی تلخی محسوس نہیں کرتا -
جب اپنے موت درکنار ہونٹوں پر تیرے حسین و جمیل بوسوں کی لڑھکی محسوس کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ تیرے نام کو ہزار بوسے دوں -



میرے محبوب! ایک آرزو یہی ہے کہ جب کبھی جوانی کی راتیں کسی دوسرے کے لئے راحت کا پیام لے کر آئیں اور تو اپنے فرقت زدہ دل میں کھٹک سی پائے - تو کوئی تجھے بتلا دے کہ وہ دکھارا اب اس دنیا سے سدھار گیا -

کبھی یہ نہ ہوگا کہ تیرے بوسے کی گرمی کا تصور ایسے ندی نالوں کو پھار گراتا یہاں تک لے آئے گا -

وہ رشک و حسد کا پتلا، وہ غرض و نفس کا بلندہ تو مر گیا -
اور لازوال بنا گیا ایسے جو جدائی اور ناکامی میں محبت کا راز
ہاں ہو کر شاعر بن گیا! -



ٹیگور کے ادبی مضامین

حیات شاعر

مترجمہ

(جناب پلّدت ونشی دھر صاحب ودیا اللکار)

ٹیلہسن شاعر کے لڑکے نے اپنے مرحوم باپ کے خطوط اور سوانح حیات

کو دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے —

قدیم شعرا کی زندگی کے مفصل حالات تلاش و جستجو کے باوجود

بھی نہیں ملتے۔ اس وقت لوگوں کو سوانح عمری لکھنے کا شوق نہیں تھا۔

اس کے علاوہ اس زمانے میں بڑے اور چھوٹے سبھی (اس زمانے کا لحاظ

کرتے ہوئے) گمناس کی حالت میں رہتے تھے۔ خطوط، اخبارات، مجلسیں،

انجمنیں اور ادبی مباحثے اس قدر زیا دہ نہیں تھے اس لئے غیر معمولی

دل و دماغ رکھنے والے اشخاص کی زندگی کے حالات کو مختلف پہلوؤں

سے مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا —

بہت سے کشت کرنے والوں نے بڑے بڑے دریاؤں کے سرچشموں کی

تلاش میں دشوار گزار راستے طے کئے ہیں۔ شاعری کے بڑے بڑے دریاؤں

کے سرچشموں کا کھوج نکالنے کے لئے طبیعت میں ایک خواہش ہوتی ہے،

اسد ہے کہ موجودہ شاعروں کی سوانح حیات ہماری اس خواہش کو

پورا کر دے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ معاشرے میں شاعر کے چہرے دھلے کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ جس بلندی سے شاعری کا سرچشمہ نکلتا ہے وہاں تک ذیل گڑی جاری ہے۔

اسی امید میں میں نے بڑے شوق سے کتاب کی دو ضخیم جلدوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن شاعری کا سرچشمہ کس جگہ سے پھوٹ نکلا، باوجود تلاش کے اس کا پتا نہ لگ سکا۔ یہ کتابیں ٹیلیسن کے حالات زندگی کہی جاسکتی ہیں لیکن شاعر کی زندگی نہیں کہلا سکتیں۔ ہم اس کتاب کے ذریعہ یہ نہ سمجھ سکے کہ شاعر کب انسانی دل کے سلندر میں جال ڈال کر اتنے علوم و جذبات باہر نکال لایا، اور کہاں بیٹھ کر اس نے ایسے عالمگیر نغمہ کے سروں کو اپنی بانسری پر مشق کر کے بجایا۔

شاعر نے جس طرح اپنی شاعری کی تخلیق کی اس طرح اپنی زندگی نہیں بنائی، کیونکہ اس کی زندگی شاعری نہیں ہے، جو مہدان عمل کے مرد ہوتے ہیں وہ اپنی زندگی بھی بناتے ہیں جس طرح شاعر زبان کی دشواریوں میں سے شعر کی بصر کو پیدا کر لیتے ہیں۔ معمولی جذبے کو غیر معمولی جوش اور چھوٹی سی بات کو بڑے معنی دے دیتے ہیں اسی طرح مہدان عمل کے مرد دنیا کی دشواریوں کے بیچ میں سے اپنی زندگی کی بصر بنا لیتے ہیں اور اپنے اطراف کی حقیر چیزوں کو بے مثل طاقت کے برتے پر اعلیٰ بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے پاس جن معمولی چیزوں کو پاتے ہیں انہیں کے ذریعے اپنی زندگی کو اور خود ان چیزوں کو بھی بڑا بنا دیتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا مشغلہ ہی اُن کی شاعری ہے، اس لئے انسان ان کی زندگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

لیکن شاعر کی زندگی سے انسان کو کیا فائدہ ہے؟ اس میں کونسی

دوامی چیز ہے؟ شاعر کی زندگی کو اس کے نام کے ساتھ ملا کر بوا بٹانے سے چھوٹے کو بڑی جگہ بٹھا کر شرمندہ کرنا ہے۔ سوانح عمری بڑے لوگوں کی ہوتی ہے اور شاعری بڑے شاعروں کی —

بعض فہر معمولی ذہانت والے اشخاص شاعری اور زندگی کے کام دونوں میں اپنی ذہانت کو ترلی دے سکتے ہیں۔ شاعری اور کام دونوں ان کی ایک ہی ذہانت کے نتائج ہوتے ہیں۔ شاعری اور ان اشخاص کی زندگی کو اگر ہم ایک جا کر کے دیکھیں تو اس کے معنی وسیع تر اور جذبات زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ دانٹے (Dante) کی شاعری میں دانٹے کی سوانح عمری شامل ہے۔ اگر ہم دونوں کو یک جا کر کے پڑھیں تو اس کی زندگی اور اس کے کام کے حدود اچھی طرح نظر آتے ہیں —

تھیلیسن کی زندگی اس قسم کی نہیں ہے۔ وہ ایک شریف آدمی کی زندگی ضرور ہے لیکن اس کا کوئی بھی پہلو قابل تعریف اور مختلف النوع نتائج کا حامل نہیں ہے۔ وہ اس کی شاعری کا ہم وزن نہیں ہے لیکن اس کی شاعری کے جس پہلو میں تلک خھالی ہے اور عالمگیر وسعت کا فقدان ہے، اس میں آج کل کے ولایتی تمدن کی دوکانوں اور کارخانوں کی تازہ بو کچھ زیادہ مقدار میں ہے۔ اس کی زندگی میں ان پہلوؤں کا عکس تو پایا جاتا ہے لیکن جس پہلو میں وہ وسیع ہے، جس پہلو میں اس نے انسان کے ساتھ انسان کو، کائنات کے ساتھ خالق کائنات کو، ایک دلکش نفس کی قلمرو میں ہر پہلو سے دکھایا ہے، اس کا وہ اہم پہلو اس کی زندگی میں نمایاں نہیں ہے —

ہمارے قدیم ہندوستان کے کسی شاعر کی سوانح عمری نہیں ملتی۔ اس کے جاننے کے لئے ہمارے دل میں خواہش ضرور رہے گی لیکن ہمیں اس کا اداس

نہیں۔ والہیکی کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے اسے تاریخی حقیقت سے کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا، لیکن ہماری رائے میں شاعر کی سچی تاریخی وہی ہے۔ والہیکی کے پڑھنے والے والہیکی کی شاعری سے اس کی جو زندگی تخلیق کرتے ہیں، والہیکی کی اصلی زندگی کے مقابلہ میں وہی زیادہ سچی ہے۔ کس چوت کے ذریعے والہیکی کے دل سے شاعری کی سوت پھوٹ پڑی؟ احساس درد کی چوت ہے۔ رماٹن احساس درد کے آنسوؤں کا سوتا ہے۔ مہجور کراونچ کے فراق کے تڑپا دیئے والے آہ و نالے رماٹن کی کہانی کے تہ میں گونج رہے ہیں۔ راون نے بھی صہاد کی طرح دو مصیبت کر لے والوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور لکا کاندہ کی جلگ، مہجور پرندے کے پروں کی پھوپھوٹا ہٹ ہے۔ راون نے جس جدائی کو پیدا کیا تھا وہ موت کی جدائی کے مقابلہ میں بھی بھانک تھی۔ وصال کے بعد بھی اس جدائی کی تلافی نہیں ہوئی۔

عہش کے اسباب کس خوش اسلوبی سے فراہم ہو رہے تھے۔ ایک طرف تو باپ کی مصیبت، رعایا کی آفت، بھائیوں کی شفقت اور ان سب کے بھیج میں نئے شادی شدہ رام اور سیتا کا ملاپ، اور دوسری طرف ولی عہدی

والہیکی کو سختی کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اس کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہتے ہیں کہ ایک دن والہیکی اشان کے لئے دریا کے کنارے گئے۔ وہاں کراونچ (پرند کا نام) کا ایک جوتا مصیبت کی کلیلوں میں شہید تھا۔ اتنے میں ایک صیاد نے تیر سے ایک پرندے کو مار ڈالا۔ یہ دیکھ کر والہیکی کے دل پر سخت چوٹ لگی اور کہتے ہیں کہ اسی وقت ذیل کا خیال نظم میں ان کے منہ سے نکل پڑا:-
”اے صیاد تو صدہا سال تک ذلت ہی ذلت میں بسر کرے کیوں کا تو نے ان ہر پریمی پرندوں میں سے ایک کو مار ڈالا۔“ جو بھی پڑھنے کے بعد جب انہوں نے اپنی الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک اچھی خاصی نظم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی انہوں نے رماٹن نظم کوئی شروع کر دی۔

کی رسم، ان تمام مسرتوں کو کامل اور شاندار بنانے کے لئے آ موجود ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت صیاد نے تیر کھینچا اور نشانے پر بیٹھا جب سیٹا چوری گئی۔ اس کے بعد آخر تک فراق کا کہیں اختتام نہیں ہوا۔ معاًھانا زندگی کے عیش کی ابتدا اور انجام ایک ہی تھا۔

کراونچ کے جوڑے کی کہانی رامائن کے اصلی جذبات کا مختصر نمونہ ہے، موتی سی بات اتلی ہی ہے۔ لوگوں نے بلاشبہ اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اس بڑے شاعر کی شفاف بصروں کی روانی احساس درد ہی کی گرمی سے پگھل کر بھی ہے۔ محبت کرنے والے جوڑے کے بے وقت دائمی فراق نے رشی کی اثر پذیر قوت شعری میں ایک تہلکہ ڈال دیا۔ اور دوسری کہانی رتنا کر* (والمیکی کا پہلا نام) کی ہے۔ وہ ایک اور ہی جذبے کی مظہر ہے۔ رامائن کی شاعری کس قسم کی ہے اس کی یہ ایک دوسری تلقید ہے۔ اس کہانی سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ رام اور سیٹا کے درد فراق کی بے انتہا اثر پذیری ہی رامائن کا بڑا سبب نہیں ہے، اس کا باعث شاعر کے دل میں رامچندر جی کی زندگی کی اعلیٰ ترین عظمت کا احساس ہے۔ رام کی زندگی نے ایک ڈاکو کو شاعر بنا دیا، اعتقاد کی قوت ایسی ہوتی ہے۔ رامائن کا رام ہندوستان کی نظروں میں کس عظمت کے ساتھ نظر آتا ہے، رامائن کی کہانی نے اسے اجاگر کر کے دکھا دیا ہے۔

ان دونوں کہانیوں سے پتہ لگتا ہے کہ روزانہ کی بات چیت، خط و کتابت، ملنا جلنا، کام کاج اور تعلیم و تربیت ان چیزوں میں شاعری کی اصلیت نہیں ہے اس کی اصلیت ایک زبردست احساس کی تحریک

ہے، جو اس عالم سے بالاتر، وقتی اور الہام کے مانند ہے اور وہ شاعری قابلیت سے بالاتر ہے۔

کوی کلکن (ایک بلکالی شاعر) نے جو نظم لکھی ہے وہ بھی خواب میں ایک دیوی کے حکم کی بجا آوری میں اور اُسی کے اثرات کے تحت لکھی ہے۔

گالی داس کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے وہ بھی اسی قسم کی ہے۔ وہ ایک بے وقوف، اُچّہ اور ایک قابل عورت کی دل لگی کا آلہ تھا۔ یکایک وہ ایک فیضان الہی کے سبب شاعری کے جوہر سے مالا مال ہو گیا۔ والیہ کی ایک سلگ دل ڈاکو تھا اور گالی داس ایک اچّہ بے وقوف، دونوں کے ایک ہی معلیٰ ہیں۔ والیہ کی تصنیف میں درد انگیز تقدیس اور گالی داس کی تحریروں میں دسلی شوخی کی حیرت انگیز برتری کو نمایان کرنے کی کوشش چھلکتی ہے۔

لوگوں نے ان کہانیوں کو شاعر کی زندگی سے نہیں بلکہ اس کی شاعری سے انتخاب کیا ہے۔ اگر شاعر کی زندگی میں ایسی حقیقی باتیں ملتیں تو ان کا شاعر کی شاعری کے ساتھ کوئی گہرا اور درامی تعلق نہ ہوتا۔ والیہ کی روزمرہ کی زندگی کا کسی طرح بھی ان کی دامن کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کے اور سب کام وقتی اور غیر مستقل تھے۔ داس ان کی اندرونی مستقل فطرت کی فطری تخلیق ہے۔ وہ ایک (غیر قابل بیان) اور غیر محدود قوت کا ارتقا ہے۔ وہ دوسرے معمولی کاموں کی طرح ذرا بے جوش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ٹینس کی شاعری کی زندگی پر بھی کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ حقیقی زندگی کے تخیل کے سوا اسے حقیقی نہیں کہہ سکتے۔ اس سے لہٰذا شیلٹ

(Lady Shaloth) اور کنگ آرثر (King Arthor) کے زمانے کے ساتھ وکٹوریہ (Victoria) کے عہد کا عجیب طرح سے میل ہو جائے گا - اس سے مرلن (Merlin) کا جادو اور سائنس کی ایجادات اکتے ہو جائیں گے - موجودہ زمانے نے بچپن ہی میں اسے سوتیلی ماں کی طرح تخیل کے جنگل میں جلاوطن کر دیا تھا وہاں اس نے قدیم زمانے کے شکستہ قلعے میں تلہا رہ کر کس طرح علامہ الدین کا چراغ حاصل کر لیا ؟ کس طرح ایک شہزادی کے ساتھ اس کی ملاقات ہو گئی ؟ کس طرح قدیم زمانے کی دولت لے کر وہ موجودہ زمانے کے اندر شاہی لباس میں داخل ہوا ؟ یہ طویل قصہ نہیں لکھا گیا - اگر یہ لکھا جاتا تو دیکھنے والوں میں یکسانی نہ پائی جاتی اور تھنسن کی زندگی مختلف لوگوں کی زبانوں پر مختلف شکلیں اختیار کر لیتی -

تبصرہ

صفحہ	نام کتاب	صفحہ	نام کتاب
	تعلیم	۴۰۵	بال جبریل
۴۳۸	مصلحان تعلیم	۴۰۹	ملشورات
۴۳۹	حیدر آباد کی تعلیمی ترقی	۴۱۰	علم الحروف
	متفرقات	۴۱۱	سرود زندگی
۴۴۰	عصر جدید	۴۱۴	دیوان غالب
	اُردو کے جدید رسالے	۴۱۴	نذیر احمد کی کہانی
۴۴۱	شاہکار	۴۱۵	آغاز ہستی
۴۴۳	عروس خیال	۴۱۶	خواہ پریشان
۴۴۴	ادراک	۴۱۷	۱۔ لہلہ کے خطوط - ۲۔ روزنامہ
۴۴۴	ارمغان	۴۲۳	رباعیات جذب
۴۴۵	تبصرہ	۴۲۳	راسپوٹین
	سالنامے	۴۲۵	لطیفیات جلد دوم
۴۴۵	سفر سخن	۴۲۶	فن انشا پردازی
۴۴۶	مجموعہ تحقیقات علمیہ	۴۳۱	عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی
			مذہب و اخلاق
		۴۳۷	وحشی متصدی

تبصرے ادب

بال جبریل

(مجموعہ تازہ کلام اردو سر محمد اقبال مجلد

تاج کہنی لہقت لاہور سے مل سکتا ہے)

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے

ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی (بال جبریل)

یہ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ آج پورے ایک قرن کے بعد اقبال نے اردو کی طرف توجہ کی ہے جس کا نتیجہ ہم ”بال جبریل“ کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اقبال نے اردو اساتذہ کی اُس سلت کو قائم رکھا جو ابتدا سے حالی تک براہِ جاری رہی۔ یعنی اردو زبان کے جتنے نامور شاعر رہے ہیں ان کا کلام اردو اور فارسی دونوں میں ہے، مثلاً مظہر جان جانا، درد، میر، سودا، مصطفیٰ، انشا، مومن، غالب، شہنشاہ، حالی وغیرہم۔ ہم نے انہیں کبھی یہ الزام نہیں دیا کہ وہ فارسی میں کہیں کہتے ہیں (خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ہمارے بعض ہم وطن انگریزی میں نکر فرماتے ہیں)

البتہ اتنی شکایت ضرور تھی کہ اردو میں کہنا کیوں چھوڑ دیا - لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ فقیر کیا نکالتا اور کیا ڈالتا ہے - ”بال جبریل“ نے شکایت کا منہ بند کر دیا اور ہم جیسے بے صبروں کو مطمئن کر دیا - اقبال نے اردو کو نہیں چھوڑا اور نہ اردو اُن کو چھوڑ سکتی ہے - مانا کہ فارسی میں شہریلی، لطافت، لوچ اور نرمی ہے، لیکن اردو پھر بھی اپنی زبان ہے - فارسی بنی بمانی اور سنووی سنووی ہے اور اردو کو ابھی بمانا اور سلوارنا ہے - جب بمانے اور سلوارنے والا ہی منہ موز لے تو پھر دوسروں سے کیا توقع ہو سکتی ہے - لیکن ہم اس کی ضرور داد دیں گے کہ وہ خاموشی سے سب شکایتیں سننے دے مگر چپکے چپکے اپنی زبان کی پرورش کرتے رہے - آج اس کا حال کھلا تو ہمیں بے حد مسرت ہوئی - اردو ادب میں اقبال کی جگہ مستقل اور قائم ہے - اس نے صرف شاعری ہی میں انقلاب نہیں پیدا کیا بلکہ دلوں میں بھی انقلاب پیدا کیا ہے - آج اس کی بدولت ہم جدید رنگ اور نئے تھلگ دیکھتے ہیں جو آگے چل کر نئے برگ و بار لائیں گے -

جب ”بال جبریل“ آیا (یا آئی) تو ہم نے اُسے اس طرح کھولا جیسے کوئی مرد متقی اپنی کتاب اور ادب و وظائف کو کھولتا ہے - اس میں وہ جوش و خروش اور ہلکامہ نہیں جو بانگ درا میں ہے - مگر لے دہی ہے گو سر دھبیے ہیں - اس دھبیے پن میں دوسری قوت ہے جو ہلکامہ میں نہیں - اس کے اسلوب بیان میں زیادہ سلامت اور صفائی ہے اور حکیمانہ رنگ گہرا ہے - بعض اوقات جوش و خروش وہ کام نہیں دیتا جو دھیمی بات دے جاتی ہے - فرنگی تہذیب و تمدن سے اقبال کو ہمیشہ تغیر و کراہت رہی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حال کے سفر نے اس میں کسی قدر

تلخی اور بڑھادی ہے —

اقبال ہندی نژاد ہے، فارسی ذوق اس کی سرشت میں ہے،
عرب کا عاشق اور عربی شعرا کی طرح آزاد ہے، مغربی تعلیم حاصل کی
ہے اور اس کے سرچشمہ پر پہنچ کر اس سے سہراب ہوا ہے۔ اس ترکیب سے
یہ طبیعت بنی ہے۔ وہ خرد کہتا ہے —

کوئی دیکھے تو مہری نے نوازی نفس ہندی مقام نغمہ تازی
نغمہ آلودہ انداز افرنگ طبیعت غزنوی، قسمت ایمازی
بال جبریل پرانے جوش و خروش سے بالکل خالی نہیں، کہیں کہیں
یہ رنگ آگیا ہے مثلاً —

عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
مہری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے
لانہ سکے گا فرنگ مہرے نواؤں کی تاب
جس میں نہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح اسم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

چند متفرق اشعار اس نئے مجموعے سے نقل کرتا ہوں، صاحب ذوق

لطف حاصل کریں گے —

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہیلی ہے تیری آنکھوں میں بھباکی نہیں ہے

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیہاکی
 ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیہاک
 فارغ تو نہ بیٹھے گا معشر میں جلوں میرا
 یا اپنا گریہاں چاک پا میرا گریہاں چاک

تہر سکا نہ ہواے چمن میں غلچہ گل
 یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد
 قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
 ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
 خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
 وہ گلستان کہ جہاں گھات میں نہو صیاد

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
 جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بیچارہ نہ ملے ہے نہ زاہد نہ حکیم

تبرک ہے مرا پیرا ہن چاک نہیں اہل جلوں کا یہ زمانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جل رہا ہے
 وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر نہا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اتھانہ شہدہ گران فزنک کے احساں سفال ہند سے مہاراجام پیدا کر

آخر میں ایک نصیحت بھی سن لیجیے —

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شہاب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگیدیں
جو کہو تر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کہو تر کے لہو میں بھی نہیں

منشورات

(مجموعہ مضامین جناب پلڈت برجموہن دتاتریہ کھلی صاحب
۳۲۳ صفحات - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے - انجمن ترقیہ اردو
اورنگ آباد دکن 'شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور' الناظر
بک ایجنسی لکھنؤ اور کتابستان الہ آباد سے مل سکتی ہے)

حضرت کھلی اردو کے بڑے ادیب اور محسن اور اردو زبان کے دلدادہ
ہیں - ان کی زبان تکسالی اور دلی کی زبان ہے - ان میں جدت فکر
اور جدت بیان دونوں پائے جاتے ہیں جن پر ان کے مضامین کا یہ مجموعہ
جو منشورات کے نام سے شایع ہوا ہے 'شاهد ہے - اس مجموعے میں بارہ
مضامین ہیں جو سب کے سب ادب اور لسانیات پر ہیں اور ہر مضمون
میں ان کی محققانہ کاوش نظر آتی ہے - مضامین کی تفصیل یہ ہے —
اردو لسانیات - مبادیات فصاحت - اردو کی موجودہ ضرورت -

تذکیر و تانہٹ - تشبیہ - متروکات - گل ' گلاب - اردو اور لکھنؤ - نظر اور خود نظری - شمس العلما حضرت آزاد مرحوم - اردو اور پنجاب - ان میں سے ہر مضمون ایک جدا حیثیت رکھتا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے ان کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو گلدستہ کے پھولوں اور تسبیح کے دانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے - زقذہ لوگوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جنہوں نے اردو زبان پر لسانیاتی اور محققانہ پہلو سے اس طرح نظر ڈالی ہو - یہ مضامین ادیب اور طالب ادب کے لیے نہایت قابل قدر ہیں - اور اس قابل ہیں کہ جن یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے، وہاں کے نصاب میں داخل کیے جائیں -

علم الکروف

(تالیف حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر ' محلہ

نراہی خانہ ' دہلی - قیمت تین روپے)

اس تالیف کے چار حصے ہیں - حصہ اول کے شروع میں مختصر طور پر تخلیق السنہ سے بحث کرنے کے بعد سامی زبان کا ذکر چھوڑ دیا ہے اور ایک شجرہ دیا ہے جس میں اس کی تمام شاخیں آگئی ہیں - اس کے بعد علم الکتابت کا بیان ہے جس کے ذیل میں دنیا کے مختلف قسم کے خطوں کا سرسری ذکر ہے - اس باب کے آخر میں اقوام عرب کی ایجاد اور رسم الخط کا تذکرہ ہے - اس کی تاریخ اور مہد بعد ترقی اور عربی خط کے تمام اقسام کی تفصیل درج ہے -

حصہ دوم میں خطوط مسالک ایران کا تذکرہ ہے - قدیم خطوط کا

مختصر ذکر کرنے کے بعد عہد اسلام کے ساتوں خطوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر خط نستعلیق اور اس کے اساتذہ کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ان ممالک کا بھی ذکر کیا ہے جہاں فارسی یا عربی خط رائج ہے۔ اس کے تحت ہندوستان بھی آجاتا ہے۔ ہندوستان کی خوش نویسی اور خوشلویوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے، اور باہر سے لے کر آخر تک ہر عہد کے خطاطوں کا حال اور ان کے انداز خط کا بیان کافی طور سے کیا ہے۔۔۔

حصہ سوم میں جو بہت مختصر ہے، 'کاغذ'، 'قلم'، 'سیاہی' کا بیان ہے اور ان کی تاریخی حیثیت سے بھی بحث کی گئی ہے۔

حصہ چہارم میں قدیم و جدید ابجدوں کے نقشے دیے ہیں۔ ان سے حرفوں کی شکلیں اور ان میں جو تغیرات ہوئے ہیں صاف نظر آتے ہیں۔ اس باب کے آخر میں قدیم خط کوفی، خط تعلیق، شکستہ اور نستعلیق کے بہت اچھے نمونے درج ہیں۔ نستعلیق میں مہر عماد، مہر علی ہروی، آقا عبدالرشید دیلمی، محمد موسیٰ، محمد امیر رضوی اور مہر علی تہریزی کے قطعات کے فوٹو دیے ہیں جنہوں نے دیکھ کر ان اساتذہ کے کمال کی داد دینی پڑتی ہے۔

سروں زندگی

(جذاب اصغر گوندوی کا کلام - مجلد قیمت دو روپے - مصنف سے)

ہندوستانی اکہدمی الہ آباد کے پتے سے مل سکتا ہے)

حضرت اصغر اردو کے ان چند زندہ شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے

و غزل میں ایک خاص رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ گائیات کو حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی میں ان کا تخیل اور ان کے جذبات پلہاں ہیں۔ نظر بلند اور خیال وسیع ہے، اسلوب بیان بھی پختہ ہے۔ لیکن ان کی شاعری خواص کے لیے ہے، عوام کے لیے نہیں۔ مولانا حالی کے بعد انہی ہم میں ایسے شاعر پیدا نہیں ہوئے جن کے کلام سے خواص و عوام دونوں حظ حاصل کر سکیں۔ اصغر صاحب کے اسلوب بیان میں بھی اب زیادہ پختگی اور صفائی پیدا ہو گئی ہے جس نے حکیمانہ رنگ کے ساتھ دلاویزی بھی پیدا کر دی ہے۔

یہاں چاند شعر ناظرین کے لطف سفتن کے لیے نقل کیے جاتے ہیں —
 یہ راز ہے مہری زندگی کا پہلے ہوئے ہوں کفن خودی کا
 او لفظ و بہاں میں چہلے والے اب قصد ہے اور خامشی کا
 ہاں سہلے گلوں کی طرح کر چاک دے مر کے ثبوت زندگی کا

ہوئے جو ماجرے خلوت سراے راز میں اس سے
 نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو

دیکھئے اٹھتا ہے کب کوئی یہاں سے اہل درد
 کعبہ و بت خانہ دونوں میں خدا کے سامنے
 رشک صد ایماں ہے اصغر مہرا طرز کافری
 میں خصلہ کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اُردو

فہرست مضامین

بابت جو لائی سنہ ۱۹۳۵ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ادب اور زندگی	اختر حسین صاحب رائے پوری	۴۴۹
۲	تھکورد کے ادبی مضامین	پلذت ونشی دھر صاحب ودیا الکار	۵۱۹
۳	سخنوردان ایران در عصر حاضر	جناب آغا محمد تقی "پارسا" شہرازی	۵۲۸
۴	سائلتفک سوسائٹی علی گڑھ	آدیتر	۵۳۳
۵	شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا و ترقی	جناب شمع چاند صاحب ایم - اے	۵۵۹
۶	گجرات کا باکمال شاعر اردو شہر خہر دار	اختر حسین صاحب رائے پوری	۵۶۹
۷	بادشاہ کھن (غزلیات اشرف)	(چ)	۵۸۳
۸	تبصرے	آدیتر ودیگر حضرات	۵۹۱

ادب اور زندگی

از

(از جناب اختر حسین صاحب راء پوری بی - اے)

ماہی کو سمجھہ ' مستقبل کا پیغام دنیا کو سنا — میرے مہرے مہر سے
ادب کا یہ تقاضا تھا - ماہی اور استقبال کو میں سمجھا لیکن
' آج کی ' دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں - اب ادب کا یہ تقاضا
ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کر دوں —

(دوسری ادب جدید کے علم بردار ' مہک و سکی ' کا آخری خط)

ادب کیا ہے ؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ؟ ادب کے
مقاصد کیا ہیں ؟ — یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی
زندگی - ارباب حل و عقد نے اس مبحث پر بڑے بڑے دفتر سہاہ کر دیے
اور اب اس موضوع پر از سرنو کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جائے گا -
اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل
رہی ہے سناچ ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقاء بالقد
(Dialectics) کے دورا ہے پر آکر ہر ایمان دار ادیب سے پرچہ دہی ہے کہ —

" دونوں میں سے کس کے موئید ہو — پیشہ ور گوشہ نشینی

یا عوام سے یگانگی ؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان

کی خدمت ؟ بھر ذمہ دارانہ خود سری یا خیالات کا ارتباط

قدرت یا ضمیر؟ جبر یا اختیار؟ تقدیر یا تدبیر؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت پر حکومت؟ آرت آرت کے لئے یا آرت انسان کے لئے؟ زمین یا آسمان؟ دوئی یا یکانگی؟ — ان میں سے ایک پر زندگی درگور دینا کتنا قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر مستقبل کا دار و مدار — تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو؟“

(زمانہ حال کا ادب از پی۔ سی۔ کوگن)

اگر یہ مرحلہ درپیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بنیادی ہو تا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اُٹھانے کی اجازت نہ دیتی۔ مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خلیج اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھوڑا جائے اور یارانِ نکتہ داں کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے — مضمون کے پہلے حصے میں دکھایا جائے گا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔ پھر جب یہ تعلق ہو چکے گا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں تو روح مقصد کی وضاحت کے لئے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے۔ مبرا خیال ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی (Feudal) تمدن پر حرفتی (Industrial) تمدن کی فتح تھی اور دیسی سماج کی سامنتی بلہاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہلکامہ سنہ ۵۷ ع کے صدمے سے اس کا شہر آڑہ تیزی سے منتشر ہونے لگا۔ ہلکامہ سنہ ۵۷ ع ہمارے سماج کی ملزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ کی روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ

جو اس زمانہ کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہوئے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے۔ آسانی کے لئے ہم انہیں قدیم اور جدید ادب کہہ لگے۔ یہ تجزیہ خالصاً معاشی ہے۔ (بوسپیل تذکرہ مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ غول کوئی کا زوال سامنتی تہذیب کی تباہی کا پرتو اور نظم کی اتھان سماج کے بلند پائی کی روانی کی علامت ہے جو ہلوز رسوم و اودھام کی کشمکش میں مبتلا ہے)۔

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی ایلکتوں کو جذبات کے چوٹے سے ہی جوڑا جاسکتا ہے۔ انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے۔ سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراس خراش کرتا ہے۔ آرت جذبات کو بذاتاً، سذراتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادیب اپنی جذباتی کوششات کو الفاظ کا جامہ پہلاتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کات چھانت کرتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطالعہ اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں۔ فضا کا ہیر پھیر کبھی آدمی کو دلاتا اور کبھی ہنساتا، کبھی آزرده اور کبھی غضبناک بنا دیتا ہے۔ مثلاً 'موت' اور 'بھوک' کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو دلاتے رہے ہیں۔ ایک کے لئے قدرت دوسرے کے لئے سماج ذمہ وار ہے۔ اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت بہت کم ہو جائے گی اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی۔ اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ فضا بدل جائے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے۔

اب تک ہمارے تلقید نگاروں نے یہ دیکھانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاہر کیا ہے۔ (Form) کی اہمیت سے کسی انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کر رہا ہے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ہیں تو یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ان جذبات کو کون اور کھوں ظاہر کر رہا ہے۔ ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے۔ وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پائے گا، جن لوگوں کے ساتھ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا — وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے، اس لیے مہری ناچھڑے رائے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لیے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اُس نے پرورش پائی۔ جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کہوں کہا، اس کے خلاف کہوں نہیں کہا۔ اس لیے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے۔

فرض کھجئے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا انجنیئر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کر دیا۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ کارخانہ بنایا جائے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا۔ کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لیے اس زمانہ کی مالیات پر غور کرنا چاہئے نہ کہ اس سہتہ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیئر کے نقشہ کی

سکھوائی پر۔ [اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعہ مبتدئی ہ اس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا کہ اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص حالات نے ہی پیدا کیا تھا۔ سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ہے وہ قدیم ہند کے اساطیر (Myths) کے پس منظر میں ہی سمجھے میں آ سکتے ہیں۔ سناج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں * اور راکشسوں کے افسانے سن اور سمجھ سکتا ہے لیکن اب اپنے زمانے پوری میں وہ ان رنگوں خواہوں کا تانا بانا کہوں کر ہن سکتا ہے جب کہ اپسرا کی جگہ سیلما کی طوائف اور راکشس کا نمبر روبٹ † (Robot) نے چھین لیا ہے اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آگئی اور خرمین پر برق بھی کم گرتی ہے کہ اس پر برقی سلاح نصب کر دی گئی ہے! صحتراؤں میں مشکل کا پتا نہیں کہ موٹر چلنے لگے اور دولہوں کا دواچ بھی کم ہو چلا کہ کھاروں کے کاندھے چھل گئے۔ زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پرنوچ لہے اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوا کہ ہندوستانی ادب کا دھارا اپنے بہاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے۔]

اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے فرائض کیا ہیں۔ میرا مطلب اُن کے مقصد سے نہیں ہے۔ طالبستانی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ آرت جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے مغنی ایک پاس انگیز نغمہ چھوڑتا ہے اور سلنے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چھٹے اُٹھتے ہیں۔ شاعر طرب و نشاط کا گیت سلاتا ہے تو سلنے والے شادماں ہو جاتے ہیں۔ دستوریسکی جب ”گناہ اور سزا“ میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ہے تو ناظر کی روح نہیں گھبی سی پڑ جاتی ہے۔ [ادیب کے کمال کا ایک معیار

یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکا۔ اُس کی عبارت زمان و مکان کے امتیاز سے جتنی بالاتر ہوئی، اس کا آرت اتنا ہی دیرپا اور مستحسن سمجھا جائے گا۔ مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا اپنے ماحول کے تاثرات کو بھان کرتا ہے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ جب نلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بھتے گا دین و مذہب بتلاتا ہے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ہے جس میں بھتے کی حیثیت باپ کی غور منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی۔ آج جب ہر بھتا اپنی انفرادیت کو شمعیت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھ رہا ہے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور تداومت سے تعبیر کی جائے گی۔ یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرت کا مقصد کیا ہے :

’ادب برائے ادب‘ کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی مافوق الہامین (Super Organic) شے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جاسکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جاسکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے۔ جمالیاتی نقطہ نظر، جس کے مؤید ہگل، شوپین، ہورڈر، فکھے اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ہیں آرت کا مقصد تلاش حسن کو قرار دیتے ہیں۔ اخلاقی نقطہ خیال جس کی تشریح طالسٹائی نے کی، آرت کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔ معاشی اور مادی نقطہ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول کے متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے اثر اندوز ہوتی ہے۔ تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں۔

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سوسائٹی میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے وہ روح القدس بلے اور عرش پر جا بٹھائے گا دعویٰ کرے۔ زندگی کا ڈھانچا مکمل اور واحد ہے۔ اس میں سائنس آرٹ اور فلسفہ کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا فرض، میں آپ اپنے لئے زندہ ہوں! اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں۔ ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بلذشوں کو توڑ کر وہ بلی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سماتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فن کار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے اور اس کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے۔ حسن کیا ہے جس کی تلاش میں مدعیان ادب براے ادب مدتوں سے سرگرداں ہیں؟ حسن کی تعریف ناممکن ہی ہے۔ والٹیر نے اپنی مشہور تصنیف (Dictionaire de Philosophie) میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مہلذکی کو بھی اپنی نرم اور چمکدار جلد پر خوبصورتی کا دعویٰ ہے اور ایک حبشی حبیلہ کے چہرے اور موتے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان قربان کرتا ہے۔ جرمی کے کلاسیکل فلاسفروں کے نزدیک یہ وہ چیز نہیں ہے جو آدمی کو خوش کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ادب کا مقصد اولیٰ تفریح طبع ہے اور چونکہ دعویٰ یہ بھی ہے کہ آرٹ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی! پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لئے اچھرن ہے۔ زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھ لکھنا فضول ہے۔ پھر کیا آرٹ کا مقصد تلاش حق ہے؟ حتمی

کہا ہے! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہوسکتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے دوسرے کے لیے بُری۔ اچھے کے لیے جو حق ہے وہ غریب کے لیے ناحق ہے۔ پھر ادب کس حقیقت کا جواب ہے۔ میں پھر اپنے اسی جملے کو دہراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کرسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے ' عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو دموں حیات کا معصوم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے۔ ایک انسان اور ایک ادیب کے فرائض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا بھر کے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادیب اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہو کر آگے بڑھتا چاہتا ہے۔ اپنے موقع پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جائے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ محالات کا ہی رد عمل تھا، کوئی الہامی کیفیت نہ تھی۔

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں۔

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے۔

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں۔

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سوسری طور پر ہمیں سماج کی بنیاد کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں۔

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے یک جا ہوتے ہیں۔ اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے۔ ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی

ابتداء اس فرض سے ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول کے لئے پیدوار آسانی ہے۔ یعنی سماج کا سلگ بلیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیدوار اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتہ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ مستحکم ہوتا جاتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی بہم رسانی آسان ہوتی جاتی ہے جس سے انہیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے۔ پیدوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور سال کا طریقہ تقسیم اکثریت کے لئے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی عمر دراز ہوگی۔ سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیدوار کے انہیں ذرائع کے ارتقا سے ہے۔ دور وحشت سے گزر کر انسان دور حرفت میں کیسے پہنچ گیا، اسے سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کلہاڑی نے تریکتر کی شکل کس طرح اختیار کر لی اور نیزہ مشین کن کیسے بن گیا۔ پیدوار کے ذرائع دو حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں جنہیں حسب ضرورت کارآمد بنانا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی مہکت جو یہ فرض انجام دیتی ہے۔ زمین کان اور خام اشیا کی دوسری قدرتی رسد گاہیں جہسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں۔ ان میں فرق نہیں آتا۔ سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی مہکت کا، جو ان اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے۔ جس کھیت میں کاشتکاری کے فرسودہ طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سہکڑوں من اناج پیدا ہوتا ہے۔ یہ پیدوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا بنیادی پتھر، ضروریات زندگی کی پیدوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی

وقت تک قائم ہے جب تک اس کے افراد کا رشتہ باہمی مستحکم ہے جس کی ضمانت ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ پیداوار اور تقسیم کے طریقے ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر فرد اپنی بساط کے مطابق معیشت کر کے اپنی ضروریات حاصل کر سکے۔ یعنی پیداوار اور تقسیم کا ارتباط رشتہ افراد کے استحکام کا ضامن ہو سکے۔ ہر فلسفہ زندگی کا مثلاً یہی ہے کہ ہر فرد بشر کو روحانی، ذہنی و جسمانی نشوونما کا موقع مل سکے۔ مگر انسان کا مادی وجود اس کا مقتضی ہے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ہو۔ سرمایہ دولت یا امارت سے وہی لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں جو پیداوار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ہوتے ہیں۔ غریب و فقیر وہ لوگ ہیں جو ان کی ملکیت سے محروم ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ پیداوار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ہو اور مال کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر معیشت کش فکر و روزگار سے آزاد ہو جائے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کر سکے، تو یہ سماج کی مادی ترقی کی انتہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی و تمدنی اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبہ بلذت کی طرف لے جاسکے گا، اور اس وقت روح الاجتماع خداوند بن جائے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تنازع نہ رہے گا۔ یہ زندگی کا مقصد اولیٰ ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر شعبہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ہو۔

اسی چہز کو مدنظر رکھ کر ادب جدید کا پیغمبر 'مہکسم گورکی' کہتا ہے: [ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کجروی کو ظاہر کرتا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔] اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بھکاری

اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔ وہ آدمی کو بے لانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روئی پر چاہے لے جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے۔

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے صحبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے۔ یہ سچ ہے کہ تدریست سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ روکی انسانیت کو وہ پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میٹھے سڑوں سے اس کی عیادت کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال ^{انگل} لیکن وہ مستقبل کا جوہا ہے۔ وہ پوچھے یا دائیں بائیں طرف اس فرض سے دیکھ لیتا ہے کہ ملزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھ سکے اور آگے بڑھ سکے۔ تاریخ کے معاذ میں اس کی جگہ صرف آخر میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے۔ لہذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو۔ علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں (ادب وہ استاد ہے جو کہانوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے۔ ادب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بہلا ہو سکے)۔

ادب ہند کا ایک خاکہ پیش کر کے ہم یہ دیکھ لیتے کہ وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حامل رہا ہے کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا ہے اور کیا وہ انسانیت کا مصلح اور پیشوا کہا جاسکتا ہے۔ ابھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ادیب عموماً کس ماحول میں رہتے آئے ہیں کیونکہ ہمارے تجزیہ کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اسی ماحول میں ہوئی۔ کیا یہ ماحول اور یہ جذبات زندگی کے لئے چراغ راہ بن سکتے ہیں؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاہئے اور ہمارا ادب کس طرف جا رہا ہے؟

زمانہ قدیم اور عہد وسطیٰ بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر تک علم و ادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رہا ہے۔ ایک وہ جو بھراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقہ امرا سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کی تگ و دو سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ آشرموں یا حجبوں میں اور درباروں یا امیروں کی قیورھوں میں پڑے ہوئے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں رہتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا۔ سوچئے کہ دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کین جذبات کی ترجمانی کن کی زبان میں کرے گا۔ ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک بے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں، جہاں حزنیت یا منافقت کا دور دورہ ہے۔ وہاں کسی ادیب کی حالت کیا ہوگی! اس لحاظ سے ہمارے ادب قدیم

کے تین نقائص اتنے نمایاں ہیں کہ حاشا تشریح طلب نہیں۔
۱۔ موضوعات ادب بہت ہی فرسودہ اور محدود ہیں۔

۲۔ لطف بہان اور زیب داستان پر معنی و مقصد قربان کئے جاتے ہیں۔

۳۔ ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں -

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہو دور میں طبقہ امرا کا خادم اور ملت پذیر رہا ہے - کچھ صوفی شاعر اور عہد وسطیٰ کی 'بہکتی تحریک' کے علم بردار ادیب ایسے ضرور ہوئے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بھزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے - کبیر داس اور نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوئے ہیں جو گھوم پھر کر آپ اپنی دولتیاں کماتے، اور زندگی کو کوچہ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے - ان درباری بھاتوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسٹائی کہتا ہے :

”کیونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خود داری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا - قبول عام کی ہوس میں یہ اندھے ہو جاتے اور مدح و ثناء پر اپنا دین و ایمان نثار کر دیتے ہیں - یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرت کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ بہ ایسے ہمہ آرت کو فائدہ کیا الٹا نقصان پہنچاتے ہیں - علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بھزار ہو کر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں - امیروں کو آرت یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نہ کی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہے - امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے

اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرت کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرت کا وہی حشر ہوا جو ایک مشوہ فروش ہر جانی کا ہوتا ہے۔ آرتسٹ فصاحت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بھائی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے، طوائف روشن و غازیہ سے اپنی بد صورتی پر پردہ ڈالتی ہے۔ غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرت اور کسی کسی میں ذرا فرق نہیں۔ یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ آرت اتلا ہی خود فروش، سیاہ باطن اور فریب کار ہے !

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لئے زیادہ سچائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ رہی ہے۔ زمانہ حال کا سحر طراز ادیب روموں و رولوں ادب کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے۔ ”پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے۔ سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہوں نے لوگوں کو نئے نئے بھانے سکھائے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لئے نئے نئے بت خانے کھڑے کئے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لئے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لئے میں ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں !“

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے۔ جو ہمیشہ ور ہیں وہ فلم کہیلوں، جاہل کتب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ساتھ خود کو بیچ رہے ہیں۔

جو شوقیہ لکھتے ہیں وہ نہ زندگی کو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں -
 زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں
 میں - پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے فرائض و مقاصد کم
 از کم ایک معمولی انسان جیسے تو نہیں انہیں ان خوش گوار حالات کو
 بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے تو یہ بلذگان خدا 'ادب برائے ادب' کی
 دھائی دیلے لگتے ہیں - مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لیے زندہ ہیں! تو پیوں
 اور جوتھوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ہوے
 اور مشامروں کی تحسین و آفرین اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے
 تک بلدی کرتے ہوے بھی یہ لوگ بیباکی سے کہتے ہیں کہ آرت صرف انفرادی
 آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ہے - انہیں مخاطب کر کے 'لیٹن' اپنے اخبار
 نوروزیجن میں ایک جگہ لکھتا ہے : " ہم ادب کو کامل طور پر آزاد
 کرنا چاہتے ہیں - صرف سیاسی بلذشوں سے ہی نہیں بلکہ دولت اور خود
 غرضی کی پابندیوں سے بھی ہم اسے آزاد کر دیں گے - یہی نہیں بلکہ ہم
 اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم بھی نہ رہنے دیں گے -

یہ آخری الفاظ ناظرین کو متفاد معلوم ہوں گے - ممکن ہے کہ کوئی
 آزادی کا پرستار ادیب چھٹ اُٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرت کو پیسنا
 چاہتے ہو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاہتے ہو جو مکمل انفرادی
 آزادی کی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے - میں کہتا ہوں کہ یہ
 لمحے چوڑے دعوے تمہاری مذاقت کے ثبوت ہیں - جس سماج کی بنیاد
 کھسٹہ زر پر رکھی گئی ہے، جہاں معدودے چند سہتہہ عیش اور مزدور فاقہ
 کشی کرتے ہیں، وہاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ہے - میں مصلحتوں
 سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ہوں ؟

کیا وہ عہاش طبع ناظرین کے زیر احسان نہیں ہیں چونلگی تصویروں کے دلدادہ ہیں کیا ان کی خاطر 'ادب برائے ادب' میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پوتا؟ سماج میں رہتے ہوئے آپ سماج سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کسی سرمایہ دار مصنف 'آرٹسٹ اور ایکٹر کا دہوئی آزادی — اُس کی جہالت کا پردہ ہے !"

(صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اثر قبول کر سکیں۔) اس کے لئے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہئے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خود گذاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پوشہ ور! ماضی 'حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی درد مندی رائیگاں نہ جائے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے۔ پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جائے اور اس کے ہلکاموں میں حصہ لیا جائے۔ اس کی تگ و دو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا۔ اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیغام اُن تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ معیار بہت بلند اور مشکل معلوم ہو گا اُس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گلنے کی تلخواہ لیا کرتا تھا —

پوچھا جائے گا کہ ادبا و شعرا کون سی راہ اختیار کریں۔ اپنے تخیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موڑیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ہلوزو بہت دور رہے ہیں۔ روس کا مشہور منکر 'پرنس کروپائکن'

جواب میں کہتا ہے : ” اگر تمہارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے ، تمہارے جذبات کا رباب اُن کے دکھ سکھ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہو — تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہو جاؤ گے ! جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کرو گے ، جب تم میدان جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھو گے ، جب تمہارے بھائی بلند قہد و بلند اور دار و درسن کے مصائب جھیلنے نظر آئیں گے ، اور جب تمہاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتنے پاب ہوگی — تو ادیبو اور شاعرو ، اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آؤ گے ! تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے — تم مظلوموں کی طرف داری کرو گے کھونکے حق و صداقت کی حمایت ہو انسان کا فرض ہے ۔ “

ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سلاے ۔ اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہئے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے جہت بچوں میں بلند کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا زمانہ حال کا ادیب یہ کرے گا ؟ اب تک وہ قدامت اور رجعت ، خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھ دیتا رہا ہے جس کی مثالیں ہم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ہیں ۔ گو یہ تبصرہ مختصر ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان ضرور مہیا کرے گا ۔

قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی ساملتی اور حرفتی تہذیبوں کی تکر تھی - اس کے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شہر ازہ منتشر ہوتا رہا اور سنہ ۵۷ ع کی آخری کشمکش کے بعد ساملتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے - اور یہ معلوم ہو گیا کہ کرگھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشہنوں کا زمانہ آگیا - تاہم حرفتی تمدن کا اثر سنہ ۵۷ ع کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی گونج پہلے راجہ رام موہن رائے کی مغرب دوستی اور بعد ازاں سر سید کی انگریز پروری میں سنائی دی - ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آگیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے - جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں - کیونکہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی - پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا - مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا قحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہو جاتی تھی ورنہ وہی آسان تھا اور وہی زمین -

دنیا کے ہر گوشے میں ساملتی تمدن طبقہٴ امرا پر رزم اور بزم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے - اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ دلیوں میں گزر جاتی ہے - ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا کو مذہبی اعتبار سے بھی دو طبقوں میں بانٹتی اور علم و ادب * کو صرف برہمنوں کا

اجارہ قرار دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشہوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ ~~اجارہ~~ حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت۔ بھچاری سے قضاوت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اگلے جنم کی کامرانیوں کا خیال خام ان میں دس جاتا ہے۔ پوری سلسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیں، اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے، شان و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ۔ البتہ راجاؤں کو رعایا پروردی اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ رعایا کی خوشنودی ہی قہام حکومت کی ضامن ہے۔ سلسکرت کے قواعد ادب اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعائے خیر کے ساتھ شروع ہو۔ برہمنوں کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے۔ شودروں کو بار بار توکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض منصبی اور دین و ایمان ہے۔ مذہب اور دیوتاؤں کی نگہ کر ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہندو ادب ان کی مدح و ثناء لہریز ہے۔ 'شرنکارس' اور 'شانت رس' سلسکرت شاعری پر چھائے ہوئے ہیں کیونکہ ایک امہروں کے صفی رجحان کو پرچاکا اور دوسرا ہرزہوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے۔ خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا تریجھتی کے تذکرے تک کی متعطل نہیں اور اسے مخدوش سمجھتی ہے، چنانچہ ہر سلسکرت تریجھتی خواہ مخواہ کامیابی میں متعلق کر دی جاتی ہے!

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عہش و طرب میں تروبا ہوا
 بزم کی رنگیلوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے
 کے ادب کو دیکھئے۔ اکثر سلسکرت افسانے مثلاً 'دش کمار چتر'، بہمال پنچشت
 (بہمال پچھسی) اور 'مرچھ کٹکا' (مٹی کی گاری) وغیرہ قدامیہ بد اخلاقی
 اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں۔ شاعر اور ادیب
 انہیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم
 ہو جاتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ 'شرنگار' ہے اس
 سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور ہوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہندو
 اصناف سخن میں 'نائیکہ بھید' اور نیکہ شکہ ورنن یعنی اقسام معشوق
 کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس
 کی شہوت پرست ذہنیت کا پرتو ہے۔ نائیکہ بھید میں جس تجسس اور
 انہماک سے صرف کلواری ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بد کاریوں
 کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا۔
 شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے۔
 اس زمانے میں طبقہ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے
 لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از محبت نہ ہوگا۔

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انہیں جہیز میں
 ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشتر نے جب 'راجسویہ'
 یکہ کیا تو انہیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسینوں کے پارسل بھیجے!
 کرشن جی کی ۱۶ ہزار گویوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت
 اور بھاگوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ
 ان کے حرم میں ہزاروں عورتیں رہتی تھیں۔ یہی نہیں یودھشتر کے

’دھرم راج‘ مہن ۸۸ ہزار طلبا کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جنس یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لئے ۴۰ درو شہزائیں مقرر تھیں۔ لطف یہ ہے کہ مہابھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی کرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینوں سے جگمگا رہا ہے! اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے، شعر و ادب میں ہی رادری نے چغتارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ہوں۔ یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں اس کا عکس ہے۔ اب ششویال و دہ راماین وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے۔ قتل و غارتگری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لئے شاعر پر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ والہیک اور تلسی داس تک لڑکا کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ہونے پر اظہار تاسف نہیں کرسکے بلکہ بھواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ خلدہ زن ہیں!

ملک کی آبادی کا ۹۵ فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہلدی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے۔ جابجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا۔ کبھی کوئی نہک طہنت وزیر راجا کے آگے ”پرچا“ کی تکلیف کا دکھڑا روتا ہے یا کوئی راجا خیرات کرتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں ’دعایا‘ نام بھی کوئی چیز نہیں۔ ورنہ ’ماہوں‘، ’راجاؤں‘، ’بلیوں‘ اور ’حسیلوں‘ کے تذکرے اس کثرت سے ملہائے کہ یقیناً سا ہو جاتا ہے کہ اس جلت نشان میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا!

کالیداس اس عہد کا مایہ ناز ادیب اور شاعر ہے۔ اس کی
 سحر طرازی اور جادو بیانی کا لوہا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ہے۔
 منظر کشی اور تصویر نگاری میں وہ ایذا مقابل نہیں رکھتا۔ ایشیا کے شاعروں
 پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا بھانپہ کلام تناسب سے دور
 ہوتا ہے۔ ایک کالیداس ہے جس کا ایک ایک لفظ نکیلے کی طرح جہاں
 جم گیا وہاں سے اُٹھ نہیں سکتا۔ کالیداس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی۔
 لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ہے اس کی سبق آموز مثال یہی
 شاعر بے ہمتا ہے۔ اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھ ہے تو محض یہ
 کہ نیک دیوتاؤں، رحم دل راجاؤں اور دھرم دھرم دھیوں کی پوجا کرے۔
 شکتی میں جا بجا برہمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ہے 'رگھوونش' میں
 رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ہے۔ قدرت کے
 استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کہتا اور اس
 کے کردار ایک ہی طبقے میں دھتے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔
 کیونکہ 'ویدک' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے
 اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ہے۔ رفتہ رفتہ جاہ و حشمت کے
 طلمس کھڑے ہوتے اور عیش و طرب کے نئے نئے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔
 ادب و شعر اس مروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ہیں اس میں
 معنی آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بددشیں لے لیتی ہیں۔ یہ امر
 قابل غور ہے کہ علم بیان و معانی کے لیے سلسکرت میں 'الکار' کا لفظ ہے جو
 'زیور' کا ہم معنی ہے۔ عبارت آرائی و رنگیں بیانی کو اتنی اہمیت دی
 جاتی ہے کہ ادب آخر میں پھیلہاں بچھوانے لگتا ہے۔ چنانچہ 'بان بھٹ'
 کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ہے کہ ایک ایک لفظ ۲۶-۲۹

سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہ و استعارے کے بہانہ میں انکی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چہستان بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایک خاص صنف سخن 'بہر مرجھند' ہے جس کی مثال مہا بھارت اور سوردا س وفورہ کے ہندی کلام میں ملے گی۔ اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوئی ہے کہ ان سے شاعر کی مراد کیا ہے۔ غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کہوں کر دیتے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعی رائیگاں میں وقت گھواتا ہے۔ وہ اس زندگی اور اس لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بہر تہری' جیسے دو چار بھرا گھوں کو چھوڑ کر حزن نجاتی رنگ کم ملے گا اور تصوف کا تو کوسوں پتا نہیں ہے!

'پلیج تلقر'، 'ہتوپدیش' اور 'مدرا راکشس' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیونکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقہ امرا اور علمائے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا۔ مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفیرین کے بدلے آفرین کہے اور کف حسرت ملے کہ ہم ان محفلوں میں کہوں نہ شریک ہو سکے!

مسلمانوں کی فقرات کے بعد ہندو سماج کی ذہلیت جس طرح بدلی اُس کے دو بہن اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں۔ ایک تو رزمہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت۔ 'پرتھوی راج راسو'، 'ہمیر راسو

اور 'آلہا دِل' وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ہیں۔ بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں کے ختمہ جذبہ قومیت میں ہرجان پیدا ہوا تو شہواجی اور درگا داس جیسے سوامیوں کے ساتھ 'بھوشن' اور "رام داس جیسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا۔ پچھلے دنوں جب اس ملک میں ہندو مسلم فساد کی آندھی اُمٹتی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر تہر میں کروت بدلیے لگے تھے۔

ہندو مذہبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پیش تھا کہ اسلام کے نرفے سے ہندو عوام کو کس طرح بچایا جائے جو برہمنوں اور پلندوں کی دست برد سے عاجز تھے۔ اس جدوجہد کا اظہار شاعری میں کبیر داس 'دادو دیال' اور تکارام وغیرہ بھکت شاعروں نے کیا۔ انہوں نے روزمرہ کی زبان میں سمجھایا کہ سارے فساد مذہبی دلالوں کی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ کبیر داس ہندوستانی جنتا (Masses) کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امہروں اور پلندوں سے بے نیاز ہو کر عوام میں خودداری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ کیونکہ وہ اور اس نے معاصرین امہروں کی نہیں بلکہ فریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اس لیے ان کا کلام ہر طرح کے الٹے تللوں سے پاک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گوشہ نشین اور سادہ و منہش ہونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ و دو سے الگ دھلے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا دھلے کی نصیحت کرتے ہیں۔ چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارتن لوتھر سے ہمراہ ہو کر کہتا ہے کہ پرچا راجا بن جائے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟

روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا —

مشقہ شاعری کا عنصر ہندو ادب پر اب بھی اتنا ہی غالب ہے جتنا عہد قدیم میں۔ بنگال میں 'چندو داس' بہار میں ودیا پتی اور بچ بھاشا میں بہاری 'دیو' متی رام وغیرہ سماج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے نقابوں میں جو مسلمانوں کے آئے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رہتے ہیں، اردو شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے وھتے، لہذا ان کا عشق ایسا بے ہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا۔ تاہم کوئی نصب العین اور مسلک نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی 'کرشن' اور گویوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویہ نگاہ ظاہر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ ہوتے تو شاید قدیم ہندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا۔ یہ ہندو طبقہ امرا کی ذہنیت کا اظہار ہے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سنانے میں لطف آتا ہے۔ رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا خواب دیکھ رہے ہیں —

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھ کھلے سے پہلے دو تین باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اردو ادب کا پیہس منظر ایرانی ہے۔ عروض، بیان، معانی، تشبیہ و استعارات اور اساطیر ہی نہیں تقریباً تمام اردو شعرا کی ذہنیت بھی غیر ملکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایرانی دس سال عرب میں رہنے کے بعد ہندوستان آیا اور یہاں کی زبان میں شاعری کرنے لگا۔ وجہ ظاہر ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ اور عوام کے مابین ایک سد سکندری قائم تھی۔ حضرات شعرا میں سے کم ایسے

ہوے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کرچکے ہوں۔ شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلہوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں۔ 'درد' اور 'نظیر' جیسے شاعر کم ہوئے کہ جنہوں نے شاعری کو اپنا پھسہ نہ بنا لیا ہو۔ جب شاعری ایک جنس سمجھ لی جائے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رکھنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہذا ان کے ذوق و طبیعت کا پاس لازمی ہے ورنہ مہر تقی مہر کی سی حالت ہو جائے۔ اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حیات بعد الموت کے مسائل کے لیے اُن کی راہبانہ شاعری مفید ہو ورنہ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے ' اس قسم کی شاعری 'کرم' اور 'قسمت' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوش عمل کے حق میں نشہ آور ہے۔

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقبول تک بلدی کر لیتا ہے۔ فزل کوئی میں اظہار و ادرات کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشون ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جا رہی ہے۔ اب ان مقبول اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی۔ نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجاسکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہو سکیں۔ اس بے رنگ و بو

زندگی کی جھلک فزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ معشوق سے ہم کلام ہونا — یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرشِ آشاں تھا یا فرشِ نشہیں — اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثنوی اور مرثیہ کے دوسرے اصنافِ سخن کی زیوں حالی اس طبقے کی کم نکمی اور محدود خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی۔ اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں۔ ایک تو 'معشوق حقیقی' سے خطاب اور جسم کی قہد سے آزادی کے لئے روح کی بے کلی۔ یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور مذاقت سے تلگ آکر دنیا سے بیزار ہو گئے اور ایک جہانِ نو کی طرح قائل لگے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفلِ جاناں میں نہ ہو سکتی تھی، انہیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری نے آٹھنے میں جلوۂ یار دیکھ لے لے!

فتحِ ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تذازع شروع ہو گیا تھا۔ مذہبی جماعتِ امورِ سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولویوں نے رٹھسوں کو احتساب کی تلقین کی بلکہ کئی مرتبہ مے خانوں پر پہرے بھی لگا دیے، جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر مستحسب، زاہد اور شیعہ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بولشویک شاعروں نے سرمایہ دار معشوقوں کو بھی اتنا نکتہ بدایا ہو گا۔ دراصل یہ اس ماحول کی رند روشی اور احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں عموماً اورنگ زیب کے بعد خصوصاً

مسلمانوں کے زوال کے ساتھ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ دلی اچڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بیدی شروع ہوئی۔ نادر شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے دلی کو جیسا خستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر مہر نورد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے۔ لکھنؤ کی خوشحال اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھ پڑا اس کے آئینہ دار 'امانت'، 'شک'، 'دند' اور جان صاحب وغیرہ ہیں۔ 'آتش' ان سے کسی قدر الگ ہے کیونکہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے۔

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کٹنے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے جذبات کٹے اوچھے اور احساسات کٹے بے حقیقت تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ پلاسی کی لڑائی، کتابوا قومی سانحہ تھا، پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیغام موت تھی، تھپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانوں کے تنزل کا اعلان تھا۔ اور ان سب سے اہم سنہ ۵۷ ع کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ کٹے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا؟ کٹے نوحے لکھے گئے؟ کہاں تھے وہ رجز گو مرثیہ خواں جن کی جادو بھانی سے معصوم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہ لکھا۔ واقعہ سنہ ۵۷ ع پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیت لہجھے کہ جب یورے ملک کی قسمت

* گذشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شہرین مقال شاعر ٹوین جلد رسیں نے ایک دلور لہ انگیز نظم بعنوان "پلاسی یادہ" لکھی۔ اسی طرح اس موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذرا الاسلام نے بھی ایک نظم قلم بند کی ہے۔ واقعہ سنہ ۵۷ ع پر ٹیپو شکوہ آبادی کے کچھ کلام اور شاہ ظفر کی کچھ غزلوں کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔

کا فیصلہ ہو رہا تھا، یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلانہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں —

اس ادب کی مثال امریہل سے دی جاسکتی ہے جو اسی درخت کو فنا کرتی ہے، جس پر پرورش پاتی ہے۔ کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر ہمیشہ درخت اور نوابوں اور راجاؤں کے منت کش تھے لہذا امہروں کے مفاد سے اُن کا اثر پذیر ہونا لازمی تھا۔ اُن کی خوشنودی کے لیے اُن کی زبان میں بولنا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بتوروں کی پالی کی طرح عام ہو گئے۔ اردو زبان میں ہال کی کھال جس طرح نکالی گئی شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی۔ معنی پر زبان کو ترجیح دینا، اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے جھوٹے نظریۂ زندگی کا ثبوت ہے جو نظام زندگی پر سانپ کی کیلچلی کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر طالسٹائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ”ہمارے سماج میں لوگ اکثر کھا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرتسٹ فکر معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے۔ یہ خیال میرے اس دعوے کی پرزور تائید کرتا ہے کہ ہم جس چیز کو آرت سمجھتے ہیں وہ ہرگز آرت نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہیں! آرت اور صلت میں بڑا فرق ہے۔ آرت فن کار کے ہیجانوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہوا جو ایک معمولی انسان کی طرح اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشوونما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اگر فن کاروں کو صلت کی روٹیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو جائے گی۔ کیونکہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کہے لڑیں گے

اور ان معائب کو کہوں کر سمجھیں گے جن سے فکر معاش میں ہر فرد بشر کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ سب سے اہم مہجانات سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقاء کے لئے ناکزیر ہیں۔ آج ہمارے سماج میں آرٹسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے، اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخلیق کے لئے ہو نہیں سکتا —

اردو شاعروں میں درد، اور 'نظیر' جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے۔ 'درد' دنیا سے بھگانے اور 'مہر' اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے اہم ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔ افسردگی، رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، بد نصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں، حسرت و یاس کے افسانے ہیں۔ زندگی کی کش مکش سے الگ رہنے اور فطرت سے معظوظ نہ ہوسکے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھائی دیتا۔ چونکہ میں اظہار جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا، اس لئے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے، کیسے کہتا ہے کا سوال بعد میں آتا ہے۔ 'نظیر' کے یہاں حسن بھان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز اور خانہ بدوش زندگی ہے۔ لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھ رہتا، انہیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کرے اور ساتھ ہی قلب میں جذبہ درد ملدنی رکھتا ہو تو

بہت ہے۔ اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے۔ تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینہ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں۔ طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں۔ وہ بوزھوں، غریبوں اور فقہروں کے ساتھ رہتا اور انہیں قوت گویائی بخشتا ہے۔ انسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویہ نگاہ بلند ہوتا۔ اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادب قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ کبیر عزام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یار غار ہے۔ کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے!

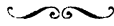
چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ اصول قائم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالصدق کے زیلوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمدوش نہ ہو۔ ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عہدوں سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچے کہ اس میں مستقبل کے لیے اشارات پلہاں ہوں۔ جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھ ہم گور کی بے ہم آہنگ ہو کر چھٹ اٹھے کہ ”ماضی کے بت کو پوچھنے والے شاعر حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیب اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگار مت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں متاڈے گی!“

اردو شاعری کے عہدوں کے لیے کئی اسباب ذمہ دار تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھولی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن

کے زوال کا دور تھا۔ جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں پڑا ہوا تھڑی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کی تربیت ایسے ہاتھوں سے ہوئی جنہوں نے نان بائی کی دکان کی طرح اسے اپنی دوٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا۔ یہ تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک تلک نظر سوسائٹی میں پروردہں پا کر اس نے اپنے لیے عرصہ حیات تلک کر لیا۔ ساج کے دباؤ اور اپنی کوتاہ بھلی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھ سکتا تھا۔ ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ہی پروان چڑھے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ پودے کی بھیجا سختی اور جلسی تشدد کی وجہ سے گلوے تغزل میں پھانسی کا پھلدا سا پوگیا۔ اردو شاعری کی معشوقہ — اگر ایسی کوئی چیز ہے تو — ایک ہرجائی طوائف ہے اور سوچئے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہو گا۔

اس تجزیہ سے کسی کی تلیقیں یا تضحیک مقصود نہیں۔ اس بحث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی۔ ادب زندگی سے عہدارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے۔ ادب کے نام پر جو چھڑا انسان کو زندگی سے بھڑا ہونے کی تعلیم دیتی ہے انسان کو فوراً اس سے بھڑا ہو جانا چاہیے۔ سچ پوچھا جائے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ صناع ہوئے ہیں۔ اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں۔ کالہداس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان موت سے یاد کرے گا۔

ہندوستانی ادب کے دور جدید کا معاشی تجزیہ



ہندوستانی ادب کے دور جدید پر ہم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیونکہ اس کا براہ راست ہماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے۔

اشاروں اشاروں میں پہلے ہم یہ دکھلا چکے ہیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتہ مادی کے اعتبار سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں، ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ دہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ سچ پوچھو تو ہمارے ادب کے سرچشمہ سے جو نئی نئی نہریں کٹ رہی ہیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتہ دیتی ہیں اور اس ذہنی رد عمل کو ظاہر کرتی ہیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت یعنی دیسی حریت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی ذہانت میں سرعت سے ایک انقلاب ہوتا رہا کیونکہ انسان جب اپنے مادی

حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے تاویلاں بھی پیدا کر لیتا ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ جو ایست انداز کمپنی کی حکومت سے برسرِ پیکار رہ کر انحطاط پذیر ہو چکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک در حقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی۔ پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو تحریک شروع کی تھی سرسود نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا۔ جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہو کر ایک دو نسلیں بنگال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی زبان ان کی زندگی میں ناسور ڈال رہی ہے، درآن حالیکہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب ابھار کر دکھا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں میں فرقہ وارانہ تہذیبی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی۔ ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جائے اور اس پر جدت کی چٹیں چپکائی جائیں۔ فرقہ وارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں، اپنے ماضی کو بوجھ کر دکھائیں اور ساتھ ساتھ نئی روشنی کے حیلوں سے بچنے کے لیے جدید گو اپنے مشق ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں۔

چھین اور گھٹنے کے ساتھ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہو شربا اور اندر سجا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پہراے نکالے۔ انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش

کئے اور سماج کے ساتھ ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کر دیا کہ تحفظ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر تو اسے یکا یک معلوم ہونا بھی چاہئے تھا کہ مذہب کا وہ تصور غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھ چلنے سے روکتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے قبل از قدر کی روحانی اور داخلی (Subjective) فضا سے نکل کر واقعیاتی نقطہ نگاہ پر آنا ضروری تھا اور اب ادب و زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لئے مصرت دساں تھی۔ قعر مذلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بہانہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا۔ نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تلقیدی تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ثبوت ہے۔ نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کر رہے ہیں۔ ادھر بلکال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی۔ اس کاوش میں اسے عہد وسطیٰ کے ویشو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھ سنسکرت چھندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راہیں تلاش کرتے تھے۔ ہندی پر ان دو تحریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے۔ اسی طرح گجراتی اور مرہٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ غرض زندگی کے ساتھ شاعری کا ظاہر بھی بدلا۔ اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف انواع تبدیلیوں کے ساتھ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں۔

سرشار اور مولوی نذیر احمد کے ناول سامعنی تمدن کی پستی کے

دور کا نقشہ کھینچتے ہیں جو اب اتلی نساہاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا۔ یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمران طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تزلزل کے آثار تھے۔ سجاد حسین کا اخبار ایک چھوٹے پیمانے پر وہی کر رہا تھا جو 'مولیر نے فرانس میں اور 'سروونکس' نے اسپین میں مدھا سال پہلے کیا تھا۔ یہ دونوں سامنتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ہوئے اور اپنے طنز کے تیروں سے اس کی زندگی دوبہر کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین اور سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا۔ ادھر ہلدوؤں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بودیئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جائے اور دونوں قوموں کے اہل قلم ایک دوسرے پر چشمک زنی شروع کریں۔ ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبہ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے۔ چنانچہ بلکال میں 'بلکم چندر' اردو میں مولانا شرر اور مڑھٹی میں آیتے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا۔ بلکال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رہے تھے اور اس طرح 'بلکم چندر' کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ہم پڑھتے ہیں۔ تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدہ دار اور خطاب یافتہ مصلف دل میں وہ ولولہ قومی دکھتا تھا کہ اس کا ایک ناول 'آنند مٹھ' بلکال میں نراج (Anarchism) کا محرک اور اس کا گیت بلدے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا۔ 'شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ہے لیکن بلکم چندر کی تحریروں سے پیچ و تاب

کہا کر 'مذکور موهنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چھٹل کماری' کا جواب دیتا ہے۔ شکر ہے کہ ادب کے سر سے یہ آسہب چلے اتر گیا اور بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا۔

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ان کے ہم عصر اردو اور ہندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خہالات کی نہلف کے لیے بہت موزوں سمجھا۔ موجودہ دور کے ہندی شاعروں میں 'بابو مہتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ہے۔ مسدس سے متاثر ہو کر انہوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو ہندی میں بے حد مقبول ہوئی۔ موضوع دونوں کا ایک ہے، دونوں کا رنامہ اسلاف سنا کر زمانہ حال کی زبانوں کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو پیام عمل سناتے ہیں۔ مسدس جس کی نقالی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ہے۔ اس کے چند سال بعد ہی انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی ہے اور کچھ عرصے بعد بلکال سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے۔ یہ قومی اور سیاسی تحریکیں بیداری کے آثار ہیں۔ ان کے محرک اور موید ایک تو وہ لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہندوؤں میں عموماً اور بلکال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس بڑھتا جاتا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھ ادب میں بھی جوش و ولولہ کے اثرات پیدا ہونے لگے تھے۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں جب نفل کی کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کر چکے تو ایک

ہنگالی مصنفہ کا ڈراما موسومہ 'نیل درپن' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شکایتوں کو رفع کرنا پڑا - 'نوبین چندر موہن' نے پلاشیر جدہ (پلاسی کی لڑائی) کے عنوان سے ایک عظیم الظہور رزمیہ نظم لکھ کر ہنگال کو اس خوں چکاں واقعے کے یاد دلائی اور مشہور ڈراما تست دی - ایل - رے نے کئی قومی گیت لکھے جو آج بھی ہنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں - نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تذازع در اصل ہندوستانی سماج کی اس کھ مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی - ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے - یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کہوں نہ ہو - جس طرح بوزہا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآن حالیکہ یہ یاد بے سود ہے اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لہوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں - روس میں سامنتی دور کے انتحطاط اور سرمایہ داری کی اُتھان کے ساتھ 'طالسمائی' پیدا ہوتا ہے 'انگلستان' میں 'رسکن' اور 'کارلائل' مشینوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں 'فرانس' میں 'روسو' رجعت تہقیری کی حمایت کرتا ہے - اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کر رہی ہے - چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں دھتا آیا ہے اور یہی لوگ ہلوز قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسباں رہے ہیں اس لیے اپنی اپنی

روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبہ شکست کا اظہار کرتے ہیں - 'طالستانی' جس قسم کے نراج کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہندو تمدن کے عہد زریں کی تصویر ہے - عدم تشدد، رہبانیت، مشہلوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لئے قابل قبول ہیں - اسی وجہ سے 'طالستانی' کے اصول، 'تھیکور' کے ادب اور 'گاندھی جی' کی تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں 'تھیکور' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے - مسلمان ادبا بھی دور حریت اور مشہلوں سے منحرف ہیں لیکن ان کی برائتوں کا حل وہ اسلامی روایتوں کے مطابق تلاش کرتے ہیں - تاہم دور حریت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں - 'اکبر الہ آبادی'، 'اقبال' اور 'تھیکور' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - خصوصاً 'اکبر' کو ہر پوانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے - لیکن چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لیے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتا -

ادب ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کبھی کبھی تحریکیں ہلتی اور بگڑتی رہی ہیں -

دیسوی سرمایہ داروں کی تحریک بلکال کی سودیشی تحریک سے شروع ہو کر سنہ ۲۲-۲۰ ع کے عدم تعاون میں اپنے حال عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ کم زور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ تحریکوں کے بعد پر شکستہ ہو جاتی ہے - قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا

جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے - عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں - مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہذا ان کی تہذیب میں ^{بھائی} غیر ملکی عنصر پایا جاتا ہے - یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطہ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجنانی ^{تھے} - ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پوش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پرورانہ ہوتا جاتا ہے - ادھر قبل از جنگ اور دوران جنگ کی بان اسلامی تحریکیں اور سنہ ۲۱ - ۲۰ ع کی تحریک خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں - باایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی'، 'سہماں اکبر آبادی' اور 'سافر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوئے ہیں - عدم تعاون کی ناکاہابی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت دھتی ہے - نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہو کر یا تو انگریزوں پر ہم پھلکنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلفتوں کو بھول جانا چاہتا ہے - اس دور کی بعض ہلکامی تھلہنیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبہ شکست کو ظاہر کرتی ہیں - گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کٹاری کے مشہور شاعر 'انا گولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی

شاعر 'اردو شہر خبردار' کی سٹھا گروہی نظموں اور دوسری طرف شاعر انقلاب 'قاضی نذرا لاسلام' کے ہلکا مہ پرور کلام میں دیکھ سکتے ہیں -

سنہ ۲۵ ع کے بعد سے عوام کی خنکے روح بھی جاگ رہی ہے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لیتا شروع کر دیا ہے - متوسط طبقے کے کچھ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کر رہے ہیں اور اسی طرح دور جدید کے ادب میں صرف یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ہے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے - 'پلڈت دیو ندر ستھارتھی' نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی طبقوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے - ادھر 'تھگور' 'شرت چندر چتر جی' اور 'پریم چند' ان برائیوں کا حل 'اصلاح' کو سمجھتے ہیں اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے دھم و کرم کی توقع رکھتے ہیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ایک ہی گھاٹ پانی پی سکیں - کچھ عرصے سے اشتراکیت اور انقلاب کی تحریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جدوجہد کی ناکامی نے ہر زبان میں ایسے ادیب پیدا کر دیے ہیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباہی کو ضروری سمجھتے ہیں - اس ضمن میں ہم مرہٹی کی چندر لوک (چاند کی دنیا) اور بنگلہ کی 'شرمک گان' (مزدوروں کا گیت مصلحہ منصور احمد) کے نام لے سکتے ہیں -

بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ہے اور غزل جیسی داخلی صلف کا زوال اور نظم جیسی واقعاتی صلف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قائم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کو بنیاد چاہتا ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو ملوث

مقصود کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کسی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی سہولیت کے لیے اس دور کے کچھ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں۔

رجعت اور ٹھیکور | حرفی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے۔ خاندان کا شہر ازہ منتشر ہوتا جاتا ہے، دیہاتوں کی خود اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہلکامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے۔ سرمایہ داری پرانے بلدھلوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بلند کر دیتی ہے۔ بچہ اگر بڑا کر بالغ ہو گیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ پرانی تہکاموں میں لپیٹا گیا تو یا تو اس کا دم گھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا۔ لیکن سادہ لوح والدین اس کھس مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں۔ یہی حالت ان مفکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں۔ طالسمائے پر تلے قید کرتے ہوئے 'لیون' ایک جگہ لکھتا ہے کہ "اس کی قوت تخلیقی اردو جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل ہم و فصہ سے لبریز ہے۔ تہذیب کی لغو حیات کے ساتھ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کبڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائیزہ لیتا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑا کر وہ بانگ دھل ہے جو یہ معذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے۔ طالسمائے میں مظالم کے خلاف نفرت ہے، کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے، ماضی کی پابندیوں سے

آزاد ہونے کی جدوجہد ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا تصور ابھی خام ہے شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے —

قبل از انقلاب - فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بد عنوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے لیکن جب کسی نے آگے بڑھ کر اس کے عملی سدباب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہو کر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے۔ ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور تھیکر کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔

شاعر سوال کرتا ہے کہ ”کوی کی گائے“ کی شناخت؟ - شاعر تو کیا گائے کا کیا سناٹے گا؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے: ”دنیا میں جنب سب لوگ بر سر کار تھے“ اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر مودان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سایے میں بیٹھ کر دن بھر ہانسری بجاتا رہا۔ لہٰذا اب تو اٹھ جا۔

آگ کہاں لگی ہے؟ دنیا کو بھڑار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے۔ کسی کی فریاد سے نسا گونج رہی ہے؟ کس قہر خانے میں پایہ زنجیر دکھاری مدد کی طلب گار ہے؟

لا تعداد بے بسو کے سیٹوں کا خون توہین انسانی کو غسل دے رہا ہے۔ خود فرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے۔ وہ بے زبان جو سونگوں کھڑا ہے۔ جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستان کلدہ ہے جو جیتے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے! اور پشت در پشت اس بازو مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے — وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے، نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرنا ہے۔ جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں

چاہتا اور جب اس مایہ حیات کو بھی کوئی چہن لہتا ہے 'جب کوئی فرعون اس کے اس اٹائے پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بد بخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے۔

اسی حسرت نصیب کو قوت گویائی بخشتا ہے۔ اس کے توتے ہوئے دل میں امید کا دیا جلاتا ہے۔ اسے پکار کر کہتا ہے کہ چشمِ زدن کے لہے سر بلند ہو جا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ بر اندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ہے۔ جیسے ہی تو جاگے گا وہ راہ فرار اختیار کرے گا۔ تھرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ہلانے لگے گا۔ خدا اس کا دشمن ہے، وہ بے یار و مددگار ہے، اس کی چرب زبانی پر نہ جا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے۔

اے شاعر! اگر تھرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا ہلوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر۔ ہم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور الم نصیبی کا کوئی تھکانا نہیں ہے۔ درستی، زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ صحت، ہم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے۔ اے شاعر! فلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جلت کے ہو شربا نظادوں کے دروازے کھول دے۔" (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپلی مشہور نظم 'وسندھر' (زمین)

میں کہتا ہے :-

"یہ چھاسوز خون کی پیاسی ہر بریت کسی دیں و آئیں کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ہے۔ اسے فکرِ فردا ہے اور نہ فکرِ امروز۔ اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ہو کر دیوانہ وار بھاگ رہی ہے۔ نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی

ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے۔ 'آج' کی موجوں پر
 آوارگی اور حجاب آسائستوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت
 ناز کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھولے کسی راہ بے
 منزل کی طرف جا رہی ہو۔ —

لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان تعلقات کی بربادی کا آرزو مند ہو
 جو انسان کے لیے آتش زیر پابن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید
 ذرائع کو مٹا کر در و وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے۔ تہذیب سے
 خطاب، نامی نظم میں کہتا ہے: "اے نئی تہذیب، مجھے وہ پرانے دشت و
 جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو — اس لوہے، پتھر اور لکڑی کے مقبرے
 کو واپس لے لے۔ اے انسانیت سوز تہذیب لٹیم، ایک بار پھر وہ عبادت گاہ
 مجھے لوٹا دے جس کا سایہ عاطفت نیکی کا کہو' رہا تھا... میں آزادی چاہتا
 ہوں، اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلانا چاہتا ہوں۔ اپنے سینے میں پھر ان
 کہوے ہوئے جذبات کو جگمگہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کر
 اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں۔ —

تیسرے کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی
 نہیں ہے۔ زمانہ حال سے اسے سخت نفرت ہے، سرمایہ دارانہ تمدن کا وہ
 گلہ گزار ہے۔ یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں باری نہیں کر رہا
 ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے۔ زندگی ابد تک
 وسیع کھا ہوتی بلکہ 'آج' اور 'ابھی' کی ایک سمیت میں سمٹ رہی ہے۔
 'تیسرے' یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراطی نے ہی یہ سقم
 برپا کیا ہے۔ دوس کی سہاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پیتروف کو لکھ
 چکا ہے کہ دوس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک

طبعے کا نہیں بلکہ پورے سماج کا قبضہ ہے۔ ناہم اپنے ملک کے مسائل کا کوئی حل اس کی سمجھت میں نہیں آتا سوا اس کے کہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں تصوف کی الجھڑوں کو سلجھاتے رہیں۔ امید و بیم کے دو متضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے۔ انسانیت کے مستقبل پر اس کا ایمان ہے لیکن تغیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا۔ یہ رنگ عمر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے اور 'سونار تری' (سڈھری کشتی) میں جس نامعلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعہ 'بلا' میں بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے: "جو دریائے زندگی میں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کھوں تھوندے؟ ناخدا کا احسان کیوں اٹھائے؟ اس گارواں کی کوئی ماڈل مقصود نہیں، نہ وہ کہیں ٹھہرتا ہے، اور نہ کہیں آرام لیتا ہے۔ راہ میں کہیں دم بھر آرام لینے بغیر وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور چہرہ نہیں ملتا۔"

اس کی اکثر نظمیں اس فقدان مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:

"انسان کی وہ آوازیں مہرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہر آلود ماضی سے نکل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم رستے سے سفر کرتی جا رہی ہیں۔ اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سلتا ہوں جو لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھانو سے نکل کر معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کر دیتا ہے کہ یہاں نہیں کہیں اور کہیں اور، کسی دوسری جگہ۔"

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو نا کام رہ جاتی ہے اور وہ تصوف کے الجھڑے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہو جاتا

ہے۔ چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت 'عدم' فلا اور پیری کا نوحہ سنائی ہیں۔ وہ تھگور جس نے بلکال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھا چل" — جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پروردوں کو دار و درسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا — "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سیلے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل" — اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بڑی ہرچکی اور اس کا پچھلا مجسومۂ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے۔

گاہے گاہے تھگور رفتارِ مر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ "گورا" اور "کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بلہادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہو سکتی ہیں۔ غریبوں میں وہ نمک حلائی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے اور امیروں کو رحم دلی اور انصاف پروردی کی تلقین کرتا ہے۔ اپنی ایک نظم "بڑھا نہ کر" میں اس ملازم کا تذکرہ دو رو کر کرتا ہے جو لاکھ تکلیفیں جھیل کر بھی اُن نہیں کرتا اور مالک کو خدا مانتا ہوا اس کی چرکھت پر مرجاتا ہے۔

بہر نوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے 'تھگور' اس کا مخالف ہے۔ بعد از آں اس کے پیغام میں ثلویت (Dualism) پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشیڈوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھ کر اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ آئے چلوں یا پیچھے بھاگوں۔ اور جب ملوکیت کو فلا کرنے کے لئے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی

جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوت کی تبلیغ کرنے لگتا ہے۔ تاہم
تھکور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال
بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے۔ تھکور ہر کام پر پیغام عمل
سلاتا ہے اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام
ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے۔
اس کا نقطہ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالاتر ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار
گزرے ہیں اور ان کا طلوع از آغاز تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا
ہوا ہے۔ یہ ان بوزہ والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جوئی
پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب چھکڑوں پر چل سکتا ہے
دھل گازی سے اسے بعد ہے! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طلبہ
تک بلدی میں گذر کے فتوے صادر کر رہا تھا۔ یہ کہنا لا حاصل ہے کہ
یہ ادبی رجعتان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روشنی کے اس تذازع
کا پرتو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شدومہ
کے ساتھ جاری ہے۔ سامنتی تمدن مغربیت کے نرغے سے نکلنے کے لیے نئی
نئی ترکیبیں سوچتا ہے۔ کہو وہ انگریزی تعلیم کا ایک لخت مخالف ہو جاتا
ہے اور کبھی ملازمتوں کی لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی
اچھی چیزیں لے لی جائیں۔ چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس
جد تک صانع کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی
تہذیبوں میں میل کرا دیا جائے۔ اس لچر نظریہ کی مقبولیت کا سبب
یہ ہے کہ ہندو ہمارے ملک میں سامنتیت کے کھنڈر باقی ہیں اور صلیبت
حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو صلیبت سے آزاد ہو کر بھی حاصل

ہو سکتا ہے - بہر حال 'تھکور' اقبال 'جوش اور اردشیر خیردار جیسے استعمار دشمن شاعروں نے بھی 'مشہن' اور 'مشہن کے مالک' کے امتیاز کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے عزتوں سے تلک آکر پوداوار کے ذرائع کو متنا دینا چاہتے ہیں - جو غلطی سیاسی مہدان میں گاندھی جی اور دوسرے سامنتی دھنیا کر رہے ہیں، اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے ہیں - ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پچھ لے جائیکی کہونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ کے نتیجے پر ہے - اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پسپائی کا اعلان ہے -

فاسیزم (fascism) اور اقبال -

اقبال کا نظریہ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس کے بانی 'جمال الدین افغانی' تھے - مشرق نے مغربی استعمار کی چہرہ دیکھنے کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیشنل، برگساں اور مہزنی نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پذیر ہوا - وہ اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو علی جامہ پہنائے - یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانہ حال کی جدید سرمایہ داری (neo-capitalism) کے سوا کچھ نہیں ہے - ظاہر ہے کہ فاسیزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیہ کی تائید میں بعد از آن ثبوت پیش کروں گا -

سلطنت (State) بجائے خود کوئی ملکہا نہیں بلکہ سناج کے تعلقات انسانی کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پوداوار کی ملکیت

پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں بدسر اقتدار ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں کلید ملکیت ہے لہذا سلطنت، تہی دست طبقے کی پامالی کے لئے ' طبقہ غالب' کی انجمن کارساز ہے۔ ارتقائے انسانی کے لئے ضروری ہے کہ تمام سلطنت اس طبقے کے ہاتھ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فائدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بلہاد کو فنا کر کے مشہلوں کے رواج کو عام کر دیا۔ لیکن اس کی عمر طبعی اسی روز ختم ہو گئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قائم نہ کر سکا۔ کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لئے ضروری ہو گیا کہ پیداوار کے ذرائع پر چند لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو۔ یہ تبھی ممکن ہے جب وہ معصنت کش طبقہ سلطنت کی باگ تودار اپنے ہاتھ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے۔ سرمایہ داری انحطاط پزیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے۔

مشیہن نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑ دی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہو جائے۔

لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خود کشی نہیں کر سکتیں۔ بین الاقوامیت کے چڑھتے ہوئے دنیا کو روکنے کے لئے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے۔ اطلالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے! جاپانی برگزیدہ بلندے ہیں، جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں! وہ ایسا فرض اسی حالت

میں ادا کرسکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں۔ رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے۔ ہیکل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور (Idea) کی تعبیر بتاتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالصدق کی سوزھیں پر چڑھ رہا ہے۔ پارلیمنٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت (laissez faire) کے اصول پر عمل ہو سکتا تھا۔ لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کر کے دکتیتری قائم کی جائے۔ دکتیتر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقہ کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے۔ وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو 'انتہا پسندی' کی طرف نہیں جانے دیتا! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا، اس لئے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہ بان بھی ہے! اشتراکیت میں وطنیت 'قومیت اور روحانیت کے لئے جگہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقہ کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دواہائی دیا کرتا ہے۔

اس طبقہ کے نوجوان پرناسیست حکومت کے پشت پناہ ہیں —

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقہ کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتحات نہیں تھیں۔

اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا۔ بعد از آن 'مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا - اور ممکن ہے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انھیں کچھ زیادہ واسطہ نہ تھا - بہر حال 'وطنیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی 'اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح 'مسولہائی' - اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاسستوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے :

متاعِ معلئی بیکانہ از دوں فطرتاں جوئی
 زمرداں شوخی طبعِ سلیمانی نمی آید
 گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
 کہ از مغزِ دو صدخر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوریت از پیام مشرق)

فاسیزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جہاں اول الذکر عوام کو پیداواری خربعتا ہے وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ہے اور بنا بریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فاسیزم کا ہمنوا ہو کر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے۔

ہر دورا جانِ نامبور و ناشکیب ہر دویزداں ناشعاس ' آدم فریب
 زندگی این را خروج ' آن را خراج درمہاں این دو سنگ آدم زجاج
 فرق دیدم ہر دورا در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

(اشتراکیت و ملوکیت از جاوید نامہ)

ملوکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہو سکتا ہے - بلکہ اور بلکہ نواز کی تفریق

بظاہر مت جائے اور مقصود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں! مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مفرت دساں ہے :

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
درآں حالیکہ آلات خود کچھ نہیں کرتے، بلکہ وہ مخصوص چالات
مروت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔ آلات تو مال
پیدا کر دیتے ہوں، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے
سے کرے۔ 'اقبال' مزدوروں کی حکومت کو چلداں پسند نہیں کرتا —

زمانِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا

طریقِ کو حکم میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دل آدم نہ مہر دہماں آتش مہاں ہر زہن ہست

عروس اقتدار سحر فن را ہماں پہچاک زلف پرشکن ہست

نماند ناز شہرین بے خریدار اگر خسرو نہا شد کو حکم ہست

(از پھام مشرق)

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو متاثر نظام
معاشی کو از سرنو قائم کرنے کے لیے 'اقبال' ایک تصورِ عالم پیش کرتا
ہے۔ لیکن ایک بین الاقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین الاقوامی
طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں
کا بھی ہے جو 'اقبال' کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی
تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے۔ اپنے خواب کی تہہ
اطالوی فاسہست میں دیکھ کر وہ جوش سے کہتا ہے :

رومتہ الکبرا ! دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر

ایلکے می بیلم بہ بھدار یست یارب یا بھواب

چشمِ پیرانِ کهن میں زندگانی کا فروغ
 نوجوان ہیں تھرے سوزِ آرزو سے سیلہ تاب
 یہ محبت کی حرارت ! یہ تمنا ! یہ نمود !
 فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حباب
 نغمہ ہاے شوق سے تیری فضا معمور ہے
 زخمِ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رہاب
 فہض یہ کس کی نظر کا ہے ؟ کرامت کس کی ہے ؟
 وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب
 (مسولہنی از بال جبرئیل)

یہ فہض 'مسولہنی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے، جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لیے شہرِ مادر بتاتا ہے - 'اقبال' ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے - خلافت کا تصور اس کے نظریے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خرانِ جمہور' میں وہ 'طبعِ سلطانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے -

مختصر یہ کہ 'اقبال' اسلامی فاسیت ہے اور اس کا رد عمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے ہندو فاسیزم کی صورت میں ظہور پزیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج، اور ذاتِ پات کی تقسیم، تقسیمِ عمل کا بہترین نمونہ ہے !

ادب اور قومیت | ہندو مسلم نفاق در اصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ہم دیکھ چکے کہ کس طرح 'ٹھگور' اور 'اقبال' ایذا تصورِ عالمِ پوہی کر کے ان متضاد رجحانوں کو ظاہر

کر رہے ہیں۔ سہاسی افراط کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ ہندوستانہوں کو تو بھیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا معاند قائم کریں۔ ان کے نزدیک وطن سب کچھ ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا۔ بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چوڑی ہر معاملے کو درست کر دے گی گویا ساج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب تک جو سہاسی تحریکیں اس ملک میں اُٹھ اُٹھ کر گزرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کر رہے تھے۔ اردو میں 'چکبست'، 'جوش' اور 'سافر نظامی' ہندی میں 'نہیں' ایک 'بھارتیہ آتما' اور 'بابو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سرو جلی نائیڈو' اور 'ہرین چٹرجی' گجراتی میں 'ارد شہر خبردار' اور دکن میں 'انانگولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں۔ ہندو مسلم تفریق کو متاثر ایک قوم کو جلم دیلے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہو رہا ہے۔ چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ مستعمل کرنے لگے ہیں۔ تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودہ' کی تھیٹ ہندی کو قبول عام سیسر آیا۔ ان کے چویدے پڑھیں تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں —

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید 'اردشیر خبردار' ہے - گجرات میں آج اس کا وہی مرتبہ ہے جو اردو میں اقبال کا اور بلکالہ میں 'ٹیکور' کا - وہ کوئی ہلکامی شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کا مجموعہ کلام 'درشلکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے - اس کا ترانہ 'گلوختی گجرات' اقبال کے ترانے یا قی - ایل - رائے کے 'بلک آمار لچھی بھوسی' سے کم مقبول نہیں ہے - وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرورد ہے - اپنی ایک نظم میں کہتا ہے -

"اے مادر وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تھرے تاروں سے گونداھا گیا ہے -

جو مرتے دم تک تھرے ہی نام کو بوسے دیتا ہے -

اے ماں، اُس نے تجھے پہچان کر اپنی خردی کو سمجھا ہے -

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ تجھے پر دوبارہ قربان ہوسکوں - تیری مٹی میرے لیے مایہ حیات ہے ' کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹی میں تمام مضائقہ ہے " -

ایک دوسری نظم میں ستھائیر کی تبلیغ یوں کرتا ہے : " آج اپنے ساتھ کہا کہا لوگے ؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں دھتی ہے - کات تمہاری ہمت مردانہ میں ہے ورنہ ہر تلوار بے آب ہے - ان کلد ہتھیاروں کو پھینک کر دل کو جاگ کے لیے مستعد بناو - ہمیں کسی کا خون نہیں بہانا ہے - حریف کے خون جگر سے ہم اپنے دل کے دیوتا کو کہوں کر ناپاک کریں - جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ بے پایاں ہے - "

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ہمارے ادب اور تحریک اصلاح | ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے

لگے۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں سماج سدھار کی تحریک زور شور سے چل پڑی۔ سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی، بھواؤں کی بد حالی اور مردوں کی تماش بھلی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گجرات میں گوند رام نے اور بنگال میں 'ٹیگور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے۔ ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لئے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشد المظہری' نے چند پیش پا افتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرات نہ ہوئی کہ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھائے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے۔ اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ جماعت میں ایک نئے رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ انکارے افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا۔ یہ افسانے ہماری جلسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جلسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پھٹ کی طرح محض جلس ہی کو واحد شعبہ زندگی قرار دیتی ہے، تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے مفاہقانہ پابندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو۔ دوسری کتاب 'لہلی' کے خطوط ہے۔ افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا تر جمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلہ کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوائف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دور جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا۔ تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض

اصلاح کو ہی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھ لگے ہیں کہ ان برائٹیوں کو دور کرنے کے لیے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے۔

اقتصادی مسائل میں طبقاتی تصادم (Class-war) کا مطالعہ صاف ہوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں۔

’پریم چندر‘ کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند (Reformist) ہیں۔ اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں ہیں جو ’طالستانی‘ کے ’رسمتیری‘ (Resurrection) کی طرح کسانوں میں اپنی جائیداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ عورتیں اپنے درہوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رہی ہیں۔ ’سجیان سنگھ‘، ’پریم شکر‘ اور ’ونییے کمار‘ اسی قسم کے نوجوان ہیں۔ ’سن‘، ’گایتیری‘ اور ’صوفیہ‘ ایسی ہی عورتیں ہیں۔ لیکن جب ایسے زمین دار مسئلہات میں شمار ہوتے ہیں اور اس کلمہ کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برباد و رغبت دست بردار نہیں ہوتا تو پریم چندر سوچ میں پڑ جاتا ہے اور راہ انقلاب کی آتش اندوزیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ طالستانی اور تھگور کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراں پر ایک تھمڈی سانس بھر کر یہ کہتا ہوا بہتہ جاتا ہے کہ اے کاش اس دستے پر چلے بغور ہم وہاں پہنچ جاتے!۔

اصلاح کی ہر تحریک نیک نیتی لیکن تلگ نظری پر مبنی ہے۔ زندگی اور موت میں اتصاد نہیں ہو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑھی میں گوندھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تعلقات جنسی میں اس وقت تک توازن، استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے

مسائل سے ہم اسے الگ کر کے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور ترقیہات جنسی کو شیطان کا فائدہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلت (instinct) نہ سمجھنے لگیں —

ادب اور فقدان مقصد | پل صراط کی طرح انقلاب کا رستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے۔ بہت سے لوگ راہ میں تھک تھک کر رہ جاتے اور تصوف کی خلدق یا نراج کی گھاٹی میں گر پڑتے ہیں۔ ہندوستان ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقصِ شر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے۔ ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لایعنی ہے۔ جو کچھ ہے 'ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے۔ شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن ہر جام کے ساتھ توبہ تھی اور ہر معصیت کے ساتھ احساسِ گناہ اور عفو گناہ کی امید۔ لیکن اب مستقبل کی تاریکی خود کشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور باہمت بے راہ روم پھینک کر 'کم ہمت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد ملش 'خہام' 'بائرن' اور 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر اس نراجی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ دنیا بے ادب میں اس کا پر تور ومانیت اور 'ادب براے ادب' کی صورت میں آشکار ہوتا ہے۔ حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'بائرن' اور 'کیتس' وغیرہ نے سامنتیت کے زوال کے زمانے میں اور اب یٹس (Yeats) اور تی۔ ایچ لارنس وغیرہ نے حریت کے زوال کے وقت اسی جذبہ شکست کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے۔ ہندوستان

کا سب سے بڑا ناول نگار 'شرت چندر چٹرجی' اپنے ناول 'چترہیں' (بداخلاق) شہس پرشن (آخری سوال) اور 'شری کانت' میں ایسے ہی لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے۔ بلکلہ اور ہندی میں رومانیت اور تیکور سے اثر انداز ہو کر شاعری میں 'چھاپہ واد' یعنی اثادیت (Symbolism) کی تحریک شروع ہوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک عرصے تک ان رجحانات کے خلاف برسرِ پیکار رہنا پڑا۔ اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذہنیت عام ہو گئی ہے اور یہ اصحابِ حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں، حالانکہ نہ ان کا عشق بوالہوسی سے علحدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کا معیارِ حسن عالمِ دوشیزگی سے آگے بڑھتا ہے۔ ان کی حبِ نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس طرح ہمارے نظامِ زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لئے مرد کی دستِ نگر ہے اسی طرح مرد اپنی شہوانی ترقیہات کے لئے اس کا غلام بن گیا ہے۔

زندگی میں حسن و عشق کے لئے بھی جگہ ہے اور شراب و شہاب کے لئے بھی۔ لیکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا ہونے کی کوششیں رجعت پرورانہ اور لائقِ تعزیر ہیں۔

پورے ہندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ہے جو میکسم نڈرا اسلام | گورکی کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ جو انقلاب پرورد، قدامت شکن اور تغیر پسند ہے۔ جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ انسان کو دلاے یا سلاے اور یا گمراہ کرے تو اُنقِ بنگال پر ایک ستارے کا طلوع ہوتا ہے جو صراطِ مستقیم کا نشان ہے۔ مختصراً نڈرا اسلام کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ زندگی دائم و قائم ہے اور انسان لاشریک اس کا مالک ہے۔ انسان اور قدرت کی کشمکش کا نام تہذیب ہے اور انسانیت کی ترقی

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے - انسان سب سے افضل اور اکمل ہے - دین حق کا مطلب ہے ہر قسم کے ظلم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام - قومیت، سرمایہ داری، تہذیب و رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے - اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور حامی ہے -

اس لحاظ سے 'نذرالاسلام' کو روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں - جب دنیا حیات و موت کی کش مکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفہ قدرت پر غور و خوض کو غیر ضروری اور مفر ماننا ہے - اس وقت فلسفہ قدور (Philosophy of Values) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مزید ہے - جب رجعت اور انقلاب برسرِ پیکار ہوں تو ادب فاضل پر بھروسہ کر واقعیت (Realism) کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا - یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے میدان میں ہوگا اور یا تصوف و داخلیت کے خلدق میں جا کرے گا - طبیعتاً وہ باقی اور سرکش ہے - حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا "پجاردن" میں عشق کی ناکامیوں کا رد عمل یوں بیان کرتا ہے: "معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کہوں نہ اب میں موت در آفوق طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟ کہوں نہ آتھی فشاں بہار اس مرتبہ اپنے فارتگر دھانے کھول دیں؟ کہوں نہ مہری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے مہرے ہم سخن بن جائیں - لے آؤ اپنے آنشیں دتہ اور پھونک دو

ہنگام قیامت کے صور! برساؤ زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر! برباد کر دو
 اس دنیاے معصیت کو! تپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!“
 نذرالاسلام کے نزدیک دنیا ہمیشہ دو طبقوں میں بٹی رہی ہے۔ اور
 اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغ مصطفوی سے شراد بولہبی کی
 ستیڑہ گاری بتاتا ہے۔ لیکن جہاں ایک ”خود گزاری“ و ”نالہ نیم شبی“
 اور ’گنبد نفلوفری‘ کے تماشوں کا آسرا تہوندتا ہے، دوسرا مظلوموں کو
 اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ہے :

”میں اس روز مطمئن ہونکا جب مظلوموں کی فریاد فضاے
 آسمانی میں نہ گونجے گی۔ اور جب میدان جنگ میں تلوار
 اور خنجر کے خوف ناک ترانے نہ سنائی دیں گے۔ وہ جو ازلی
 باقی اور میدان جنگ سے نالاں ہے، صرف اسی روز خاموش ہوگا۔“ (باغی)

”وہ جو سادہ رکھی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے
 ہیجان میں ’فضا‘ کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے۔
 وہ جس نے بادل کی ہتھوں کو کلہوڑ بلا رکھا ہے کہ جو بجلی کو
 اپنی مٹی میں پکڑے رکھتا ہے میں اسی کے آستانے پر سر جھکتا
 اور اسی کے گہیت گاتا ہوں۔“

(پیام شباب)

اپنے عزم و اسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا۔ وہ حال
 کی ترجمانی کر رہا ہے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ہو زمانہ اُسے یاد
 کرے گا یا نہیں اسے اس کی پروا نہیں ہے :

”میں زمانہ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔“

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قہد و بلد سے کہا نسبت! کسی کا مشورہ ہے کہ تو دوبارہ چہل جا کہ وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔ مولوی مہرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پا کر مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ گاندھی جی مجھے پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں۔ غرض کہ مہری جان ضیق میں ہے۔

لوگو، سہو کہ یہ دل انتقام اُرد درد کی آگ سے پھلکا جا رہا ہے۔
 تین تلہا خون نہیں بہا سکتا، اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں لکھ رہا ہوں۔
 مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔
 تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں
 مہری خونچکان تحریر ان کے لیے پیغام موت ثابت ہوا۔ "سرمایہ اور مصلحت
 کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے۔ وہ طبقہ مصلحت کش
 ہی ہے جو تقسیم کی بے انصافیوں کو دور کر کے پھلدار کے ذرائع کو
 انتہائے عروج پر لے جا سکتا ہے۔ شاعر اس کی فتح یا بے کثرانہ یوں گاتا ہے :

"وہ مبارک ساعت آپہنچی۔

ہتھوڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو گات کر رکھ دیتا ہے
 راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں
 تمہاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے
 تمہارا بارِ گناہ اتھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے
 وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اسی کے گھٹ گاتا ہوں۔
 اس کا توتنا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔

اُنچی صارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشیں ہمیشہ تنہارے آگے سر بسجود رہے گا۔

جو لوگ فرط احترام سے مادر گھٹی کو اپنا اور ہلکا بچھونا بناتے ہیں وہ انہیں ہی اپنا وارث بنائے گی۔

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لہت کر متی اپنی یکانگی کے اعلان کرتی ہے۔

آج بے کسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطن گھٹی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔ اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھینک دو۔ فلک کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے۔ ہمارے سروں پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مزدوروں کی جدوجہد کو مؤدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں۔ ایک کا دکھ سب کے لیے موجب اندوہ ہے اور ایک کی توجہ بنی نوع انسان کی توجہ ہے۔

آج دنیا کے کل بلند من کت رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دور بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے! نذر اسلام شباب کا ہمدون اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ تدبیر کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں چھاؤنی کی کبھی نہیں بلکہ جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس کی شاعری ادب ہند کے رستے میں ایک نئی لکڑی ہے جو بھائی ہے کہ آرت موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے۔ وہ اس روح کو متا

دے گا جو جسم کو قیود سمجھتی ہے۔ وہ استعداد و استعداد کو فلا کر کے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا۔

ادب جدید کی ضرورت | اس مخصوص سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ادب ہند کا دور قدیم

حفاظتی زندگی سے نا آشنا اور بالکل داخلی تھا۔ کوئی حل پیش کرنا تو دور نگار وہ زندگی کے مسائل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ دور جدید زندگی سے اس حد تک بے گمان نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں۔

ادب کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو۔ انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل درد انسانی کی دلیل ہے۔ اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔

اب اسے اس جذبہ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابدالابد تک ہے اور انسان اس کا کار ساز حقیقی ہے۔ قیامت کے معاملے میں کہ روح الاجتماع اور معشر بن کر استعداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے اور پھر اسی زمین پر ایک ایسے بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی جسمانی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکے۔ انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا رستہ بھی ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پلہندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حائل ہوں۔ یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے، لہذا میرا

خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پلشن خوار داروغہ ہے جو نا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے۔ ایسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے دلانے اور سلانے میں مدد پہنچائیں۔ پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیا دار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے۔ اور وہ تعلیم زدہ لوگ ہیں جو زن مزید شاعروں کی تہلقدی سانسوں سن کر کسی مجلس کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیڈوٹن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بتیروں کی طرح توپ رہے ہوں۔ آپ اب تک انہیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ کیا آپ کی آئندہ

ادبی کاوشیں بھی انہیں کے لیے وقف ہوں گی؟ —

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ زمین دار اور سود خوار چونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں۔ مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں۔ اس کی بھوی روتیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے۔ اس کے بچے بھوک سے تلک آکر آپ کی جیب پر گہات لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے۔ وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتھیلے جس کے لیے لغت میں 'مالک' کا لفظ تراشا گیا ہے۔ قہد خانے کی کوٹھڑیوں سے بدتر جھونپڑیوں میں پلنگ اور ہیٹے میں توپ کر رہا بھوکا اور تلکا مزدور اس حسرت میں مرجاتا ہے کہ مادرِ اڑی کا سانپ پاکستانی امیر کا کتا کہوں نہ ہوا! —

کہا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کہا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کہوں ہوتا ہے؟ کہا کبھی ان اسباب و علل کو متائے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعث نلگ ہیں۔ ایسے ادیبوں کے لیے کروڑا تین کہتا ہے: ”کیا تم مصنف بلنے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہو جاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو۔ اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بھتیس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے؟“

گویا ادب آج کبیر داس کی زبان میں کہہ رہا ہے:

’کبیرا‘ کھڑا بازار میں لیے لکاتھی ہاتھ جو گھر پہونکے آ پڑا چلے ہمارے ساتھ۔

ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ روپیہوں کے لیے چمکے گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل و بے درد شہریوں کے زر خرید قلام ہیں۔ ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبہ پیغمبری دیتے ہیں۔ جو حق گو اور حق دوست ہیں اور جو سچ کہتے ہوئے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے۔

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔ اردو اگر قومی زبان بلنا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات و جذبات کا حامل بلنا چاہیے۔ وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بلنے کا استحقاق نہیں رکھتی جس کے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو۔ یعنی اردو کے ادیبوں کو روا داری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے۔

متوسط طبقے کی زندگی بند پانی کی موری ہے۔ عوام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور انہیں بتائیے کہ وہ اس خستہ حالی میں کہوں ہیں اور

کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں —

اردو ادب کی زن پرستی دونوں جلسوں کے لیے باعث عار ہے۔ پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطہ نگاہ کو یکسر Masochistic (خود اذیتی) بنا دیا ہے۔ سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں۔ جلسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کر سکتی ہے —

مولویوں اور پلڈتوں کی زبان میں گفتگو بلند کھجیے۔ عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انہیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے۔ ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپورت ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کھجیے —

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بلڈھے اور اس کے آرگن شایع کھجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعترافات کا جواب دیا جاسکے —

ہر سہاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جد و جہد سے الگ اور نا آشنا ہیں تو اس کی ذمہ داری ان کے تعلم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوجھام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادیب بھی اپنے بلگالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ "ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعی انسانیت کا خادم" مصور اور پھشوا ہے۔ —

سوچھئے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پلہاں ہیں، مسائل حال کیا ہیں اور مستقبل کی راہ کیا ہے۔ اپنا انداز بیان

کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے
بہداری کا قہور بن جائے —

اور آپ کا مذہب کیا ہو؟ تھکوروں سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس
کا جواب دہائے ادب کا جواب ہے۔ ”مہرا مذہب وہ ہے جو ہر آئینہ
کا مذہب ہونا چاہیے۔ میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان
نہیں ہوں۔ مہری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور مہرا
پیغام ان کے ارتقا کے لیے ہے۔ مہری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت
میں گم ہو گئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں۔“

اور آپ کا فرض کیا ہے؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے۔ کروڑاٹن
کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب
ہے: ”اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی املگوں کا احساس ہونا
ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا
پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو — یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں
سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے — تو مضبوط
بلو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو۔“

اپنے چاروں طرف زندگی کی نظم دیکھی کرو۔ خبردار! اگر تم دھوکا
دو گے، جھوٹ بولو گے، اور سازش کرو گے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو
جاؤ گے، تعزیتی میں جاؤ گے اور تمہاری حالت اس فلام کی سی ہو
جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے! اگر تمہارا رجحان طبع
اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کم زور، حقیر
اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔ تمہاری
طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابل رحم سمجھیں گے — سوچو

رحم و کرم کے قابل ہو جانا۔ انتہائی ذلت ہے۔ اگر خود اپنی صلاحیت کے بال
و پر نوچتے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو۔ اس کے خلاف خود کو کمر بستہ
کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی
توعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو — تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق
کے خلاف بغاوت کرو۔ جہاد کرو تاکہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر
کر سکے۔ یقیناً جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں چورو حانی مسرت حاصل
ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی —“

تیگور کے ان بی مضامین

- ۶ -

تاریخی ناول

(مترجمہ پلڈت ونشی دھر صاحب رہا النکار)

انسانی معاشرے کا وہ بچپن کہاں گیا جب قدرتی واقعات اور مصلحتی انسانی خیالات بھائی بھنوں کی طرح ایک خاندان میں ایک ساتھ کھیلنے ہوئے بڑے ہوئے تھے۔ یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات و خیالات میں ملحدگی کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جائے گی۔ کسی زمانے میں دامائن اور مہابھارت تاریخ کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاریخ انہیں اپنے زمرے میں شامل کرنے میں بہت پس و پیش کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ شاعری کے ساتھ تاریخ کا بھاہ ہو جانے سے اس کا بلس مت گیا ہے۔ اب اس کے خاندان کو دوبارہ ابھارنا اتنا مشکل ہو گیا ہے کہ تاریخ شاعری ہی کی شکل میں اپنا تعارف کرانا چاہتی ہے۔ شاعری کہتی ہے ” بہن تاریخ ! تمہارے اندر بھی بہت کچھ جھوت پھرا ہے اور مجھ میں بھی بہت سی سچائیاں ہیں اس لیے ہم دونوں پہلے کی طرح میل ملاپ کر لیں۔“ تاریخ کہتی ہے ” نہیں بہن، اپنے اپنے حصے تقسیم کر لیتا ہی اچھا ہے۔“ علم کے امین * نے ہر جگہ یہ تقسیمی

زمین کے حدود کے متعلق جھگڑوں اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے - رکاری

۴۴ ب کو کہتے ہیں -

کام شروع کر دیا ہے - حقیقت اور تخیل کی سلطنتوں میں حد بندی کے خطوط کھینچنے پر اس نے کمر باندھ لیا ہے -

تاریخ کی حد عبور کرنے کے جرم میں تاریخی ناولوں کے خلاف جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان سے ادبیات کا شہرازہ منتشر ہو رہا ہے -

اس قسم کا اعتراض صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں کیا گیا ہے ، صرف نوین بابو * اور بلکم بابو ہی مجرم نہیں ٹھہرائے گئے ہیں ، بلکہ تاریخی ناول نویسوں کا پیشوا اور امام اسکاٹ بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکا -

موجودہ انگریز مورخین میں فری مین صاحب کا نام بہت مشہور ہے - ناولوں میں تاریخ کی جو متنی پلید ہوتی ہے اس پر انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے بارے میں جو لوگ کچھ بھی جاننا چاہتے ہیں انہیں اسکاٹ کا آئون ہو (I von hoe) نہیں پڑھنا چاہیے -

بے شک ہمیں یورپ کی صلیبی جنگوں کے بارے میں حقیقت و آئمی کا علم حاصل کرنا چاہیے لیکن اسکاٹ کے آئون ہو میں ابدی انسانی معاشرے کی دوامی سچائی کا عکس دیکھنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے - صرف یہی نہیں لیکن اس کے جاننے کی خواہش اتنی زبردست ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صلیبی جنگوں کے متعلق اس میں بہت سی غلطیاں ہیں ، طلبہ ، پروفیسر فری مین سے چھپا کر آئون ہو کے پڑھنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتے -

اب قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا سروالتر اسکاٹ تاریخی واقعات اور ادبیات کی حقیقت دونوں کا لحاظ رکھ کر آئون ہو کو نہیں لکھ سکتے تھے ؟ -

وہ لکھ سکتے تھے یا نہیں اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ

مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں تاریخ اور ادبیات کا لحاظ نہیں رکھا۔

یہ ممکن تھا کہ انہوں نے جان بوجہ کر ایسا نہ کیا ہو، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ پروفیسر فری مین صلیبی جنگوں کے متعلق جس قدر جاننا تھا اسکا اتنا نہیں جانتا تھا۔ اسکاٹ کے زمانے میں واقعات کی تشریح اور تاریخی حقیقتوں پر غور و خوض کرنے کا طریقہ اس قدر ترقی پر نہیں تھا۔ مخالفین کہیں گے جب اسکاٹ لکھنے کے لیے بیٹھا تھا تو لازم تھا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر لکھتا لیکن تحقیق کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ہم قطعی طور پر یہ کب جان سکیں گے کہ صلیبی جنگوں کے متعلق تمام معلومات حاصل ہو چکی ہیں، ہم یہ کس طرح جان سکیں گے کہ آج جسے ہم تاریخ کی اٹل سچائی کہہ رہے ہیں کل نئے دلائل اس کے سر سے حقیقت کا تاج نہیں اتار لینگے؟ جو لوگ موجودہ مروجہ تاریخ کا سہارا لے کر تاریخی ناول لکھیں گے کل کے نئے مورخین اگر ان ناولوں کی بے قدری کریں تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے؟

مخالفین کہیں گے کہ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جتنا جی چاہے ناول لکھو لیکن تاریخی ناول مت لکھو۔ اگرچہ یہ خیال ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن انگریزی ادب میں اس کی بازگشت سدائی دے رہی ہے۔ سرفرانسس پال گریو کہتے ہیں کہ تاریخی ناول ایک طرف تاریخ کا تو دوسرے طرف کہانی کا بھی بڑا دشمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناول نویس کہانی کی خاطر تاریخ پر حملہ کرتے ہیں اور پراگندہ تاریخ کہانی کو خراب کر دیتی ہے۔ اس طرح کہانی کا سسرال اور مہکا۔ ونوں نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے اعتراض کے باوجود تاریخی شاعری اور ناول ادبیات میں کھوں

جگہ حاصل کرتے ہیں اس مضمون میں ہم اس کے اسباب کی وضاحت کریں گے۔
 سلسلہ کی ادبی کتابوں میں شاعری ایک رس بھرے جملے کو قرار دیا
 گیا ہے۔ شاعری کے متعلق اس سے زیادہ مختصر اور وسیع المعنی تعریف ہم
 نے کہیں نہیں دیکھی۔ بے شک رس کی تعریف کو سمجھانے کا کوئی طریقہ
 نہیں ہے۔ جس شخص میں رس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہے اس
 کے لئے رس کی تعریف بے معنی چیز ہے اور جس میں نہیں ہے اسے ان
 باتوں کے جاننے کی ضرورت ہی نہیں۔

سلسلہ کی ادبیات میں اصلی رسوں کی نو قسمیں * بیان کی گئی
 ہیں۔ لیکن بہت سے ناقابل بیان اور ملے ہوئے (مکب) رس بھی ہیں
 جنہیں بیان کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔

انہیں متروک رسوں میں سے ایک کا نام ”تاریخی رس“ رکھا
 جاسکتا ہے اور یہ رزمیہ رس شاعری کی جان ہوتا ہے۔

کسی خاص شخص کا دکھ سکھ اس کی ذات کے لیے ہی کہا کم ہے۔ دنیا
 کے بڑے بڑے واقعات اس کے سامنے ساپے کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگر
 اس طرح کسی خاص شخص یا اشخاص کی زندگی کے واقعات کے مدو
 جزو عمل اور رد عمل ناول میں بیان کیے جائیں تو رس درجہ کمال
 کو پہنچ جاتا ہے اور رس کا یہ جوش ہمارے دل پر گہری چوت کرتا ہے۔
 ہم میں سے بہتوں کے رنج و راحت کا دائرہ محدود ہے۔ ہمارے جذبات

۱۔ نو قسمیں یہ ہیں۔ (۱) شونگار یعنی عشقیہ۔ (۲) ہاسیہ یعنی مضحک۔ (۳) کون
 احساس فم پیدا کرنے والا۔ (۴) ویر یعنی رزمیہ۔ (۵) رودر یعنی فصلا پیدا کرنے والا۔
 (۶) پھیلاک یعنی قرارنا۔ (۷) بی بہتس یعنی نفرت انگیز۔ (۸) ات بہت حیرت انگیز۔
 (۹) شائے جس میں سکون ہو۔

کی گرمی چلند رشتہ داروں اور احباب تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ وہی درکش * میں نگیندر، سوریم مکھی اور کند ندنی کے عیش و کلفت اور رنج و راحت کو ہم اپنا ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان تمام تکلہفوں اور راحتوں کا مرکز نگیندر کا خاندان ہے۔ نگیندر کو اپنا پڑوسی تصور کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

لیکن دنیا میں بہت کم لوگ اس بام رفعت تک پہنچتے ہیں دکھ سکھ دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ حکومتوں کا عروج و زوال، زمانے کے آئندہ واقعات کا سلسلہ، ان کی روز مرہ کی زندگی ہی کے کار نامے ہیں۔ ان کی کہانی جب گہت بن جاتی ہے تو رہا بہ عالم اس کے سر کم تھیک کرتا ہے اور بچانے والے کی انگلیاں ہر تار میں ایک عجیب، پرسکون اور بہت دور تک پھیلنے والی مسلسل جھلکار کو بیدار کر دیتی ہیں۔

انسان کے ساتھ زمانے کی یہ رفتار ہمیں روزانہ دکھائی نہیں دیتی قوم کی تاریخ، کو بدلنے والا اس قسم کا کوئی بڑا آدمی اگر ہمارے سامنے موجود ہو تو بھی موجودہ مختصر زمانے میں وہ اور اس کے کارنامے دونوں اکٹھے نظر نہیں آسکتے۔ اس لیے اس قسم کے لوگوں کو ہم انہیں کے زمانے میں تھیک طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں اگر ہم ایک خاص شخص کی شکل میں نہیں بلکہ زمانے کے ایک جز کی شکل میں دیکھنا چاہیں تو ہمیں ان سے دور کھڑا ہونا پڑتا ہے، انہیں ماضی کے پس منظر میں دیکھنا پڑتا ہے، وہ جس عظیم الشان استہیج کے ہیرو تھے انہیں اور اس استہیج کو ملا کر دیکھنا پڑتا ہے۔

ہمارا روزانہ کے دکھ سکھ سے دور ہو جانا یعنی جب ہم نوکری کرے، روکا کر، کھا پی کر رقت گزار دے ہوں اس وقت دنیا کے شاعر عام پر جو بڑے بڑے رتھ بان دنیا کے رتھ کو چلاتے ہوئے جا رہے ہیں، چلد لہو کے لیے ان کا خیال کر کے زندگی کے اس تلک دائرے سے باہر نکل آنا، یہی حقیقی طور پر تاریخ سے لطف اندوز ہونا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے کامل طور پر تخیلی نہیں ہو سکتے لیکن جو قصے قدرتا ہم سے دور ہیں جو ہمارے علم سے بالا تر ہیں، انہیں کسی بہانے سے اگر ہم حقیقی واقعات کے ساتھ ملا دیں تو مصنفوں کے لیے، پڑھنے والوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ رس کی تخلیق ہی مقصد ہے۔ لہذا اس پیدا کرنے کے لیے تاریخی ذرائع کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے شاعر ان سے کام لہے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتے۔

شہر سپر کے انتقالی اور کلیو پتھرا ڈراما کا جو مرکزی نقطہ ہے وہ دنیا کے لیے ایک آزمودہ اور روز مرہ کی جانی بوجھی حقیقت ہے۔ بہت سے غیر معروف، گم نام اور قابل اشخاص نے عورتوں کے موہ لہے والے جال میں پھنس کر دین و دنیا خراب کر لی ہے اور اس طرح کی چھوٹی چیزوں کے اہم بن جانے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے حسرت ناک مفاظ سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

ہمارے روز مرہ کے دیکھے بھالے مرد اور عورت کی محبت کے زہراور اموت بھرے کار ناموں کو شاعر نے ایک عظیم الشان تاریخی اسٹیج پر لا کر نہایت وسیع اور شان دار بنا دیا ہے۔ ذہن کے انقلاب کے بعد مسلک کا انقلاب شروع ہوتا ہے۔ محبت کی کش مکش کے ساتھ روم کے تمام لوگوں

میں پھوٹ ڈالنے والی زبردست جنگ کی تہاری ہوتی ہے۔ ایک طرف کھلو پھترا کے نشاط خانے میں فزل خوانی ہو رہی ہے اور دوسری طرف سندر کے کنارے طبل جنگ گونج رہا ہے۔ شاعر نے مصہبت اور احساسِ ضم کے رس کے ساتھ تاریخِ کارس ملا دیا ہے۔ اس لیے اس ڈرامے میں دل کو ایک جھوٹ انگیز وسعت مل گئی ہے۔

مورخ مسن اگر شکسپیر کے اس ڈرامے کو عالمانہ حوالوں کی روشنی میں دیکھے تو اس میں سہو زمانی (Anachronism) اور تاریخ کی بہت سی غلطیاں نظر آسکتی ہیں۔ لیکن شکسپیر نے پڑھنے والوں کے دلوں پر جو جادو کر دیا ہے، غلط اور بگڑی ہوئی تاریخ کے ذریعے جس تاریخی رس کی تخلیق کی ہے وہ جدید تاریخی تحقیقات کے باوجود بھی مٹ نہیں سکتا۔ اسی لیے ہم نے اس سے پہلے کسی تنقیدی مضمون میں لکھا تھا کہ "ناول میں تاریخ کے مل جانے سے ایک خاص رس پیدا ہو جاتا ہے۔ ناول نویس صرف اسی تاریخی رس کے حریص ہوتے ہیں۔ تاریخی حقیقت کی انہیں کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص ناول میں تاریخی رنگ و بو سے مطمئن نہ ہو اور اس میں سے پورے تاریخی اجزا کو نکال لے لے تو یہ گویا سالن میں زیرہ، ہادی، دھنیا اور سرسوں کی تلاش کے مصداق ہے۔ مسالے کو ملا کر جو لوگ سالن کو لڈیڈ بنا سکتے ہیں وہ بلائیں اور جو اسے پیس کو سالن میں ڈالتے ہیں ان سے بھی ہمیں بحث نہیں کہونکہ یہاں صرف مزے سے فرض ہے مسالا تو اس کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی ناول نویس اگر تاریخ کو جوں کا توں دیکھ کر ناول لکھیں یا اس کے اجزا ملا کر تاریخی رس پیدا کر سکیں تو انہیں اپنے مقصد میں کامیاب سمجھنا چاہیے۔ اس لیے اگر کوئی رام چندر کو ادنیٰ اور راون کو اعلیٰ حیثیت

میں پیش کرے تو کہا کوئی جرم نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا۔ لیکن وہ جرم بلحاظ تاریخ نہیں بلکہ بلحاظ شاعری ہوگا۔ مقبول عام حقیقت کو ایک دم پلٹ دینے سے رس کا مزا جاتا رہتا ہے۔ گویا مطالعہ کرنے والوں کے سر پر ضرب سی لگتی ہے اور اس سے شاعری چست ہو کر گر پڑتی ہے۔

یہی نہیں! اگر کسی جھوٹی بات کو بھی مدت سے عام لوگ سچ ماننے چلے آ رہے ہوں اور اگر تاریخ اور سچائی کے لیے شاعری اس کے خلاف احتجاج کرے تو یہ شاعری کا جرم ہوگا۔ تصور کھینچے کہ اگر آج بھر کسی شبہ کے یہ ثابت ہو جائے کہ شرابی اور بے اصول یادوں کا خاندان یونانی قوم میں سے تھا اور سری کرشن بنوں میں آزادی سے گھومنے والا اور بانسری بجانے والا یونانی قوم کا ایک گوالا تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا رنگ اس کے بڑے بھائی بلدیو کے رنگ کی طرح گورا تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جلا وطن ارچن ایشیائے کوچک کی کسی یونانی حکومت سے یونانی شہزادی سوہدرا کو چھت لایا تھا اور دوار کا سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جلا وطنی کے وقت پانڈوؤں نے فن جنگ کے ماہر عالی دماغ یونانی بہادر کرشن کی مدد سے اپنی حکومت دوبارہ حاصل کر لی تھی اور اس کی باکمال غیر قومی سیاست، جذکی مہارت اور ایسے مذہب کا علم جس میں عمل کی بڑی اہمیت تھی ان خصوصیات سے حیران ہو کر ہندوستان نے اسے اوتار مان لیا تھا، تو بھی وید و یاس کی مہابھارت نہیں مت سکتی اور کوئی نیا شاعر جرأت کر کے کالے کو گورا نہیں بنا سکتا۔

ہم نے یہ باتیں سرسری طور پر کہی ہیں۔ نوہن بابو اور بلکم بابو اپنی شاعری کی کتابوں اور ناولوں میں مروجہ تاریخ کے خلاف اتنی دور

جا پڑے ہیں یا نہیں جس سے شاعری کا رس جاتا رہا ہے ، اس کا اندازہ ان کے گرنےوں کی خاص تہقید کے وقت ہی کیا جاسکتا ہے —

اس حالت میں ہمارا کیا فرض ہے ؟ ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیے یا آؤن ہو ؟ اس کا جواب بہت آسان ہے ۔ دونوں پڑھنے چاہئیں ۔ حقیقت کے لیے تاریخ پڑھنی چاہیے اور لطف کے لیے آؤن ہو ۔ کہیں ہم غلطیوں ہی کا علم نہ حاصل کر لیں ، اس خدشہ سے جو شخص شاعری کا لطف نہ اٹھائے گا اس میں شئے لطف کی کمی آجائے گی —

شاعری میں جو تاریخی غلطیاں ہمیں نظر آئیں گی ہم انہیں تاریخ میں درست کر لیں گے لیکن جو شخص صرف شاعری کی کتاب پڑھے گا اور تاریخ پڑھنے کا موقع نہ پائے گا وہ بد نصیب ہے اور جو شخص صرف تاریخ ہی پڑھے گا اور 'سے شاعری کے مطالعے کا موقع نہ ملے گا غالباً یہ شخص پہلے سے بھی زیادہ بد نصیب ہے —



سخنوران ایران در عصر حاضر

از

(از جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی پرونیسز ارژنگ آباد کالیم)

جنبش ادیبانه و مسافرت دانشمندان جناب آقا ... محمد اسحاق

نوید زندگی بخشی میدهد و آنلده بسیار درخشانی را بنزدیک میکند - کم کم ذوق و شوق علمی و تشنگی و اشتیائی صادق در مشرق پیدا می شود - آهسته آهسته حاسه دانش پژوهی و چشم بصیرت مشرقیان بیدار گشته رفته رفته احساس حقیقت جوئی و عاطفه تحقیق طلبی آنان را تکان داده بجنبش انداخته است از به راهت تقلید بیرون آمده بشاهراه تحقیق افتاده اند - این بهترین نشان درخشان و علامت نمایان بیداری مشرقیان است -

دای ترقی اروپا

ترقی اروپا از یک نقطه بسیار مهمی آغاز گشته و رفته رفته بزرگ گردیده و بالاخره به تمام شئون زندگی محیط شده است -

اروپا دهین ملت آن اشخاص باهمت و حوصله مدد است که با پائیمردی و حس درشاهراه تحقیق و انکشاف افتاده اند و پافشاری نموده هر چیز را درجا و محل آن تحقیق و انکشاف کرده اند ، کیمها و طبیعیات را در عالم تجزیه و مشاهده و تجربه ، جغرافیا ، بحری را در دریا و بری را

در کوه و صحرا، زبان بهگانگان را در وطن آنان و همچنین هر چیز را از راه خود آن و درجا و مرکزی تحصیل و تحقیق کرده اند - سپس باهوش کافی و موشگافی آن راه مرتب ساخته اشاعت داده اند و در نمایش گاه عالم عملی گزارده اند -

پایه بلند ایران شناس بزرگ و معروف استاد ادورد برون مرحوم (Edward Brown) نیاز مند معرفی نمی باشد - این استاد بزرگوار برای تحقیقات ادبیات زبان فارسی از انگلستان دهسپار ایران گردیده - کوه و بهابان را در نور دیده رو بمرکز نموده داخل محیط ادبیات زنده شده است - جلوس ادباء، انوس شعرا، هنشپن خاص و عام گشته - وضع مملکت را مطالعه کرده - باروح ادبی، احساسات شعری، عواطف ملی، آداب و اخلاق و نفسیات ایرانیان آشنا شده - نه تنها ایران شناس شده بلکه متعلق به آداب ایرانیان گشته، محفل آرا، مہمان نواز، ایران پرست گردیده - پس قدم در جاده ادب گذاشته و قلم تحقیق را بصحرکت آورده است - همیشه و هر جا از خامه و زبان او روح، عواطف، احساسات ایرانی تراوش میکند و با این حال تاریخ ادبیات ایران نوشته است - این است رفتار یک محقق اروپائی که از راه دور و دراز با وجود بهگانگی ادبی و اخلاقی و زبانی رو بایران میکند -

حال می رویم بر سر مطالب - اردو زبان، مشرقی، همسایه ایران، که یگانگی ادبی، اخلاقی با فارسی زبانان دارد، روح ادبیات هردو یکی است، باید برای تحقیقات ادبیات فارسی توجه مرکز کرده خود داخل محیط ادبیات زنده شود، و خود برای تحقیق ادبیات شاهراه نزدیکی کشف کند، نه که مانند مقلدین گمراه شده راه دور و دراز پویش گرفته

خود را گول زده و دیگران را هم فریب دهند -

بنا برین مسافرت جناب محمد اسحاق و تالیف کتاب "سخنوران

عصر حاضر" آئینۀ درخشانی را بما نزدیک میکند -

سرپرستی هندوستان از فارسی گزشتۀ درخشانی را تربیت و پرورش داده است - آقا سعید نفیسی تاریخ و تذکرۀ ادباء و شعراء فارسی زبانان هند را تالیف کرده اند و بسپار پسندیده است - سلسلۀ ادبی هندوستان و ایران گسیخته شد و مسئولیت هندوستان دو چاند شد (انگریزی اردو) مگر تعلقات اردو و فارسی بحال خود باقی ماند ، و هندوستان مستقیم و غیر مستقیم باز از فارسی سرپرستی کرده دست از نواز شہای ادبی نکشد - باز در همین قرن جدائی دست و زبان ادب پژوہان هندوستان ادب و زبان فارسی را در هند زندہ نگاہ داشته است ، و فقط تاریخ همین قرن دربارهٔ ادبیات و زبان فارسی در هندوستان محتاج نگارشی رسالہ جداگنہ است - و این جا فقط بہ سه خدمت بزرگ اشارہ می شود - (۱) شعرالعجم - از علامہ بزرگ مرحوم شبلی نعمانی این اعجوبہ دہر در شعر عجم شناسی یکتا و بے مانند است در پنج جلد تاریخ ادبیات شعری فارسی تصنیف نمودہ و با کمال استادی و نکته سلجی تاریخ روحی و شعری شعراء را توضیح و تشریح نمودہ و عظمت روح شعری فردوسی و سعدی و حافظ را در نمائش گاہ عالم ادبیات بے پردہ کردہ است و بہ روان قدما و متوسطن و متاخرین ترو تازگی بے اندازہ بخشیدہ است -

(۲) جناب دکتر اقبال کہ با زبان فارسی مقاصد حکیمانۂ خود را سرودہ اند و در عالم ادبیات یک فلسفہ جدیدی اضافہ نمودہ اند - چون ایشان

در فلسفہ مغرب نیز استادند و با ذوق شعری اردو پائی آشنا فوق العادہ اشعار ایشان تجدد معلوی و فکری دارد، و زبان فارسی را آئینہ تفکرات جدید خود قرار داده اند، افکار ابتکار ایشان کہ در زبان فارسی سرودہ اند شہر تہی بار و پاہم رسیده و از زبان فارسی بہ زبان خارجہ ترجمہ شدہ است۔

(۳) ”سنگھ واران عصر حاضر“ است کہ موضوع این تبصرہ است۔

قدر و قیمت سنگھ واران عصر حاضر

تعلقات اردو بہ فارسی

فارسی با شاہنشاهی مسلمانان بہ ہند در آمدہ با ہم فرمان فرمائی می کردند۔ سرانجام سلطنت مسلمانان دو بزوال نہادہ فارسی پائنداری کردہ بہ شکل و قالب دیگر در آمدہ و نام نوی بخود گرفت۔ یعنی روح فارسی با تمام معلی (ترکیبات ، تشبیہات ، استعارات و غیرہا) در قالب تازہ حلول کردہ با اسم اردو باز دست از فرمان فرمائی نکشید۔ امروزہ متہوان گفت در ہندوستان، هیچ زبانے مانند اردو عدومت ندارد و شمارہ اردو دانان (ہنود و مسلمانان و اردو پائہان) از تمام زبانہاے بومی و بیگانہ بیشتر است از کابل گرفته تا مندلی (Mandalay) زبان اردو آلت تبادلت خیالات اقوام گوناگون است۔ بلکہ بہ ساحاہاے دور دست نیز دست اندازی کردہ است در بیرون ہند زبان این مملکت را ہمیں زبان اردو مہدائند و بس۔ از زبان ہندی و ہندوستانی تلہ اردو میخواستہند در جاہاے کہ برای کار و بار تدریس زبان این مملکت مہدہند همان اردو است۔ کسی بخواہد یا نخواہد، بداند یا نداند، کشور پهن و دراز ہند مہدان و جولانگاہ اردو است۔ و آن زبان بومی کہ ادہاے مقابلگی با اردو می کند دائرۂ مختصر تلگی دارد۔ اردو یک زبان عجیبی است شاید نظیر نہ داشتہ باشد۔ مدارج ارتقاء خود را

در کمترین وقت طے کرده، و خزائن ادبیات خود را مخصوصاً نظم، زود معبود و آباد نموده است - نشر و زبان علمی نهر بسرعت شکفت انگریزی دارد خود را بسر منزل خویش نزدیک می کند - اگرچه اردو هندی الوطن است و شمائل آن شباہت ظاہری تا می بزبان هندی دارد مگر روح آن و حرکات و سکنات از فارسی است، و روح فارسی باتمام، علمی و جمیع خصوصیات در آن حلول کرده است - اگر اردو بخواهد قطع بستگی خود از فارسی بنماید اولاً خزائن ادبیات خود را بدست خویش آتش میزند ثانیاً باید بطور قہقری برگشته در عالم نشو و نمائی طفولیت در آید و این خلاف قانون فطرت است - به فرض محال در آن حال نه ادبیات نه نظم و نه لغت می ماند و اردو منلس متحضر می شود - سخن کوتاه از اردو تنها یک نام باقی می ماند - نام هم (اردو) از بهر دن آمده کشتنی است یا باید تبعید (شهر بدر) شود - اردو یادگار عهد زرین اتحاد مسلمانان و هندو است - روح و خیال از مسلمانان و ساخت جسم از هندی است -

بنابراین اطلاع از ادبیات عصر حاضر برآء اردو دارای اهمیت است هر دو دوره تکامل را دارند طے می کنند - هر دو اشتراک روحی دارند - بالآخره تجدیدات فارسی را باید بغور مطالعه کرد - هر چه برآء اردو مفید است باید اختیار نمود و هر چه زیان بخش است پرهیز از آن لازم است - مسافرت دانشمند محترم آقا محمد اسحاق داراے اہمیت است -

اول، محققانہ براے راست افتادہ در محیط ادبیات زندہ رفته اند -
دوم، تنها ذوق علمی، شوق مشاہدہ، حس حقیقت جوئی متحرک این سفر است -
سوم، سفر نتیجتاً تحقیقی خود داده و سه جلد بزرگ ادبیات عصر حاضر فراهم و جمع آوری کرده اند -

‘چہارم’ ایمان اول مصطفیٰ است کہ ادبیات زبان حال را معشقانہ در ایران جمع کردہ و ہندوستان و ممالک دنیا را بآں آشنا می کند۔

آوازۂ چہار جلد تاریخ ادبیات ایران تالیف استاد بزرگ مرحوم ادورد برون (Edward Brown) بگوش ادب پژوہان رسیدہ و بہتر آن را خواندہ اند۔ استاد مرحوم از آنجا کہ دست رس تحقیق بودہ آغاز کردہ و ہ بزمان حاضر خانہ مہدہد و زندگئی مرحوم حسین جانجام یافت۔ ادبیات زبان حاضر منتظر استاد و مصطفیٰ دیگر بود۔ در واقع این سہ جلد ادبیات عصر حاضر متمم و مکمل کتاب استاد برون مرحوم است۔ لکن این چہار جلد تاریخ ادبیات است و سہ جلد عصر حاضر ادبیات است و تاریخ و تذکرہ مختصر و مہدی ہم دارد۔ امید است آیلدہ جلدی تاریخی بہتری پدید آید۔

کتاب ”سنگھوران عصر حاضر“ دارائی سہ جلد است۔ جلد اول طبع و مجلد شدہ زیر مطالعہ نگارندہ است۔ جلد دوم زیر طبع است۔ و این ہر دو در ادبیات شعری است۔ و جلد سوم فقط ادبیات نثری است۔ ہر سہ جلد (نظم و نثر) ادبیات عصر حاضر است یعنی دورۂ مشروطہ (از سال ۱۲۲۵ بعد مظفری) لکن تاہر سہ جلد ملاحظہ نشود آغاز حقیقیہ این ادبیات نمی توان نوشت۔ تبصرہ و انتقاد کامل ہم بعد از مطالعہ سہ جلد ممکن است۔ کفون تلہا تبصرہ مختصری دربارہ جلد اول کہ مطالعہ شدہ است ذیل نگاشتمہ می شود۔

(۱) کاغذ، طبع، خط، عکس، جلد ہندی آبرو ملداندہ است۔ و این نیز یکہ از علامتہای نمایان ہنداری مشرق است۔ کارکنان مطبعہ جامعہ ملیہ دہلی

مستحق تحسین و آفرین ہستند۔ کتاب با سلیقہ خوب و اسلوب مرفوب

مراحل زیبائی را طے کردہ و بحد کمال رسیدہ است۔

(۲) اداری تقریظی است از استاد معظم جناب جمال زاده و ایشان با چشم

حقیقت شناس اظهار حقائق کرده اند —

(۳) دیباچه خود جناب محمد اسحاق است که نظریات محققانه خود را مفید

و مختصر بهان نموده اند —

(۴) انتخاب قسمت اول از اشعار 'سخنوران عصر حاضر' که موضوع حقیقی

این تبصره است کلون تبصره مختصری نوشته و انتقاد سرسری نموده

قدرو قیمت ادبی کتاب به نظر ادب پژوهان می رساند —

حسن انتخاب

نگارنده ایرانی 'معلم' هر از دو سه سال یک دفعه تجدید عهد کرده و هسپار ایران شده و در شهرها و ایالات گردش نموده است و چندین بار در طهران قریب دو سال توقف داشته است و با بعضی شعرا آشنا و با اشعار عصر حاضر باخبر - و خود در همین دوره نشو و نما یافته است - نگارنده انتخاب را دیده خوبی و زیبایی آن تعجب خیز و طرب انگیز است - تعجب خیز است که چگونه یک نو وارد توانسته است با صدها ادبا و شعرا آمیزش کند و عالم ادبیات آنان را چنانکه نظر محققانه خود نموده و نقشه روحی ایشان را با مشقتها برداشته باین ارزانی در عالم ادبیات نمائش دهد - ازین جهت طرب انگیز است که بعد از ملاحظه و مطالعه کتاب روشن می شود که محقق با وجدان و طبع سلیم و در حسن انتخابات به احسن و جوة کامیاب است - و اسباب کامیابی را همه آماده کرده اند —

اول جناب منتخب در فارسی متبحر 'دوم در دارالفنون کلکته استاد بزرگ فارسی' سوم معرک ذوق علمی و اشتیاع صادق است 'چهارم توجه بخود ایران کردن' پنجم مشرقی و اردو زبان 'ششم اشتیاع اخلاقی و

ادبی، ہفتک ندیدہ باید گفت با اخلاق عالمانہ مورد توجہ عموم ادباء شدہ، و بواسطہ اشتہارے صادق شہانہ روز رنج کشیدہ و آرام را برخورد حرام کردہ اند۔ تلہایک حسّی حقیقت طلبی بر وجود ایشان فرمان فرما بودہ است۔

قدر و قیمت ادبی کتاب

انقلابات سہاسی، آزادی، فکری، تجدیدی، اخلاقی، تمدنی، اجتماعی، نیز از کتاب تا اندازہٴ می توان بدست آورد۔ و بالاتر از ہمہ درجہ انقلاب و تہرات ادبی می توان کشف کرد و دانست و فہمید کہ ادبیات فارسی راہ مشی خود را تہر دادہ است و از عالم تلک و تاریک بیرون آمدہ در جہان روشن و گشادہ پا گزاشتہ است و کم کم دارد خرد را بہ سرنیزل آیددہٴ خویش نزدیک می نماید۔ امید است بعد کمال رسیدہ در فضاے علمی یک ملت ہم آہنگ و یک تودہٴ یک نواخت بار آورد۔

انقلابات و تہرات زبان فارسی (زبان شعری)

یک جہتی و یک نوائی و عمومیت زبان است۔ و این وجہ داراے اہمیت فوق العادہ است و باید با نظر عمیق آنرا نگریستہ در اطراف آن سخن سرائی کرد۔ پیش ازین دورہ زبان فارسی اسیر دستہ بلندی و گرفتار پلجہٴ ادباء و شعرا بود و طبقہٴ شعرا صاحب امتہاز و فعال مایہاں بودند۔ علمائے دین را مذہبی، شعرا را شعاری، منشیہا را شیوہٴ و ادباء را دابی، دولتمان را تسلطی خاصی بود۔ عوام یک جادہٴ سادہ و راہی ہموار و روشی طبیعی خدا دادی داشتند۔ زبان ہم مانند مذہب سرکارش بہ دستہ بلندی کشیدہ بود۔ نشیب و فراز، پستی و بلندی زبان بہ نظر خوانندگان رسید۔ در زمان محمد شاہ (۱۲۵۰ تا ۱۲۹۳) بدستہاری چلک نویسدہٴ بزرگ تا اندازہٴ خوبی زبان ہموار و یک رخہ گردیدہ بود بہ پائہر دقّی "قائم مقام" و "فاضل خان

کروسی“ و چلند استاد دیگر سادہ نویسی و مطلب نگاری بروے کار آمده بود - و به کاستن برگ و شاخ انبوه باغ سخن آرائی تروتازگئی نوی یافت - و این دوش پیمش رفت کرده در آغاز (۱۲۶۲ھ) ناصرالدین شاه و وزادت مهرزا تقی خان یک دفعه جنبش خود را تیز نمود - اصطلاحات ملکی مهرزا تقی خان ، افتتاح دارالفنون (کالج) ، آشنائی بافرنگ ، شناسائی زبان فرانسه ، همه دست بهم داده رایج تغییرات و ترقیات و سمع شد - افسوس باز هم افسوس کشته شدن مرحوم مهرزا تقی خان ، چرخ ترقیات را از کار انداخت و حرکت ادبی نیز سست گردید - خلاصه این مطلب از موضوع بحث بهرون است - مقصود این بود که یاد آوری شود که ادب جدید دوره مشروطه دفعتاً و ناگهانی پیدا نه شده است عوام در هر چیز خوف زده شده اند و از چهار جهت خواص بر ذهن سادۀ عوام حمله می کردند - (۱) از جهت دور باس شاطران استبداد - (۲) از جانبی کور شو علم برداران شریعت - (۳) از سستی قلندره گوئی ادیبان - (۴) از طرفی مشکل تراشی شاعران ، ناچار طبیعت عوام کند و ذهن شان کور شده بود - به شلیدن و نه فهمیدن و خواندن و نه سنجیدن عادت کرده بودند بهترین تعریف عوام برای واعظ آن بود ، سبحان الله خیلی عالم است ، کسی حرفش نمی فهمد - این حرف را با سادگی برای بزرگواری واعظ می زنند در واقع درست می گفتند - واعظ خودش هم کلام خویش نمی فهمید گویا ناهمی هم مانند فهم محتاج استاد است و نادانی هم مثل دانائی از بزرگ بکوچک میسر - در حقیقت چنین است عوام حق دارند رفع تهست از خود نموده در مقام مدافعه برآمده بگویند - درست است ناهمی و نادانی بیماری است و متعدی می باشد مگر از بزرگ بکوچک رسیده ، از بالا پها نهن آمده است ، مرض خاص است لکن مرض عام شده ، آب از سرچشمه کیل آلود است -

برائے استقلالِ مملکت و جردِ عوام لازم شد لہذا شعراءِ ہزبانِ ایشان و ہزائے ایشان اشعارِ ملی و مصائبِ مملکتی سرودن گرفتند - هیچ مملکتی بدون پشتیبانی و اکثریت بمقصد نمی رسد و در واقع اکثریت مالکِ ملک است و اکثریت ہمیشہ زندہ است و زبانِ اکثریت زبانی است کہ قابلِ بقا و ارتقا است . پس باید اولاً زبان را یک جهت ساخت و همزبان با عوام شد بعد شروع بمقصد نمود - ادباء ، خطباء ، شعراءِ ایران مطلب را درک نموده با عوام یک جهت و همزبان شدند - و همزبانی اثرِ خود را کاملاً بخشید و ملتِ جاہل نادان و بے خبر بہ جلبش افتاد - در مملکت شعری ، ملتِ حساس شعراءِ ملی را وردِ خود ساخت ، ذوقِ شعری آن قوی شد و اشعارِ قلوب آنها را مستخر کرد —

اشعارِ عشقی عرفی ، ایرج مہرزا ، سید اشرف الدین ، مانند برقِ زبان زد عام و خاص گردید - تعجب اینجا است کہ بہمان درجہ کہ خواص ازین اشعار متاثر می شوند و چلد درجہ بیشتر عوام متالم می گردند و می فهمند این گونه اشعار بایک لہجہٴ نمکین و زبانِ سادہ احتیاجاتِ ملی ، مصائبِ مملکتی و ابا احساساتِ ملی و عواطفِ قومی ذہن نشین عوام می کلد و این بزرگ ترین مدرسہ است —

طلوعِ مشروطہ و آزادی ، پھس آمد یک مقصودِ عمومی ، مصائبِ ملی ، احساسِ احتیاجاتِ مملکتی ، ملتِ ایران را با ہم متحد کردہ ہم زبان ساخت و زبانِ فارسی بایک سرعتِ شگفت انگریزی گردیدان خود را از دست تفرقہ بہرون آوردہ در شاہراہِ یک چہتی افتاد - امہد است آیلدہ یک فہمائے علمی ، یک محیطِ ہموار ، یک ملتِ یک ساختی را بار آورد - طلوعِ مشروطہ زبان را آزاد و قلم را توانا ساخت - پھس آمدن یک مقصودِ عمومی نویسدندہ و

گویندہ را بسیار کرد - مصائب ملی خواننده و شنونده را فراوان نمود - احساس احتیاجات مملکتی مشی زبان را تغیر داد و شعرا از مقام خدائی خود پائین آمده همزبان عوام شدند - مراعات ذهن آنها نموده بفهم ایشان شعر سرودند - ادیبان و گویندگان سخنان خود را عوامانه ادا نمودند کم کم الفاظ عامه‌انه و بازاری راه درخلة یافته زبان زد ادبا و شعرا شده زبان را ساده و شیرین تر گردانید - عوام نهز باشوق و ذوق نزدیک آمده و برائے مطالب فهمی آماده شدند و از عالم تلگ و تاریک بهنجری بیرون آمده به دنیائی نوی داخل گشتند - اشعار وطنی 'سرودهای ملی بهترین معلم ایشان شد ایشان را سر گرم و پر جوش ساخته هنگام انقلاب را گرم کردند - برائے آزادی و آبادی نعره "زنده باد انقلاب" از جگر برکشیده دستخیز عام و متحشر ملی برپا شد - با پشت کاری خواص و پشتمانی عوام کاخ استبداد سرنگون گردیده سلطنت ملی شد -

وطنیات

ادبیات شعری فارسی پیش از مشروطه یک دنیای پهلای و معنای است و پهلادری آن زیاده تر از درازی است - یعنی موضوع کوتاه 'مضمون کم و بد بخانه مکرر است عبارت دیگر مضمون و موضوع کم و شاعر بسیار - از اینجا است که یک موضوع کوچک خسرو شیرین 'للهی مجنون' فرهاد شیرین 'یوسف و زلیخا' مهدان مقابله و مبارزه شعرا است و شعراء بزرگ برائے یک موضوع کوچک بجان هم افتاده اند گویا عالم خیال هم مثل عالم معیشت تلگ شده و مهدان تنازع المبقا پیش آمده است لکن در حقیقت مسئله تنازع للبقا فقط برائے نان نیست اگر همت برائے جان است و جان شعری بالاتر از جان نانی است - بد بخانه بهشتر شعراء ایران برائے نان شعر می

گفتند و ہر دو مہدای برائے آنان تنگ بود - تمام افراد بلی آدم برائے نان جان می دهند - آدم برائے نان خام (گندم) دست از نعمتہائے بہت کھید - اگر اولاد او برائے گندم پختہ (نان) بجان یکدیگر ہیفتند جا دارد - سخن کوتاہ ' مضمون محدود ' استاد محدود ' نابغہ کباب ' شاعر بسیار ' دائرۂ شعر وسیع تعریف شاعری ازان وسیع تر است و کشور شعر حد و کمارہ ندارد - آزادی و صلای عام است -

ہر کہ خواہد گوہا و ہر کہ خواہد گوہرو

گہرو دارد و حاجب و دربان درین درگاہ نیست

بلی ولی استاد کم است و نابغہ نادر نہ تنہا در دنیاے شعر بلکہ در ہر چیز و ہر جا ہمیشہ نابغہ کباب است - گویا روزگار درین بارہ امساک و بخل کردہ است فقط وضع جغرافیائی سبب کبابی شعراء بزرگ نیست بلکہ سبب اصلی قناعت و کفایت شعاری طہمت است - فقط چند استاد بزرگ نابغۂ دنیاے ادبیات پیش از مشروطہ شدند و ہمین چلد تن نابغہ کشور ادبیات را فتح کردہ اند و ہمہ مستحق تکریم و احترام هستند - و دیگران ہم در مرتبۂ خود خدمت کردہ اند و مستحق تعریف می باشند - درین جا فقط دو نابغۂ بزرگ ذکر می شود -

فردوسی نہ تنہا نابغۂ ادبیات است بلکہ بواسطۂ ایجاد موضوع مہم و مفہدی ' دارائے مقام بلندی است - این نابغۂ نادر ' بقادملت ' زبان ' آداب و رسوم ملی ' تاریخ مختصراً ہر چیز ملی و وطنی را در نظر گرفتہ پس یک عمر جانکاهی نہودہ و سراپا خدمت بہ ابدائے وطن کردہ است و ملت ایران را از پامالی و تباہی نجات دادہ است - سعدی نیز تنہا نابغۂ شعری نیست بلکہ بایک طرز بلیغ و یک اسلوب شہوا اصلاحات ملی را

پیش نهاد خود نموده است و بادشاہ و وزیر، رند و زاهد، جوان و پیر، توانگر و فقیر، تعلیم و تربیت، اخلاق، ظلم و عدل، عشق و جوانی، ضعف و پیری، عواطف، احساسات، مختصر احوال ملی را در نظر گرفته بایک فصاحت ساده و بسیار مختصر موثری در پرتی اصلاح برآمده است و توجہ خاص و عام را بخود معطوف داشته - ایجاد این گونه موضوع در وقت ضرورت از مختصات سعدی بوده و حقیقتاً او مصلح است - وضع جغرافیائی ایران و آب و هوا، باغها، گلها و گلستانها، و انقلابات سیاسی همیشه شاعر پیدا کرده است لکن مخاطب دلیل ملطقی می خواهد - در همین زمان حاضر باند زده ماخذ درست بدست آمده است که معنوان یک کتابچه نوشت بلکه گواہ تاریخی از زمان هخامنشی بدست داریم تقریباً ۳۶۰۰ پیش از میلاد عیسی - از روئی ادله تاریخی شعر قبل از اسلام در ایران موجود بوده است لکن یک نکته مهمی دیگر هم ایرانیان قدیم در شعر ملحوظ می داشته اند و آن توافق اوزان شعری با موسیقی ملی است - این رعایت درین عصر حاضر کم کم دارد لحاظ می شود - امید است آینده وسیع شده اثرات مسرت انگیزی بدهد - آن هم یک از شاه کارهای عصر حاضر است که زبان را عمومی و یک جهت می کند و روح عوام را تکان داده آنان را برائے مبارزه زندگانی ملی آماده می نماید - اشعار جدید به سبب هم آهنگی با موسیقی در خانه و کوچه و بازار و محافل ادب و بزم عیش قلوب عامه را جذب کرده است -

طلوع مشروطه و پیش آمدن یک مقصود عمومی، احساس احتیاجات وطنی، مضائب مملکتی هزارها موضوع منهد بدست شعراء می دهد

دیک کشور و سبع بزرگی باسم ایران ، وطن به آنها حوالہ می کند -
 کلون موضوع بسیار مضمون ہے شمار است - ازینجا است کہ شعار این
 عصر همه وطنی شده است - قصیده ، غزل ، قطعه ، ترجیع بند ، رباعی ،
 اوزان جدیدہ ہر کدام در یک موضوع مهمی ، یک مضمون مفیدی
 سرودہ شدہ است - از پیرہشتاد سالہ (ادیب پشاور) تا جوان نو خیز
 (حسام زادہ) همه بایک گرمی حقیقی وطن و ابتداء آن را در نظر دارند
 و ہمہ موضوع تازه و مضمون نو ایجاد می کنند - سخن کوتاہ کلون شاعر
 کم و مضمون بسیار است —

سہل شعر گوئی با جوش و خروش سرازیر شدہ است و راہ ہائے نو پیش
 گرفتہ جویائی متجراہائے طبیعی است و کلون مضمون ہے حد ، موضوع ہے انتہا ،
 بزر شاعر بسیار ، استاد کم و جہان ادب تشلہ وجود نابغہ است —
 جلد دوم و سوم 'سخنوران عصر حاضر' بہ نظر نرسیدہ است و نگارندہ
 ناچار است در حدود جلد اول تبصرہ بذویسد بنا برین کلون فہرست مهمی از
 انقلابات ادبی نوشتہ مقالہ ختم می شود -

انقلاب ادبی زبان فارسی

- (۱) یک دخی و یک جہتی زبان -
- (۲) وطنی شدن عالم نظم -
- (۳) توافق با موسیقی -
- (۴) راہ و دخلتہ یافتن الفاظ و متعادلات عوام در جہان نظم -
- (۵) سادہ گوئی -
- (۶) تسلسل مطلب -
- (۷) علل و اسباب ظاہر کردن و نتیجہ گرفتن -

(۸) ایجاد موضوع و مضمون بکر مایہ وطنی -

(۹) گرمیء حلقہتی -

(۱۰) اوزان نو -

(۱۱) لازم می نماید برائے برخے از مطالب مقالہ و این فہرست نمونہ از

نظم جدید نوشتہ شود لکن کتاب ' سخن‌وران عصر حاضر ' خود

نمونہ است -



سائنسک سوسائٹی علی گڑہ

از اقیتر

سر سید جامع حیثیات شخص ہوئے ہیں - یہ وہ زمانہ تھا جب سوسائٹی کا شہراڑہ بکھر چلا تھا - زندگی کا ہر شعبہ دیدھا کی حالت میں تھا - دوتہذیبوں کے ٹکرانے سے اس تذبذب میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس وقت ایک ایسے مخلص زمانہ شداس ' اور ثابت قدم شخص کی ضرورت تھی جو قوم کی خنثیہ اور مردہ قوتوں کو جگاے ' ان ادھام اور استقام کو دور کرنے کی کوشش کرے جو گوشعہ تمدن اور حکومت نے پیدا کر دیے تھے - اور انقضاے زمانہ کے لحاظ سے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور جدید حالات کی رو سے ان کی روہں کو بدلے - سر سید نے اگرچہ زندگی کے ہر اہم شعبے کی طرف توجہ کی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا - اور اسی کام کا ایک جز سائنسک سوسائٹی کا قیام تھا - خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آ رہا تھا - یہ علمی سعی اردو زبان کے سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اس لئے اس کا ذکر اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے -

سر سید نے سنہ ۱۸۶۳ء میں ایک تحریر اس عنوان سے کہ ' التماس بحمد مت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند " چھاپ کر شائع کی

جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلا نے اور ترقی دینے کے لئے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصلفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے *۔ یہ تھی اصل بلہاد سائنٹفک سوسائٹی کی۔ چنانچہ دوسرے ہی سال انہوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔

۹ جنوری سنہ ۱۸۶۳ ع کو سر سید نے غازی پور میں جہاں وہ صدر الصدور تھے، اپنے مکان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں یورپین اور دیسی اصحاب کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ یہ جلسہ سوسائٹی کے قائم کرنے اور اس کے افراض و مقاصد بیان کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ اس میں لفٹننٹ کرنل گریہم نے (جو سر سید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سر سید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں۔ سر سید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۷۰ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بکثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ”انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلا نے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا“۔ مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :-

”جو (یعنی سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لتیری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لتیریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر

لکچر دیے جائیں، دیپا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے، ہندو مسلمان اور انگریز تہذیبوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مفاہوت اور مذہبی تمیزات اور جو جھجک ہندوستانہوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کہا جائے، ابتدا ہی میں ۱۲۹ ممبر ہو گئے۔ جس میں ہندو مسلمان انگریز سب شریک تھے۔

اسی سال (یعنی سنہ ۱۸۶۳ ع میں) سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی فہیت میں چلنا ناممکن تھا اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسباب وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے۔ مسٹر ولیم جنکس بریملی جو اس زمانے میں علی گڑھ کے چیف تھے، سوسائٹی کے پریسہڈنٹ قرار پائے۔ اور اسی وقت سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بنانے کی تجویز ہوئی اور سرسید کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع ہو کر دی گئی۔ مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً بیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگ بنیاد لٹلٹنٹ گورنر شمال مغرب (اے۔ ڈریملڈ) نے ۳ نومبر سنہ ۱۸۶۳ ع کو رکھا تھا اور ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۱ ع کو جب عمارت بن کر تیار ہو گئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اس کا افتتاح ہوا۔ ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے پہنچنے (سپرست) اور اے۔ ڈریملڈ لٹلٹنٹ گورنر شمال مغرب وائس پھمن قرار پائے۔ اولین سیکریٹری لٹلٹنٹ کرنل گریہم، اس کے بعد سرسید ہوئے۔ اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون سنہ ۱۸۶۴ ع میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں منتقل ہو گیا تو سنہ ۱۸۶۷ ع میں اس میں

کسی قدر ترمیم کی گئی۔ سوسائٹی کے اغراض اور قواعد حسب ذیل قرار دیے گئے۔۔
(لقب اور مقصد)

اس مجمع کا نام سہن ٹیٹک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جائے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا :۔

(۱)۔ ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔
(۲)۔ جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامہ یا مہینہ نامہ وغیرہ چھاپ کر مشہور کرنا جس سے ہندوستانیوں کے فہم و فراست کی ترقی متصور ہو۔

(۳)۔ ایشیا کے قدیم مصلحین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

(بناوت سوسائٹی کی)

(۴)۔ سوسائٹی میں (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریوری ممبر (تیسرے) رفقاء سوسائٹی ہر دس برس کے اور سوسائٹی کے پیٹرن یعنی مربی اور وائس پیٹرن یعنی نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے۔

معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اول) ممبران حضوری یعنی وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو۔ (دوسرے) ممبران مکاتبت یعنی وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہو سکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں۔
تعداد فہر محدود۔ چلدا دو روپیہ ماہانہ۔

آنری میمبروں کی تعداد دس سے اور دفقائے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

ساحبان ڈریکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودہ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنری میمبر * ہوں گے۔

دفقائے سوسائٹی ایسے شخص ہوں گے جو بسبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھ خیال نہ ہو۔

کونسل مشہور کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب، ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو، فارسی، عربی، ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کس زبان میں کیا جاوے۔

کونسل کارپرداز۔ ذمہ دار ملتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام۔ جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑھ میں بنائی وہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کھانے کا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی فرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشہور کیے جایا کریں گے۔

۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ء سے انسٹیٹیوٹ کُوت جاری ہوا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلتے لگا۔ ادیتر خود سرسید تھے۔ مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو رائے لکھی ہے وہ اس قدر معقول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔

”اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولٹیکل معاملات پر مضامین

اور نوٹ لکھتے تھے؛ اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے ✓ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے؛ اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی، علاوہ اُن لیڈنگ آرٹیکلوں کے، جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر چھپتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شایع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاع اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ یہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات

کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

ایک خاص وصف، جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دلازاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لئے، جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سلجھدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس نے ہندوستان کی کس قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔

یہ سب سچ ہے لیکن یہ اُسی وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا۔ آخر میں تو یہ ”ماخوذ از پانہر“ ہو کے رہ گیا تھا۔ لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سرسید خود بڑے پُر زور مضامین لکھتے تھے۔

ابتداء میں منشی محمد یار خان ادیبتری کا کام کرتے تھے اور منشی چکھن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے۔ مولوی فیض الحسن اور

بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے - اجرت پر بھی کام ہوتا تھا - کل عملہ پانسو روپیہ ماہانہ کا تھا —

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لکچروں کا سلسلہ قائم ہوا - ڈاکٹر کلکی ہر مہینے ایک لکچر ، نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے —

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دار و مدار سرسید پر تھا - انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا - اپنا ذاتی پریس جو ”تبلیغ الکلام“ کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا ، سوسائٹی کے نذر کر دیا - جون ۱۸۹۶ء میں جب نواب سکندر بیگم والیڈ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خاں نے ہندوستانہوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انہوں نے بطور اظہار خرسندگی ایک الساس کی انگوتھی تھمتی ایک ہزار روپیہ سرسید کو بھیجی - سرسید نے ایک جلسہ عام میں یہ انگوتھی سوسائٹی کو دے دی - اسی طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سرسید نے فوج داری اور کلکٹری کے مختاروں اور وکیلوں کو قانون پر لکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کے نذر کر دیتے تھے —

گورنمنٹ اور روسا امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی - گورنمنٹ نے تین ایکڑ تین روۓ اور تیس پول زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے اور ایک باغ سرکاری علم فلاح کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی - مہاراجہ جودھپور نے سو روپیہ سالانہ ، مہاراجہ کھورتھلہ نے پچاس روپے ، مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ

امداد مقرر کی۔ وائسرائے اور لفٹننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی۔ سر جان لارنس کو خاص توجہ تھی۔ مسٹر ڈریملڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور مکملوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چلندے دیے۔ نواب کلب علی خاں نے بارہ سو روپے کی ایک تقرری کو سی سوسائٹی کو دی مہاراجہ الود اور مہاراجہ اندور اور نواب ٹونک نے بھی عطیات دیے۔ مہاراجہ بلارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی۔ عذایت اللہ خاں رئیس بھی کم پور نے دو سو روپے تعمیر چاہ کے لیے دیے۔ سر آکلڈ کالون، مسٹر سیپت کلکٹر مہرتھ اور مسٹر کیمسن ڈائریکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے۔ سر سید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چلندے اور اخبار کی قیمت کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی۔

۱۵۔ اگست سنہ ۱۸۹۷ع میں جب سر سید عہدہ چیف سال کاز کورٹ پر ترقی پا کر علی گڑھ سے بلارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس سی۔ ایس۔ آئی کو جو اس زمانے میں علی گڑھ میں دپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انہوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا۔ لیکن سر سید بلارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور اُن کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شایع ہوتے رہے۔

”سنہ ۱۸۹۷ میں سر سید بتدریب تعطیل دسہرہ بلارس سے علی گڑھ میں آئے اور ضلع علی گڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے؛ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قہام کے واسطے مقرر کیا جائے؛ اور

اس کی شرائط واجب العرض میں ہر وقت بلدوبست کے درج ہو جائیں تاکہ نسلاً بعد نسل ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کر لے پائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۹۷ ع کو سوسائٹی کے جلسے میں سر سید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع ان کی مرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳ دیہات کے چارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں۔ اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کر دیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سیکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۹۷ ع بنام سر سید وصول ہوئی اس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔ ” —

۹۔ مئی سنہ ۱۸۹۸ ع کو سوسائٹی نے ایک ادریس سر ولیم میور لنگلنٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۶ - اگست سنہ ۱۸۹۸ ع کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ ”اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی مہعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لہاقت رکھتا تھا مگر اس لہاقت کو کام

میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دور گھا۔ انہوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔“ *

سر سید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا۔ جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سر سید بھی کسی قدر مائل ہو گئے تھے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشتکاری اور علمی عجائبات کا دھندا طے ہو گیا تو یہی نام مناسب خیال کھا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا۔ سائنس کے لکچروں کے سلسلے کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے علمی تجربے بھی کئے گئے اور علم فلاحیت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گھوموں بویا گیا اور جب تیار ہو گیا تو جیسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا۔ ایک ایک دانے میں ساتھ ساتھ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوت کر مثل پولے کے جھانک کے ہو گیا تھا۔ پودے کا طول ۴ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ۶ انچ لمبی تھی۔ نو قسم کے گھمبون لندن سے منگائے گئے۔ خود سر سید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہلی نالی ایجاد کی اور علم فلاحیت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا۔ مختلف علوم و فلزات کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا بہت بڑا مقصد تھا۔ علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ

بہت بڑا ذریعہ تھا۔ سر سید نے پولاوٹیکل اگنامی، نیچرل فلاسفی، علم آب و ہوا کے
 توجہ کی سفارہ کی۔ کرنل جے ڈبلیو ہیملٹن نے پہلے ہیروڈوٹس کے تاریخ مصر کے
 ترجمے کی اور بعد ازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور
 شخصوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی
 کرنی چاہیے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ہو
 وہی اختیار کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں۔ ہندی کے
 حروف ت اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے۔ ہینٹ اور جھالرجی (ارضیات) کے
 ترجمے کی بھی رائے دی۔ دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ
 تاریخ مصر مسمیٰ حسن المتعارفہ مصنفہ سیوطی ہے۔ ہشت بہشت کا نسخہ
 بھی بھوجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ہے جس میں شاہ مراد کی
 وفات ۸۵۵ ہجری تک کے حالات ہیں۔ مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری
 نے اسے ۹۸۲ ہجری تک پہنچایا، لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا جو
 ۱۵۵۵ تک ہے۔ انہوں نے ہورن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی۔
 خود سرسید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ ایک تمام اردو
 مطبوعہ کتب نظام و نثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو۔ اس
 میں امور ذیل کی صراحت کی جائے گی۔

نام۔ کتاب۔ نام مصنف مع مختصر حال۔ زمانہ تصنیف۔ کچھ عبارت

بطور نمونہ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

دوسرے اردو لغات جو سرسید نے لکھنی شروع کر دی تھی، اس کا

نمونہ موجود ہے جو آئندہ ہم اس رسالے میں پیش کریں گے۔ اس پر بعض

یورپین فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں۔

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابل قدر اور اردو زبان کے استحکام کے لئے لازم ہیں۔ سرسید کے صحیفہ ادبی ذوق اور درد بھلی کا اسی ایک بات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ۶۶ برس پہلے اس چھڑ کا قول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوئے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

- ۱ - تاریخ مصر قدیم مولفہ رولن۔
- ۲ - تاریخ یونان مولفہ رولن۔
- ۳ - رسالہ علم فلاحت اسکاٹ برلن۔
- ۴ - تاریخ چین بزبان فارسی قلمی ترجمہ پادری ایکسوس۔
- ۵ - تزک جہانگیری قلمی۔
- ۶ - رسالہ عام انتظام مدن (پولیٹیکل اکانمی) مولفہ ولیم سیلبر۔
- ۷ - ایک گفتگو بر عہد لارڈ کلفوزی و لارڈ کیلنگ مترجمہ لعلیت کرنل گریہم بزبان اردو۔
- ۸ - تاریخ مدد مولفہ الفلستین۔
- ۹ - رسالہ علم آلات مولفہ تامسن۔
- ۱۰ - رسالہ علم طبیعیات مولفہ تامسن۔
- ۱۱ - رسالہ عام آب و ہوا مولفہ تامسن۔
- ۱۲ - رسالہ برق مولفہ ہیبرس۔
- ۱۳ - دیہاچہ تاریخ فیروز شاہی۔
- ۱۴ - تاذہتر کی کتاب اقلیدس مترجمہ مولوی ذکاء اللہ۔

- ۱۵ - جغرافیہ مولفہ پادری ولکسن —
- ۱۶ - سیاست مدن (مل کی پولیٹیکل اکائی کا انتخاب) مترجمہ پلڈت دھرم نراین رائے بہادر میہر منشی اندور —
- ۱۷ - ترجمہ علم مساحت مولفہ ٹاڈ ہلٹر —
- ۱۸ - ترجمہ علم مثلث مولفہ ٹاڈ ہلٹر —
- ۱۹ - ترجمہ الجبرا مبتدیوں کے لیے مولفہ ٹاڈ ہلٹر —
- ۲۰ - ترجمہ نظریۂ مساوات مولفہ ٹاڈ ہلٹر —
- ۲۱ - گال بریتھ اور ہائن کے سائنٹفک مینول یوکلڈ کا ترجمہ —
- ۲۲ - گال بریتھ اور ہائن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ —
- ۲۳ - برنارڈ سمیٹھ کی آر تھیٹک کا ترجمہ —
- ۲۴ - برنارڈ سمیٹھ کے الجبرا کا ترجمہ —
- ۲۵ - گال بریتھ کی کتاب حساب کا ترجمہ —
- ۲۶ - ٹاڈ ہلٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے) —
- ۲۷ - گال بریتھ کی Plain علم مثلث —
- ۲۸ - ٹاڈ ہلٹر کی Plain co-ordinate geometry —
- ۲۹ - ٹاڈ ہلٹر کا (Integral Calculus) تکمیلی احصا —
- ۳۰ - ٹاڈ ہلٹر کا (Differential Calculus) تفرقی احصا —
- ۳۱ - ترجمہ تاریخ ایران مولفہ سر جان میکملک —

✓ دہلی کالج اور اس کی ورثیکلر ٹرانساکشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمہ اردو زبان میں شائع کیے۔ یہ کام جب آج کل دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ ان ترجموں

کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے۔ علاوہ اس کے عجائب خانے کے لیے سکے بھی جمع کیے۔ چنانچہ مسٹر تھارن ہل جیج سپارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج نے کچھ سکے بھیجے۔ ایک اشرفی صہد تغلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیم پور نے دی —

سر سید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے، چنانچہ سوسائٹی کی بھودی اور ترقی میں انہوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ”ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی، خود اپنی بساط سے ہڑ کر اس کو مالی امداد پہنچائی، اس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بلوائی، اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور، علی گڑ، بلار میں جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن میں برابر لگے رہے۔ چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط کہ انہوں نے مولوی سید مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ ”مجھے کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج ہوا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ بھی کرشن کا واسطے شکست کر دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سہیلانے اور مسیروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں“ * —

محض سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ ع کو مذاکرۂ علمیہ میں ایک ہابیل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا —

اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں - مثلاً تحصیل مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی - اسی سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورثیکلر یونیورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا - اس کا حال ہم آئندہ ایک علیحدہ مضمون میں لکھیں گے —

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہو گئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں - سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے - اس سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے —

(اس مضمون کے لکھنے میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی مختلف جلدوں، گریہم کی لائف آف سید احمد خاں اور حیات جاوید سے مدد لی گئی ہے) —

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا و ترقی ۔

از

شیخ چاند صاحب ایم۔ اے ' ایل ایل - بی

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باضابطہ آغاز دراصل بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ عالمگیر کے عہد کے پس و پیش ایسے شعرا گزرے ہیں جن کے اشعار تذکروں میں مل جاتے ہیں ۔ چنانچہ موسوی خاں فطرت ، خواجہ عطا ، جعفر بیدل وغیرہ ایسے شاعر ہیں جن سے چند شعر منسوب ہیں ۔ اُسی زمانے (۱۱۰۵ھ) میں اسماعیل امروہی نے ایک مثنوی ” تولد نامہ بی بی فاطمہ “ * لکھی ہے ۔ اس کے سوا بعض شاعروں کا کلام بھی دستیاب ہوتا ہے لیکن یہ دراصل ایسی کوششیں تھیں جن کا مستقل اور پائدار اثر قائم نہ ہو سکا ، اور ان شعرا نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے رائج کرنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی ۔ شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں اُردو شاعری کے آغاز کی تاریخ عالمگیر کا چوالیسواں سالہ جلوس (۱۱۱۲ھ) ہے ۔ یہ وہ تاریخ ہے جس میں بقول قائم ولی نے دہلی کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ وہاں کے شاعروں کے حلقے میں اپنی ریختہ گوئی سے ہل چل ڈال دی ۔

اور جب ۱۱۳۳ھ میں بقول * حاتم ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو موزوں طبع شاعروں کو متاثر و متعجب کر دیا - یوں تو دکنی شاعروں کے کلام سے شمالی ہند کے شاعر اس سے قبل سے واقف تھے اور شمالی ہند کے بعض شاعروں کے کلام سے اس کی شہادت بھی ملتی ہے - قائم + (قائم چاند پوری سے قبل گزرا ہے) نے اپنے مرثیہ میں قادر کا ذکر اس طرح کیا ہے - قائم کا آج ہند میں شہرا ہوا بلند دکن میں اس کے شعر کہو قادر استیں مخزن نکات (مولفہ ۱۱۶۸ھ میں لکھا ہے کہ پچاس سال قبل مرزا نے دکنی کے مرثیہ ہاتوں ہاتھ دکن سے شمالی ہند میں پہنچتے تھے اور عام طور سے پڑھ جاتے تھے لیکن ان کا کوئی بین اثر نہ پڑ سکا - یہ صرف ولی کے کلام کی کرامت تھی کہ اس نے شمالی ہند کے شاعروں کو ریختہ کی طرف متوجہ و مائل کر دیا - اس کے مقلدین میں آبرو ، حاتم ، مضمون ، مظہر جان جاں ، احسن اللہ ، شاکر ناجی ، مصطفیٰ خاں یکرنگ ایسے شعرا ہیں جو اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں - ولی کے تتبع میں طبع آزمائی کرنے کا ذکر ان میں سے بعض نے کیا ہے چنانچہ حاتم لکھتا ہے :- ”در ریختہ ولی را استاد می داند“ - آبرو کا ایک شعر ہے :-

(آبرو شعر ہے ترا اعجاز گو ولی کا سخن کرامت ہے)

یہ شاعرانہ تعالیٰ ہے ولی کا ذکر کرنا ہی اس کے اثر کو تسلیم کرنا ہے - ولی کی تقلید سے اس کے مقلدین کے کلام میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا - اس ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ ایہام کا رواج ہو گیا - ایہام کی بلیاد اسی عنصر پر قائم ہوئی -

بقول آزاد ” سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی تھے اس واسطے اس میں برج بہا شا اور اُس کی شاخ میں ذو معنی الفاظ اور ایہام پر دھروں کی بنیاد ہوتی تھی - فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم - اردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی - ” ظاہر ہے کہ ایہام کا التزام ایک مصلوحی اور غیر فطری فعل تھا جس نے عام شاعری اور خصوصاً غزل کو اثر اور سادگی کے جوہر سے محروم کر دیا - اس میں مضامین کے ادا کرنے سے بڑھ کر ذو معنی الفاظ کے استعمال پر شاعر کی پوری قوت اور زور صرف ہو جاتا تھا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کلام بے کھف اور بے لطف ہو جاتا تھا اور عام قبولیت حاصل کرنے سے محروم - اس دور کے اساتذہ کا کلام اتھا کو دیکھئے تو شاعرانہ صلاح اور فکر مددی پر حرف رکھنے کو جگہ نہیں لیکن سادگی اور اثر کا فورہیں، الفاظ کا ذخیرہ باعراط موجود ہے، اُن کے استعمال اور معانی کے مختلف پہلو روشن ہیں، عالم لسانہات اور محقق لغات کے لئے اُن کا کلام بیش بہا ذخیرہ ہے، لیکن کھف و لذت سے خالی ہے - ابتداءً تو یہ طرز مقبول ہوئی لیکن بہت جلد یہ فکر فطری التزام و تصنع مردود ٹھہرا - ایہام کوئی کے مشہور علم بردار حاتم کو بھی یہ روش چھوڑنی پڑی چنانچہ جب سنہ ۱۱۶۹ھ میں آپے کلام کا انتعاب ” دیوان زادہ “ کے نام سے کیا تو پرانی طرز کے کلام کو خارج کر دیا اور لکھا ہے :-

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ پڑتا ہے حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پڑنگاہ
ایہام کوئی کے خلاف تحریک کا آغاز در اصل اُن شعرا نے کیا جو
ان ایہام کو اساتذہ کے بعد فوراً مجلس شاعری میں جلوۃ امروز ہوئے -
ان میں مظہر، سودا، مہر، اور درد و فہرہ خصوصیت کے ساتھ قابل

ذکر ہیں ان کے دور میں قدیم روش شاعری یک قلم متروک ہو گئی - اس عہد کی ابتدا میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو ایہام گوئی کا قائل تھا اور شاعری میں اس التزام کو ملحوظ رکھنے پر متا ہوا تھا - مہر کا شعر ہے :-

کھا جانوں دل کو کھینچے ہوں کہوں شعر مہر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے ابتدائی دور میں ایہام کے ماننے والے موجود تھے اور اس صنعت کو شعر کی دلچسپی اور لطف کا موجب سمجھتے تھے - اس دور کے بھی بعض شعرا نے اس طرز میں طبع آزمائی کی ہے - سودا کی ایک غزل اسی رنگ میں ہے لیکن اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ ابتدائی دور کے ایہام کو علم بردار مفسون اور 'آبرو' کی طرز ہے مجھے اس سے کوئی مناسبت نہیں :

اسلوب شعر کہنے کا تھرے نہیں ہے یہ مفسون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ
'آبرو' کی طرز میں ایک غزل لکھی ہے :

ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا
تو اس زمیں میں نادان طور اپنا کیوں نہ بولے

مہر حسن کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے ، لیکن اس نے بھی ایہام میں طبع آزمائی کی ہے ، چنانچہ اپنے تذکرے میں اپنے چلند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں ، جن کی نسبت لکھا ہے " چلند اشعار بطور قدمائے ایہام بلدان گنتہ شد " - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایہام گوئی کا اثر کچھ نہ کچھ باقی تھا اور شاعر کم از کم بطور تفریح ایہام میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اسی زمانے میں لوگ اس سے بہزار ہوتے جاتے تھے جیسا

کہ سودا کے اوپر کے دو شعروں سے واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان شعرا کے حلقے میں یہ طرز مردود ٹھہری۔ اس کے غیر فطری ہونے پر نظر کر کے اُس کے خلاف شاعروں نے علم احتجاج بلند کیا۔ سودا نے صاف لکھا ہے :

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش متجو دو رنگی
ملکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

ایہام گوئی کی بے وقعتی میر صاحب کی رائے سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے احسن اللہ کے اشعار کے حق میں ان الفاظ میں صادر کی ہے ”طبعش مائل بہ ایہام بود ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند“۔ مظہر، سودا، میر وغیرہ نے جب اس طرز کو چھوڑنا پسند نہیں کیا اور ایک نئی روش زیادہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اختیار کی تو ان کو زیادہ دشواری اور دقت پیش نہیں آئی اس لیے کہ قدیم طرز سے عام بھڑادی پھول گئی تھی، زبان بڑی حد تک بن چکی تھی، الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود تھا، زبان کے ابتدائی قواعد اساتذہ کے کلام سے مستلبط تھے، فارسی عروض مدتوں پہلے اردو شاعری کا بلہادی عنصر بن چکا تھا، نئے دور کے مذاق نے کئی الفاظ و متروکات کو متروکات میں داخل کر دیا تھا، یہاں تک کہ کہلے گو و مشاق ہو رہا استاد حاتم بھی اس اثر سے نہ بچ سکا۔ ایسے بھی سنہ ۱۱۶۹ھ میں ”دیوان زادہ“ نئی طرز میں مرتب کرنا پڑا۔ ولی کی استادی کا اثر جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے، زبان و خیال کے اعتبار سے کم ہونے لگا اور رتبہ رفتہ قدیم زبان بڑی حد تک متروک اور ہند کی زبان میں طبع آزمائی شروع ہو گئی۔ حاتم نے لکھا ہے :

ہند کی گفتگو انوکھی ہے چرب ہے سب ادھر یہاں کی زبان

میر حسن نے بھی قدیم زبان کے ترک کرنے اور معانی و مضامین کی پیروی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ”چوں بلیادِ ریختہ از زبانِ دکن است بیا بریں صاحب سخنانِ این فن و معنی شناسانِ مغز سخن طرزِ زبانِ ہر دیار را معیوب نمی دانند و پیرویِ معانی می کنند“ - قدیم زبان میں اصلاح کا حال دیوانِ زادۂ حاتم کے دیباچے سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح فہر مانوس ہندی عناصر کو خارج کر کے مروجہ زبان کے مطابق فارسی اجزا شامل کہے گئے :-

”لفظ ’در‘ و ’بر‘ و ’از‘ و ’واو‘ کہ فعل و حرف باشد در دیوانِ خود تہید دارد - دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسانِ عربی و زبانِ فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزِ مرۂ دہلی کہ مرزایانِ ہند و فصیحانِ دند در محاورہ دارند‘ مظلور داشتہ‘ سوائے اُن زبانِ ہر دیار بہ ہندی کہ اُن را بہا کا گویند موقوف کردہ‘ متخص روزِ مرۂ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمود این قاعدہ (قاعدۂ ستروکات) را تا کجا شرح دہد - غرض کہ خلافِ محاورہ و فہرِ مصطلح و فطری روزِ مرۂ و نقصانِ نصاحت را دخل نہ باشد“ -

حاتم کے اس بیان سے قدیم زبان میں اصلاح کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندی عنصر کم ہوتا گیا اور فارسی عربی کے اجزا مستحکم ہوتے گئے۔ اس باب میں مظہر جانِ جاں نے اس قدر فلو کیا کہ اس زمانے میں ان کی اردو کو اہل فن نہ ریختہ کہتے تھے اور نہ فارسی بلکہ ان کی اردو کا حال بقول سودا ”کتا دھوبی کا

کہ گھر کا نہ گھات کا " تھا ۔

یہیں سے فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا ۔ اس سلسلے میں مہر کے اس بیان پر نظر رکھلی چاہیے جس میں انہوں نے ریختہ کی اقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس طرز کا ذکر کیا ہے جو اس دور میں رائج ہوئی ۔ اس بیان سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ریختہ گوئی نے رفتہ رفتہ کہا صورت اختیار کی اور اس دور میں آکر اس کا کہا رنگ ہوا ۔ یہ بیان چونکہ اس دور کے ایک مشہور استاد کا ہے اس لیے ہر طرح لائق غور ہے ' مہر صاحب نے لکھا ہے :-

" ریختہ کی چند قسمیں ہیں پہلی یہ کہ ایک مصرعہ فارسی اور

ایک ہندی ہو مثلاً قطعۃ امیر خسرو :-

ز گر پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑیے سلوارے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سلوارا

دوسری قسم یہ ہے کہ آدھا مصرعہ ہندی ہو اور آدھا فارسی

جیسا کہ مہر معز کا شعر ہے —

از زلف سپاہ تو بدل دھوم پڑی ہے درخانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ فارسی کے حروف و افعال استعمال کیے

جائیں ۔ یہ قبیح ہے ۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ ایسی فارسی ترکیبیں

لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں ۔ یہ جائز ہے ۔

لیکن اسے شعر شاعر نہیں جانتا ' ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ

یہ غالباً مہر کے ابتدائی کام کے متعلق رائے ہے ورنہ ان کا بعد کا کام بہت پاک صاف

اور شستہ و رفتہ ہے ۔

کے لیے نامانوس ہوں معیوب ہیں اور اس کا جائزہ بھی سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر فارسی ترکیب گفتگوے ریختہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں۔ پانچویں قسم ایہام کی ہے کہ اس فن میں جس کا رواج شاعران سلف میں تھا۔ اب طبائع اس صنعت میں کم مصروف ہیں لیکن شستگی سے استعمال ہوتی ہے، ایہام کے معنی یہ ہیں کہ وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بلیاد ہوتی ہے۔ ایک معنی قریب ہوں اور دوسرے بعید۔ معنی بعید سے شاعر کی مراد ہو اور قریب سے نہیں۔ چھٹی قسم وہ انداز شاعری ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے، یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجلیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بلندی، خیال وغیرہ پر محتوی ہے۔“

ریختہ کی یہ تعریف و تحدید ممکن ہے کہ تحقیقی نقطہ نظر سے بالکل صحیح ثابت نہ ہو لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ اس دور کے اساتذہ نے اردو شاعری کا انداز ہی بدل دیا اور اس میں وہ تمام ضروریات اور لوازمات اختیار کر لے جو شاعری کو سوارانے اور بنانے میں کام آتے ہیں۔ ان تمام التزامات سے ظاہر ہونا ہے کہ فارسی کا اثر بہ شدت داخل ہو رہا تھا، لیکن زبان کو فہر مانوس ترکیبوں اور لغات سے پاک کر کے ہندی اور فارسی عناصر میں توازن و اعتدال بھی پیدا کیا جا رہا تھا۔

شمالی ہند میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو گلتی کے صرف چند شاعر تھے، ایہام گو بھی چند ہی تھے جس سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری ابھی

زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی، لیکن ایہام گوئی کے خلاف کوشش شروع ہوئی تو شاعروں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ اس کا ثبوت ان تذکروں سے آسانی سے مل جاتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے ہیں۔ سنہ ۱۱۱۵ھ میں مہر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں ایک سو چار شاعروں کا ذکر کیا ہے اور سنہ ۱۱۶۶ھ میں گردیزی نے اٹھانوے کا جن میں پچھیس شاعر ایسے ہیں جو مہر کے تذکرے میں شامل نہیں ہیں۔ سنہ ۱۱۸۸ھ میں قدرت اللہ شوق نے دو سو اٹھاسی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور مہر حسن نے قبل ۱۱۸۸ھ مابعد ۱۱۹۳ھ دو سو اٹھاسی کا۔ شورش نے سنہ ۱۱۹۳ھ میں تین سو چودہ شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے اس کے بعد شاعروں کی تعداد میں اس شدت سے اضافہ ہونے لگا کہ حصر و شمار آسان نہیں۔ اس تعداد اور تدریجی ترقی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری نے تیس چالیس سال کے عرصے میں غیر معمولی مقبولیت اور ترقی حاصل کر لی۔ چنانچہ اس کا ثبوت ان مجلسوں کی کثرت سے بھی ملتا ہے جن میں ریختہ گو شاعر اپنا کلام سناتے تھے۔ فارسی گویوں کے لئے غزلوں کو مظهر عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ مشہور سالانہ مشاعرہ مرزا بھدل کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا۔ اس زمانے کے شاعروں کے کلام اور دیگر تعصیروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے * فارسی گویوں کے مشاعروں کے تور پر ریختہ گویوں نے ملاحظہ (صحبت ریختہ گویاں) کی بقا قالی تھی، چنانچہ مراختہ کئی جگہ ہوتے تھے۔ مراختہ خان آرزو، یہ ہر قدمی مہینے کی پلندہ ہوئی تاریخ کو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا کرتا تھا۔ حاکم لاہوری نے اپنے

تذکرہ ”مردم دیدہ“ میں اس کا ذکر کیا ہے، ’مراختہ خواجہ مہر درد‘ یہ بھی ہرمہیلتے کی بلند رو میں کو درد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے مراختے کا سلسلہ بلند ہوا تو انہوں نے اپنے ہاں یہ صحبت گرم کی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد درد نے یہ محفل اپنے ہاں رچانی بلند کر دی اور مہر تقی مہر سے کہا کہ ان کے ہاں مراختے منعقد ہوا کریں، چنانچہ مہر کے ہاں یہ صحبت گرم ہونے لگی۔ ان کے سوا مہر نے اپنے تذکرے میں چند اور مراختوں کا ذکر کیا ہے۔ ’مراختہ مہر سجاد‘، ’مراختہ جعفر علی خان زکی‘، ’مراختہ مہر علی نقی وغیرہ۔ مشاعروں کی ترقی پذیر کثرت اور مجالس ریختہ کی ہلکامہ آرائی پر نظر کر کے ماننا پوتا ہے کہ فارسی کا چراغ تلمبا رہا تھا اور ریختہ گوئی کا ہر طرف بازار گرم تھا۔



گجرات کا باکمال شاعر اردو شہر خبردار

از

(جناب اختر حسین صاحب رائے پوری)

دور حاضر کے گجراتی شاعروں میں اردو شہر خبردار کا مرتبہ سب سے افضل اور بلند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کی قومی شاعری ہے اور وہ ستیاگرہ تحریک کا نہایت ہی نازک نگاہ ترجمان ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں کوئی اصلاحی تحریک کسی آرٹسٹ کے جذبات میں وہ گرمی نہیں پیدا کر سکتی جو اس کی تختہل و قوت تخلیق کو تحریک دے سکے۔ اصلاح کا مقتضاء توازن ہے اور آرٹ کا ملکہ خود فراموشی اور بے بسی۔ لہذا شاعری جب اس میدان میں قدم رکھتی ہے تو صرف بغاوت اور انقلاب کی ہمدوا ہو سکتی ہے۔ اصلاح اور توازن کے ساز پر اس کا نغمہ بے کیف اور بے نمک رہ جاتا ہے۔ اردو شہر خبردار کی قومی شاعری میں وہ ولولہ اور جوش ہم نہیں پاتے جو اقبال اور نذرا اسلام کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن اسے چھوڑ کر خبردار کے پاس جو سرمایہ رہ جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ صرف گجرات ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے اور آج اس کا تعارف ہم کسی قومی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ

ایک جمالیاتی آرتسٹ کی حیثیت سے گزارہ ہیں —

ہندوستان میں عشقہ شاعری نے دو مختلف راستے پکڑے - ایک دگر تو سلسکرت شاعروں کے لیے عام طور پر اور کالی داس کے لیے خاص طور پر مخصوص ہے - کالی داس فطری حسن کا دلدادہ تھا اپنے جذبات کو حسن و جمال کا آئینہ نہیں، بلکہ حسن فطرت اور مناظر قدرت کو اپنے معسوسات کا درپن بناتا تھا - ندی نالے اور جنگل پہاڑ اپنی اپنی بولہوں میں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور کالی داس بلا تکلف انہیں قلم بند کرتا چلتا ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب روح اور مادے کی کش مکش میں دو گونیت پیدا نہ ہوئی تھی - بعد میں ویشنو اور بھکتی تحریکوں سے ویدانت، زوجانیت نوازی اور داخلیت کا اثر بڑھا اور شاعر نے مظاہرات کا آئینہ دار اپنی خوردی کو بنایا - بذات خود قدرتی نظاروں میں کوئی کشش نہ رہی بلکہ شاعر کی ذہنی کیفیت پر ان کے نظاروں کا ردّ عمل کہیں زیادہ اہم قرار پایا - سلسکرت اور ہندی شاعری میں اس اختلاف نے بعداً مشرقین پیدا کر دیا - ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کلاسیک سلسکرت شاعری کا سب سے باکمال نمائندہ ارد شیر خبردار ہے اور اس کی شاعری میں واردات عشق کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کے امتزاج نے بڑی خوبی پیدا کر دی ہے —

ارد شیر خبردار کی زندگی ویسی ہی ہموار و یک رنگ رہی ہے جس کی توقع ہندوستان کے کسی متوسط طبقے کے فرد سے کی جاسکتی ہے - صوبہ بدھئی کے شہر دمن میں نومبر سنہ ۱۸۸۱ ع میں وہ ایک ناسور پارسہ گھرانے میں پیدا ہوا - بیشتر آرتسٹوں کی طرح اسکول کی تعلیم اسے فہر دلچسپ معلوم ہوئی اور اراہیل عمر میں ہی وہ مدرسے سے

محصود ہو کر نج کے طور پر مطالعہ کرنے لگا - شاعری سے اسے ایک خاص شغف تھا اور ۱۶ سال کی عمر میں جب اس کے سر دوہے شایع ہوئے تو خرائٹ بورہوں نے غزلک میں سے اسے گھور کر سوہلایا اور اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی - اس کے بعد سے اس کے کمالات اور شہرت میں براہر رقابت ہوتی آئی ہے - اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ (Silken Passel) انگلینڈ کے اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے اور دوسرا مجموعہ غالباً وہاں کی (Poetry Society) کی طرف سے شائع ہونے والا ہے - اس کی قومی نظمیں گجرات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور گاندھی جی بھی فرصت کے اوقات میں انہیں دھیے سرور میں گنگنایا کرتے ہیں! اس کی فلسفیانہ نظموں کا مجموعہ 'درشتک' ذی ہوش لوگوں کے لیے سرمے بصیرت اور روح پرورد بزرگوں کے لیے تفسیر حقیقت ہے - بہر حال اس کا نظریۂ زندگی صحیح ہو یا نہ ہو اس کی قادر الکلامی مسلم الثبوت ہے -

لیکن فلان کا سود چنگل ویدانت اور سکیاگرہ سب کے لیے ہے - ایک تخیل ہے جسے کبھی فلان نہیں اور آرٹسٹ جب تخیل کے کاغذ پر حسن کی روشنائی اور عشق کے قلم سے انسانیت کے خدوخال بناتا ہے تو ابدیت اس کی تحریر پر دایمی شہرت کی مہر لگا دیتی ہے - اردشیر خبردار کی وہ نظمیں ہمیشہ شوق سے پڑھی جائیں گی جن میں وہ اپنے مخصوص انداز میں حسن کی شوخی اور عشق کی وارفتگی کی تصویر کھینچتا ہے - یہ سچ ہے کہ اردشیر خبردار کا تغزل یاس و حرماں کے ان جذبات سے نا آشنا ہے جو اردو شاعری کا ایک خاص عنصر ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو تمام ہندو ادب اس حزنہ (ٹریجک) رنگ سے خالی ہے جو آرت

کی جان ہے۔ اور اسی وجہ سے ہندو شاعری کی معشوقہ ایک ایسی عورت ہے جس کا ملنا اگر آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں ہے۔ معکروسی کی اذیت کو ہندو شاعر نہیں سمجھ سکتا اس وجہ سے کہ جلسی معاملات میں ہندو سوسائیتی میں ایسے بدنصیب کم ہوتے تھے جو معکروم و نا کام رہ جائیں —

لیکن طرب و نشاط کی یہ وارفتگی ملاحظہ ہو کہ ہر لفظ شراب میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر بلند شاعر کی شادمانی کے ساتھ نقصان و خلدان ہے۔ روح (Soul) اور حس (Sense) کا اتحاد کیا کسی معمولی صنّاع کی کاریگری ہو سکتی ہے کہ جب 'اردشہر' اپنی محبوبہ کی رفتار کا بیان کرتا ہے تو الفاظ گھلگھرو بجائے لگتے ہیں اور جب اس کی گفتار کا ذکر کرتا ہے تو بندشیں اتلی سست و سبک ہو جاتی ہیں گویا پھول جھڑھے ہیں گو اس کے جذبات میں وہ تنوع اور ندرت نہیں جو ٹیکور کی امتیازی شان ہے لیکن معنی آفرینی، جدت تخیل اور رنگینی بیان میں وہ اپنے ہم عصر سے آگے بڑھ جاتا ہے —

زمانہ حال میں جب زندگی کی ہلکامہ پروری اور حریت کی ستم رانی نے آرت کو پسپا کر رکھا ہے اور وہ دن دور معلوم ہوتا ہے جب وہ از سر۔ نو تازہ دم ہو سکے گا تو یہ ملک کم از کم اس اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک پر ضرور فوقیت رکھتا ہے کہ آج ایسے بلند مرتبہ شاعر کسی ایک ملک میں موجود نہیں ہیں۔ ارد شیر خبردار انہیں معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہے —

یہاں ہم اس کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ توجیے میں شاعر کے جذبات کو صحیح طور سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے —

محببت کا گیت | جہاں زرِ گل کے فوارے صبح و مسا چلا کرتے ہیں اور اپنے ستارے جبین قطروں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں —

جہاں درویشِ دُشیزہ صبح خوابوں کے تانے بانے سے نور کے تار نکالتی ہے، جہاں گلزاری پردوں کے جھاملاتے ہوئے سایے تل کی طرح سمت جاتے ہیں اور مستانہ ہوائیں متحر خرام دھتی ہیں —

جہاں دوچ کے چاند کی ملکبھی کر نہیں فحش کھا کر صبح تاباں کے آفوش میں گر پڑتی ہیں —

وہیں، میں ہری ہری دُوب پر ناچتی ہوئی دنیا والوں کو اپنے گیت سنانی ہوں —

جب آفریش کا سوتا سوکھا ہوا تھا اور دنیا کی بساط ایک بے روح ہیلولی سے زیادہ نہ تھی —

جب ہر ذرہ اس شعلے کے انتظار میں دم بخود تھا جس کی لہک جان جہاں بن جائے گی۔۔۔

جب 'زمانہ' اپنی آنکھوں اور کانوں کو بازوؤں سے دھک کر خاموش و مبہوت بٹکھا ہوا تھا —

اور حقیقت خوابیدہ اس دور کی تلاش میں حیران نہی جو مدتوں پہلے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی —

تو — میں نے ایک رسلا نغمہ چھپڑا اور اے لو! انہیں میرے ہر ہر نقش قدم پر ایک ایک عالم کروت لیتا نظر آیا —

میری بڈسی کی ہر تان ایک چلکاری تھی جس نے رات کے ڈیپکوں میں جوت جکا دی —

اور سنہرے پرندوں کی طرح، مہر و مہاء نے میری مسرت کی نورانی

ملاؤں میں گوندہ کر دنیا نے گلے میں پہنا دی —

مہری نواسلجی کے سانچے میں خلد ہریں کا کالہ دھلا اور وہاں

کے برگ و شجر نے فہر فانی انبساط کا لباس اوڑھ لیا —

اور 'وقت' موسیقار کی طرح آپ اپنی خاکستر سے اٹھا کہ میرے

مندر کی آرتی کرے —

اور میرے سرگم کی سیڑھیوں پر چڑھ کر 'حقیقت' میرے حضور میں

سجدہ ریز ہوگئی —

میرا ہر تار نفس بہار کی دلربائیوں کے ساتھ غزل خواں ہے - میں

بادلوں کے جھولے پر جھولتی ہوں، وہ میرے اشاروں پر رقص کرتے ہیں -

اور میں برشکال کی ہلکی ہلکی پہوار کے ساتھ ناچتی ہوں - کبھی

زمستان کی سرد پتلیوں کے ساتھ میں خاک بسر دھتی ہوں —

اور کبھی بادِ سموم کی ہم رکاب ہو جاتی ہوں —

کبھی برف کے ٹکڑوں کے ساتھ زمین پر پھسلنے لگتی ہوں —

کبھی میں دن کی روشنی کے ساتھ آتی ہوں اور کبھی رات کے

ساتھ — وہ رات جو سپنا پوری کی ملکہ ہے —



تیرا تبسم | تیری مسکراہٹ بھالے کی وہ انی ہے جو فولاد کے دل و جگر میں
بھی سوراخ ڈال دیتی ہے —

وہ دھوپ چھانڑ کی پرچھائیں ہے جو ندی کے سبک رفتار دھارے

کو آئینہ دکھاتی ہے —

تیرا تبسم گلاب کا وہ پھول ہے جس کی پلنگھیاں برف پر بکھر گئی ہوں -

جان من! تجھے کیا خبر کہ تیری کرشمہ گری نے 'تبسم' کا پھراپٹ

اظہار اختیار کر لیا ہے —

ایک جنبش لب؟ — اور مہرے خیالات کا سارا شہرازہ منتشر ہو گیا۔

ایک لرزہ تبسم؟ — میں اس کا اتنا ہی دسیا ہوں جتنا سردیوں

میں سورج کی ایک کرن کا —

ہلکی سی مسکراہٹ؟ — اور میرا دل آپ اپنی خود فریبیوں کے

دام کا اسیر ہو گیا —

جان من! اس شمع کی لو کو زیادہ نہ اُکسا ورنہ کس کا دیدہ ہے

جو خیرہ نہ ہو جائے —

گرمیوں کی کوئی صبح تھری مسکراہٹ کی دل کشی کو نہ پاسکی

سردیوں کی چاندنی کو لجاجت کا یہ انداز کب مہسر ہے؟ شفق شام یا

آیا کسی گل خنداں میں یہ بانک پن نہ آیا — نہ آیا —

حسن و جمال کا کوئی مجسمہ قوس قزح کی رنگینوں کو ہونٹوں

میں گھلا کر یوں فضا میں نہیں بکھیر سکتا —

تھرے تبسم کی ضیا طرازی میں میری چمک جگدو کی طرح ماند پڑ رہی ہے۔

لہہ! ان ہونٹوں اور آنکھوں کو دوسری طرف پھیر لے جلتی ہر جنبش

کے ساتھ جلت کے چراغ جلتے اور بجھتے ہیں۔

تیرا تبسم میری دنیا میں ہلکا مہرہ برپا کر دیتا ہے اور پھر اس کے

بغیر ہر طرف سناٹا ہوتا ہے — سناٹا اور اندھیرا! —

اگر اس دنیا میں کوئی بہشت بن سکتی ہے تو اس کی تخلیق تھرے

ہی تبسم سے ہوگی! مہرے سروناز، ایک مرتبہ اسی انداز سے مسکرا دے۔

(۱) نظارہ

وارداتِ محبت | کف دریا کی طرح سبک اور سفید پھولوں کی سیج سے —
خوابِ ناز سے میری محبوبہ یوں بیدار ہوئی گویا گل

صلوبر کی ایک چھتری لچک کر تھامی سے گر پڑی ہو۔

گویا سہلا پوری سے کوئی دیوی اس دنیا میں اتر آئی ہو۔ یا لہلہے
شب کی گود میں بلت نور منچل اٹھی ہو اور اس کی جلوہ گستری نے زمین
و آسمان کو شاداں و فرحان کر دیا ہو۔

رات سے کہو کہ بھول جائے اپنے تئمتائے ہوئے ستاروں کو اور صبح سے
کہو کہ بھول جائے اپنے شبلمی اجالے کو۔

سمندر سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتا ہے اپنی بیکرا نی کو، اور بہار سے پوچھو
کہ کیوں یاد کرتی ہے اپنی چمن آرائی کو، نہیں بھول سکتا کیا یہ بھول
اپنی نازک ادائی کو، اور کب تک روئے گی زمین ان نونہالوں کو جو
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھوند خاک ہو گئے۔

اگر وہ بھول سکتے ہیں تو سب کچھ بھول جائیں کیونکہ دیدار
محبوب کے بعد شاعر اپنے گیتوں کو بھی بھول رہا ہے۔

دل نواز! یہ جو صداے نغمہ فضا میں گونج رہی ہے —
دراصل ان لہروں کی صداے بازگشت ہے جو تیری دوح کے وسیع
سمندر میں اٹکھیلیاں کیا کرتی ہیں۔

ان موتیوں کی چمک میں جو تیرے دل کی گہرائیوں میں سامان
نظارہ مہیا کر رہے ہیں۔

(۲) حسن

کلی کے لوچ سے پھل رنگ و بو حاصل کرتا ہے اور سیلاب اشک میں مسکراہٹ کی سیپی اچاگر ہوتی ہے۔ رات کی گہری تاریکی میں دنیا ابدیت کے خواب دیکھتی ہے اور قدرت کے ارتقا میں انسان کی قوت پروان چڑھتی ہے۔ زندگی موت کے رتھ پر بٹھ کر جہاں کشتی کرتی ہے اور کانٹوں کے آغوش میں پھول یوں کھلتا ہے جیسے رشک کے آغوش میں عشق! اور جس طرح نور عالم سست کر آفتاب میں سما جاتا ہے اسی طرح

حسن کے سارے تار مہری محبوبہ کے رباب میں اکتھا ہو جاتے ہیں۔

دیکھا ہے کبھی راج ہنس کو تم نے مان سرور میں تھرتے ہوئے دیکھا ہے کبھی قطرہ کو گہر ہوتے ہوئے؟ برف کو پگھلتے ہوئے؟ اور یا تم نے گول کی پتی کی نزاکت کو غور سے دیکھا ہے؟ کسی تھتری کے پر کبھی تمہارے ہاتھوں پر تھر تھراے ہیں؟ شاعری کے ابدی ترانوں کی گونج کبھی روح کے ساز پر سنی ہے؟

خواب میں کوئی پری کبھی تمہیں کوہ قاف اٹھا لے گئی ہے؟ اگر ایسا ہوا ہے۔ تو تم میری محبوبہ کی نزاکت، ملاحت اور لطافت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ جو آب حیات سے زیادہ لطیف، کنول سے زیادہ ملیح، اور چھوٹی موٹی سے زیادہ نازک ہے۔ مہری محبوبہ جازوں کی چاندنی کی طرح سیپیں اور چودھویں کے چاند کی طرح خلدان و فرحان ہے۔

وہ امرت کے لب ریز پہالے کی طرح جوانی کے دس میں شرابور ہے گاہ میں وہ سافر ہوتا جس میں یہ شراب شباب تھالی گئی ہے تو میں اسے اپنی رنگوں میں اس طرح حلول کر لیتا کہ ایک قطرہ بھی چھلک کر نہ گر سکتا۔

✓ (۳) نشاط

سنوار نکھار کے بعد مہری محبوبہ گل شکستہ کی طرح آغوش
گشودہ ہو جاتی ہے۔

دور سے میرے نہیں حریص بہونرے کی طرح اس کے دس کو چکھنے
کے لیے ابرؤں کے پر تولے لگتے ہیں۔

پھر میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ملتجی آنکھوں کی دور سے پتنگ
کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ لوں۔

لیکن یہ دیکھو وہ نہیں پڑی۔ اور چشم زدن میں دور کت گئی
اور پتنگ پھر ہوا میں اڑنے لگی۔

اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہ تالاب میں جل کلیل کرتی اور تھک کر
کنارے پر بیٹھ جاتی ہے۔

جب وہ جوڑا کھول کر پانی میں اپنے پاؤں لٹکا دیتی ہے تو معلوم ہوتا
ہے کہ عروس شام نے مشرق کی ساری رنگیلیاں چرائی ہیں۔

اور جب وہ اپنے گلے میں کنول کے قنٹھلوں کی مالا ڈال لیتی ہے
تو گمان ہوتا ہے کہ سلگ مرمر کے ایک بت پر کھوپڑہ نقش و نگار بفا رہا ہے۔

جب وہ پانی میں مٹہ دیکھتی ہے تو گویا چاند فرش آب پر کنول
کے چھولے میں چھولے لگتا ہے۔

سورج کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں عظمت ہے اور آگ کو اس
لیے کہ اس میں روشنی ہے۔

چاند کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں حسن ہے اور دریا کو اس
لیے کہ وہ شہر فانی ہے۔

بادل کو اس لیے پوجتا ہوں کہ وہ کبھی گر جاتا ہے، کبھی برستا ہے

اور کبھی کھل جاتا ہے —

اور ہوا کو اس لئے کہ وہ کبھی آندھی بن جاتی ہے اور کبھی نسیم و شمیم —

کہوں نہ ان دیوتاؤں کو چھوڑ کر ایک اپنی محبوبہ کی پرستش

کروں جس میں یہ سب صفات موجود ہیں —

وہ سورج بلندا چاہے تو واللہ میں آسمان بن جاؤں —

اور وہ بجلی بنے تو میں بادل بن جاؤں —

وہ کوئل بنے تو میں آم کی قال بن جاؤں اور وہ مرلی ہونا چاہے

تو میں 'کشن' بن کر اسے ہونتوں سے لگالوں —

وہ سمندر بنے تو میں ساحل ہو جاؤں —

اور وہ پھول بنے تو میں بھونرا بن کر ہمیشہ اس کے کانوں میں

سر گوشیاں کروں —

الہی! مجھے حیات دارین عطا کر کہ میری محبت کا چراغ ہمیشہ روشن رہے —

وہ دیکھو، وہ جان جاں، وہ بلند حیات، وہ دل کی کلی ادھر آ رہی

ہے۔ میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو سب کو اس کی ایک لغزش مستانہ

پر نثار کر دیتا —

وہ آ رہی ہے — ایک سر جوش لہر کی طرح جو میرے دل سے ایک

مہلے زاگ کی طرح ٹکرا جاتی ہے —

میں ایک بت سنکیں تھا جسے اس کی ایک ٹھوکر نے 'اہلیا' کی

طرح زندہ کر دیا —

اعجاز مسہکا پر کہوں نہ ایساں لاؤں کہ خود بھی تو ایک فسوں

طراز کا جلایا ہوا ہوں —

(۴) پوجا

نہ آفتاب تھا اور نہ ماہ تاب — ایک تھرا ہی جلوہ تھا —
 نہ سلسلہ تھا اور نہ ساحل — زمیں سے آسمان تک تیرے سوا کچھ نہ تھا —
 نہ جنوں تھا نہ عقل — فہم و وہم سب تیرے کرشے تھے —
 نہ پرواز تھی نہ رفعت — لہذا تھری تھی ' صبا تھری تھی —
 نہ تو آسمان میں تھی اور نہ زمیں میں — تو محبت کے آژن کھڑے
 پر بیٹھ کر ' پتھر کی چادروں میں لہراتی دھتی تھی —

(۵) بے بسی

عشق کا بندہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی کہ میں
 اس کی حقیقت کو پاگیا —
 اس کی ایک آنکھ جسم بہ کنار اور دوسری اشک بار ہے — اس کے
 ایک ہاتھ میں درشنی اور دوسرے میں تاریکی ہے —
 وہ آگ، سے زیادہ گرم اور برف سے زیادہ سرد ہے — وہ زندگی، خواب
 اور موت کا حسین ترین امتزاج ہے — اس کا سر بہشت بریں میں ہے تو پاؤں
 تخت الثویٰ میں —
 مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں محبت سے ناواقف ہوں لیکن اس کی
 عینک سے تجھے پہچان گیا ہوں —

کبھی کبھی میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب املت آتا ہے اور میں
 سوچتا رہ جاتا ہوں کہ حدیث عشق کی تفسیر یہی تو نہیں ہے —
 وہ ہمارے آنسو ہیں جو آسمان پر جم کر ستارے بن گئے ہیں —
 جان من، ' زمیں آسمان کی دی ہوئی بارش کے معاوضے میں کیوں

نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی کا منہ اوپر کی طرف پھیر دے اور ان کے ساتھ
 اوپر چڑھ کر مہری روح جلت کی رنگیلیوں میں تحلیل ہو جائے —
 آفتاب صبح اس لیے طلوع ہوتا ہے کہ شام کو غروب ہو جائے —
 لیکن مصیبت کا آتش کدہ ایک مرتبہ بھڑک کر کبھی نہیں بجھتا -
 سعادوں کے پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ مرجھا جائیں لیکن آسمان کا گل
 کدہ سدا بہار ہے —

جب مہر و انجم نوا محروم سروں میں بہاگ گاتے ہیں تو ار خدا نے
 مصیبت! میں سمجھ جاتا ہوں کہ درد کی انتہا یہ ہے کہ دوا ہو جائے —

(۶) ہوش

ایک مرتبہ مہری کشتی بہنور میں پڑ گئی، اس کے مستول اور باد بان
 ٹوٹ کر پانی میں گر گئے اور لنگر بھی بہہ گیا —
 کسی کم دیدہ مسافر کی طرح گمراہ ہو کر یہ ناؤ بلندھاڑ میں یوں
 حیران و غلط چکر کات رہی ہے کہ سست و ساحل دور سے اسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں -
 اور اسی خستہ حالی میں کیا دیکھتا ہوں کہ افق پر سورج ندی سے
 نہا کر نکلا اور ایک سنہری کشتی بام فلک پر ہویدا ہوئی —
 نہنگ آسا موجوں میں پھنس کر مہری نلھی سی ناؤ تلکے کی طرح
 کبھی ڈوبتی ہے، کبھی ابھرتی ہے -- کیا معلوم کہ ناخدا مہری خبر
 لے گا یا نہیں —

اُج جو مہری معصوبہ اُداس ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے
 دیاکار بندوں کا سوگ لیا ہے —

اَس کے ہونٹوں پر تبسم ہے جان ہو کر توپ رہا ہے اور یہ معسوس

ہوتا ہے کہ آسمان پر بادل گھر تو آئے ہیں لیکن نہ وہ برستے ہیں اور
نہ کھلتے ہیں۔ نہ ان میں بجلی توپتی ہے۔

✓ آہ، مجھے غم زہ کی جانت سونی ہو رہی ہے مہری بے نور آنکھوں
کا کاجل دھل رہا ہے۔

میں نے کائنات پر ذرہ چھان مارا لیکن مہری سایہ حیات کہیں نہ ملی۔
میں ازل اور ابد کے سروں کو دیکھ آیا۔ اور تحت الثریٰ کی
عشق گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ آفتاب کی آتشیں زلفوں کو کلمہ بنا کر
میں اس غار میں اترا جہاں تاریکی اور تلہائی دو بھنبیں دھتی ہیں۔
لیکن وہ مشام جاں کہیں نہ ملی اور مہرے گیتوں کے ڈیلے ٹوٹ
کر ہوا میں منتشر ہو گئے۔

(۷) گامرائی

او مرغ خوش الحان، تو ہمیشہ سر بلند پہاڑیوں کی سہر کرتا
رہا ہے۔ اب نیچے اتر اور وادیوں کو بھی اپنے نغموں سے زمزمہ دیز
کر دے۔ تو ہمیشہ عظمت و رفعت کا جویا رہا ہے۔

آ، اور میدان کی وسعت کو بھی ایک نظر دیکھ جا۔

ان بدلیوں میں پانی ہے تو ان برساتی ندیوں کی اٹھتی جوانی
بھی کچھ کم تسکین بخش نہیں۔

آ، میرے نغمہ گر اور اپنے مہقہ بولوں سے ان میدانوں میں امرت
کی دھار بہا دے۔

✓ درد نا آشنا ساحل کو ملانے کے لیے سمندر روز اس کی خدمت
میں جل پڑیوں کے غول بھجوا کرتا ہے۔

وہ کبھی ہلکے سروں میں گاتی ہیں، کبھی آنسوؤں سے اس کے پھر
 دھوتی ہیں، کبھی اس کی سنگ دلی پر کھج کر چمچ اٹھتی ہیں —
 یہ ساحل کبھی نہ پسہچیکا — اور ایک دن وہ آئے گا کہ مدوجزر
 کا طوفان اس کے بلند بلند توڑ دیتا —

پیاری، اسی طرح دریائے محبت میں طوفان اٹھنے والا ہے جو تجھے
 اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپا لے گا —

محبت کے دیوں پر بیٹھ کر میں اندھیرے میں اڑا کرتا ہوں —
 میں صرف ایک گیت گاتا ہوں، میرے ساز میں صرف ایک راگ ہے،
 ایک تان ہے، ایک سر ہے —

میں صرف ایک خواب دیکھتا ہوں —
 میں نے سب دیوتاؤں کے مندر توڑ کر ایک مندر کھڑا کیا ہے جس
 کا نام ہے — پریم مندر —

میرے لیے سارے الفاظ کے معنی صرف ایک لفظ میں سمٹ آئے ہیں — پریم —

الوداع

میرے گیت، جا اور آسمان پر وہ ساز چھوڑ کہ ستارے توت کر
 گر پڑیں اور تیری ایک ایک تان اس کی جگہ لے لے، حتیٰ کہ تو سارے
 فلک پر چھا جائے — اب تک تو نازک پودوں کی لچک دار ٹہیلیوں پر
 نوادیز رہا اور یا مہری چھوپڑی میں بیٹھ کر نوحہ خوانی کرتا رہا —
 اب جا اور اس آسانی ملک کو اپلی سحر نوائی سے مدھوش کر
 دے جو گویں بر آواز تیرا، منتظر ہے —

بادشاہ کھن

غزلیات اشرف

اشرف، ولی کے معاصرین میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ ولی اور اس کے معاصرین نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ولی کا شعر ہے:-

اشرف کا یو مصراع ولی مجکوں ہے دلچسپ
البت ہے دل و جاں کوں مہرے پیم نگرہوں

اشرف نے بھی ولی کا ذکر کیا ہے —

کرتا ہے یو مصراع ولی سید دل اشرف
پہر مری خبر لپے وو صہاد نہ آیا

ان اشعار سے اشرف کا معاصر ولی ہونا ثابت ہے۔ ایک اور ثبوت ان کی معاشرت کا ہے ولی نے اپنے کلام میں سید ابوالمعالی نامی سید زادے کا ذکر کیا ہے اور بقول قایم اس کے ساتھ ۱۱۱۲ھ میں دہلی کا سفر بھی کیا تھا۔ قایم لکھتا ہے —

”درستہ چہل و چہار از جلوس عالم گھر ہمارا سید ابوالمعالی نام سہ،
پسرے کہ دلہی فرینتہ او بود پشاه جہاں آباد آمد“ —

اشرف نے بھی سید معالی کے حسن و جمال کی تعریف میں ایک پوری ہزل لکھی ہے اور متفرق اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا ایک شعر ہے —

معالی حسن میں سب سوں بڑا ہے اسے دیکھن کوں کئی عالم کھڑا ہے
 شفیق نے اشرف کو معاصرِ ولی لکھا ہے لیکن حمید اورنگ آبادی نے
 اس کو ”بلا واسطہ شاگردِ ولی“ لکھا ہے۔ حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ
 اشرف باضابطہ شاگردِ ولی تو نہ تھا لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے۔
 شاید ایسا ہو۔ لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے
 ان کے استاد و شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ بہر حال معاشرت مسلمہ۔ ولی نے ۱۱۱۹ھ
 میں انتقال کیا ہے لیکن اشرف فرخ سہر کے زمانے تک زندہ رہا۔ سید معالی کی تعریف
 میں اس کا ایک شعر ہے جس میں فرخ سہر کا ذکر استعارتاً کیا ہے۔

چمکت کے خوبرو سارے نہ ہونیں کیوں حکم میں اس کے

دیار حسن میں فرخ سہر سید معالی ہے

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے لیکن اس بیان کے سوا کوئی اور شہادت
 یا سند اس کے گجراتی ہونے کی نہیں ملتی ہے البتہ اس نے اپنے کلام میں
 گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے عقیدت ظاہر کی ہے۔
 پھر اشرف کے شاہ عالم ہیں خلف الصدق سید اقطاب
 مجبہ سے عاصی کوں کٹیں نہیں ہے پڑا مگر ان کی جلاب فیض مآب

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو ”شاعر ملک
 دکن“ لکھا ہے اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنے
 شعر کی داد شاعرانِ دکن سے طلب کی ہے۔ حمید کے تذکرے میں اس کی
 فزل ہے جس کا مقطع ہے۔

یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف

تمام شاعر ملک دکن‘ سخن کی قسم

اشرف کے حالات ابھی تک روشنی میں نہیں آئے ہیں۔ حمید نے اس

کا نام محمد اشرف لکھا ہے لیکن انجمن ترقی و اردو کے کتاب خانے میں اس کا جو دیوان ۱۱۲۹ھ میں محمد بدیع الزماں کا لکھا ہوا ہے اس میں اس کا نام جگہ جگہ ”اشرف الموسوی المدنی الشاہی“ تحریر ہوا ہے۔ یہ دیوان انجمن کو سورت میں دستیاب ہوا ہے۔ سنی المذہب تھا۔ اس لیے کہ شاہ عالم گجراتی سے عقیدت رکھتا تھا اس کے سوا اس کا ایک شعر ہے —

اخلاص سوں نظر کر اے صاحب بصیرت

ہر چار یار حضرت تمثیل چار قل ہے

شہیدان کربلا اور اہل بیت سے بھی خاص محبت رکھتا تھا۔ اس نے کئی سرہنہ لکھے ہیں چند اس کے دیوان میں بھی ہیں۔ اس کے دیوان کے حاشیے پر رضی، صالح اور فراقی کی غزلیں ہیں۔ فراقی کا ذکر ولی نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں رضی کا ذکر ہے —

اس مصرع رضی کا اشرف ہے دل سوں بھو کا

بے غم ہمارے غم کون کھاتا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصرع رضی مصحف کل کا سبق بابل پڑے

حمید نے رضی کو معاصر اشرف اور شاگرد ولی بتایا ہے۔ رضی، ولی کا شاگرد ہو یا نہ ہو لیکن معاصر اشرف تو ضرور تھا اور اس طرح فراقی اور صالح بھی اس کے ہم عصر تھے۔

اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا۔ کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے۔ اپنے زمانے میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔ حمید نے لکھا ہے —

طبع رنگینے داشت - شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و

دیوان لطیف تصنیف نمودہ —

اشرف کے کلام کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو
 رنی کے کلام میں بھی نمایاں ہے - ولی نے اپنے اشعار میں امرت لال ،
 گوہل لال ، مسدد یار خاں ، سید ابوالمعالی کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی
 ہے - اس طرح اشرف نے بھی عظمت اللہ ، ظفر خاں اور سید معالی کے حسن
 کی تعریف کی ہے ، سید معالی کی تعریف کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - دو علیحدہ
 غزلوں میں عظمت اللہ اور ظفر خاں کی تعریف لکھی ہے یہاں ایک ایک درود
 شعر نقل کیے جاتے ہیں —

عظمت اللہ بسکہ ہے پیارا جیہوا پس کا مہوں اس اُپر وارا

ظفر خاں گلشن ناز و ادا بلبل دل اس اُپر ہے مبتلا
 گرچہ ہے افغان پسرو و ناز نہیں ہے ادا اس کی اداے مہرزا

انجمن کے نسخے سے اشرف کی چلند غزلوں نقل کی جاتی ہیں جن سے
 اس کی شاعری کا انداز معلوم ہوگا - (چ)

✓ جب سجن مجھ اُپر نقاب کیا چشم عاشق کوں جوں ستاب کیا
 جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب نقل خاطر جگر کباب کیا
 آشنا اس کے بحر حسن ستی مہیں افس دل کوں جہوں کباب کیا
 تب سین ہوں فرق بحر درد و الم جب سین اس شوع نے عتاب کیا
 تجھ جدائی میں چشم اشرف سوں جوش دریاے خون ناب کیا

قد موزوں نے اس کے کام کیا سرو زرا کوں پائے نام کیا

پاے تا سرھے بسکہ صورت ناز کس ادا سوں دیکھو سلام کیا
 ساغر مست چشم ساقی سوں نشاء عشق میں مدام کیا
 خضر وقت اس کوں بولنا ہے بجا جس سوں اموت بچن کلام کیا
 مشرق مکہ پہ کھول زلفاں کوں صبح کے بیچ وقت شام کیا
 نیم بسمل تھا تیغ ناز سعی نگہ شوق نے نسام کیا
 تب سوں ہے سرو باغ میں پایلد جب سوں و و سرو قد خرام کیا
 تجھ جدائی میں خواب راحت کوں میں اپس کے اُپر حرام کیا
 بسکہ اشرف اُپر ہے فضل خدا
 صف عشاق میں امام کیا

اے ہوش رہا سندر مجھ پاس تک آتے جا
 دشتے کوں محبت کے بازو پہ بلدھاتے جا

یوں دل ملیں ہے خواہش تجھ گھر کی طرت آؤں
 تک ناؤں بتاتے جا یا تھانوں بتاتے جا

دیدار سعی اپنے ، محروم نہ رکھتے مجھ کوں
 انچل کوں اٹھا مکہ سوں تک درس دیکھاتے جا

مغرور نکو ہو توں اس حسن پہ اے ناداں
 یو سب ہے فدا آخر یمن بی کساتے جا

لائی ہے نظر جن کی اے دھک پری تجھ کوں
 دو بیم کے اچھر سوں ان پاس چھراتے جا

کر رام لاتا مجھ کوں مشتاق ہو آیا ہوں
 تک رام کلی میاں یک تان سناتے جا

اے گان ادا سندر اشرف ہے ترا طالب
 تک پیار سعی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

عشق تیرے میں بسکہ ہوں بیتاب بےقراری ہے دل کوں جیوں سہماب
 تجھے جدائی میں خواب آوے نہیں گر مہیا ہو بستر سلجباب
 نکتہ خال کوں رو بوجھتا ہے جس نے تجھے حسن کی دیکھا ہے کتاب
 تجھے جبین پر عرق کی بوندیاں دیکھ شرم سوں گوہراں ہرے ہیں آب
 حسن تیرے کی جھلجھلات کوں دیکھ پردۂ ابر میں چھپا مہتاب
 دیکھ تجھے حسن شعلہ خیز کوں شمع اشک سوں جل ہوئی ہے گل گل آب

بیگ دی سوں خبر لے اشرف کی
 تجھے پرت میں ہے بھخورو بے خواب

تجھے دھان کا العدم سوں فلجۂ گل ہے خجبل
 تجھے لب میگوں کی کونہیت انگے مل ہے خجبل
 عشق نے جب سوں مرے دل کے چمن میں گل کیا
 بوستان عاشقی میں تب سوں بلبل ہے خجبل
 نغمۂ مطرب ہے از بس نشاء بخش اس بزم میں
 شیشۂ خالی نمین آواز قلقل ہے خجبل
 نو خطاں کے حسن کے دریا سہیں ہوں میں آشنا
 موج خط غدیریں سوں ان کی کاکل ہے خجبل
 گل دغاں کے حسن سوں از بسکہ ہے رشک ارم
 سر زمیں ہلد سوں کشمیر و کابل ہے خجبل

پیچ و تاب زلف شہرنگ پری کوں دیکھ کر
 دامن دشت پریشانی میں سنبل ہے خجبل
 گلشن اشعار اشرف بسکہ ہے رنگیں بہار
 مدد لہب طالب گلزار آمل ہے خجبل

تجہ حسن کے وصف کا جب سوں بہاں مجھ

کہتے ہیں تب سوں اعلیٰ سخن درفشان مجھ

لکھتا ہوں مو قلم سوں ایس ضعف کا بیان

از بسکہ ہے تصویری نازک مہاں مجھ

دشک یمن کیا ہے دل اس رشک مہر نے

اپے عقیق لب یہ دیکھا رنگِ پاں مجھ

اشرف ہوں درد عشق سوں ہرنگ کھر با

کیتا ہے بسکہ گاہ نمں ناتواں مجھ

دیکھا ہے جب سوں ووشہ ابرو کماں مجھ

جیوں برق جلوہ گر ہو گیا ہے سپند وار ووشہ سوار تازی آتش علان مجھ

عاشق کے حق منہوں دیکھو کیا ناز شوخ ہے ماریا نگاہ تیز سوں دلبر سداں مجھ

آزاد دیکھ زلف چلیبھا کی موج (سوں) زنجیر بی کیا ہے سہی قامتیں مجھ

رکھتا ہوں آہ تیشہ فرہاد کو کہن ہے جب سوں عشق خسرو شیریں زبان مجھ

دقت نہت ہے نت مرے نازک سخن منہیں سر مشق فکر جب سوں ہے رو مو مہاں مجھ

اس شمع رو کی جب سوں ہے اشرف مجھ لیکن پروانہ ساں نہیں ہے کدھیں خوت جاں مجھ

تبصر

تاریخ و سیر

۶۱۴	حیات مسعودی
۶۱۵	تذکرۂ معتمدین
۶۱۶	انقلاب فرانس

متفوقات

۶۱۹	مدارس صوبہ متوسط و ہزار کا درسی سلسلہ

اردو کے جدید رسالے

۶۲۰	انہس
۶۲۰	صبح امید
۶۲۱	اولاد علیگیرین

خاص نمبر

۶۲۲	ہمایون کا درسی ادب نمبر

ادب

۵۹۱	دریائے لطافت
۵۹۵	نکات الشعرا
۵۹۶	دیوان تاباں
۵۹۷	حامد کے سو شعر
۵۹۸	حضرت احمق کے سوا سو شعر
۵۹۸	صہبائے ولا - جوش ولا
۵۹۹	اتالیق الصبیان
۶۰۰	مرقع سخن
۶۰۲	سلسبیل
۶۰۵	خستگان
۶۱۰	سودیشی اردو - فردوسی کہانیاں
۶۱۲	ملتخب افسانے
۶۱۳	لال قلعہ کی ایک جھلک

تبصرے ادب

دریائے لطافت

مطبوعہ و شایع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔ صفحات
مع مقدمات وغیرہ سوا چار سو۔ کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ۔ قیمت
مجلد تین روپے شہر مجلد دو روپے آٹھ آنے

یہ اردو زبان کے نامور شاعر سید انشا اللہ خاں انشا کی تالیف ہے۔
جس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ اور معانی و بیان سے بحث
کی گئی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں صرف و نحو کا بیان ہے۔
یہ سید انشا کی تصنیف ہے۔ دوسرا حصہ جس میں منطق، عروض وغیرہ
سے بحث کی گئی ہے مرزا قتلعل کی تالیف ہے۔ پہلا حصہ کتاب کی جان
ہے۔ اس میں اردو کے قواعد، معاویات اور روزمرہ پر نہایت تحقیق
اور خاص اصول و ترتیب کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور تمام مسائل پر
محققانہ اور ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔ سید انشا چونکہ ہندوستان کی

مختلف زبانوں سے بخوبی واقف تھے، دہلی (جو اس زمانے میں فصاحت اردو کا گہوارہ تھی) کی شاعری کے خاص علم بردار تھے، اور لکھنؤ کے جدید دور شاعری کے بنانے میں بھی شریک تھے اس لیے ان مقامات کی زبان کے فرق اور خصوصاً دہلی کے محلے محلے کی زبان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ہر محلے، طبقے اور پیشے کی زبان کی خصوصیات اور ان کے باہمی اختلافات کو بڑی باریک نظری سے دکھایا ہے۔ اس کے سوا ہندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں سے بھی بحث کی ہے۔ اپنی تحقیق سے زبان کے ایسے قواعد منضبط کیے ہیں کہ وہ آج تک کم و بیش برقرار ہیں۔ کتاب کے وہ حصے خاص طور سے دلچسپ ہیں جن میں سید انشا نے کسی خاص محلے، طبقے، پیشے یا صوبے کے محاورے یا روزمرہ کو فصیح یا غیر فصیح یا کسی قاعدہ کو صحیح یا غیر صحیح اور مستند یا غیر مستند قرار دیا ہے۔ ایسی اکثر باتیں وہ اپنے ذوق کی بنا پر لکھ گئے ہیں۔ بے شبہ ان میں سے اکثر آج تک وہی مروج ہیں اور تسلیم کیے جاتے ہیں جن کے حق میں انشا نے اپنے ذوق کی بنا پر فیصلہ کیا تھا، لیکن بعض محاورے، الفاظ اور قاعدے ایسے بھی ہیں جو سید انشا کی نظر میں غلط، غیر فصیح یا غیر مستند تھے لیکن آج وہ صحیح، اور فصیح اور مستند ہو گئے ہیں۔ یہ چیزیں لسانیات کے طالب کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ اسی طرح انشا نے بعض اساتذہ پر تلقد کی ہے۔ ایک اعتراض مرزا سودا پر یہ کیا ہے کہ وہ ”لہک“ چھپک والے قصیدے میں کٹک بدمعنی لشکر محض قافیے کی ضرورت سے استعمال کر گئے ہیں..... کٹک ہرگز اردو کا لفظ نہیں۔“ اس کے ثبوت میں ایک تو سکندر کا مارواڑی زبان کا مرثیہ پیش کیا ہے اور دوسری سید بخت سکھ مارواڑی کی نثر سے پیش کی ہے۔ انشا نے یہ

عجیب بات لکھی ہے - کتک سانسکرت زبان کا لفظ ہے اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کی بولہوں میں وہیں سے آیا ہے - قدیم اردو شاعروں نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے چنانچہ سودا اور سکندر سے تقریباً ایک سو سال قبل نصرتی نے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے - اس کے سوا قدیم اردو لغت کی کتابوں میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے - ایسی صورت میں اس کو خالص مارواڑی زبان کا لفظ کہنا صحیح نہیں —

دریائے لطافت میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جن پر بحث مباحثہ اور گفتگو کی ضرورت ہے - زبان و ادب کے طالبوں کے لئے یہ بہت بڑا سرمایہ ہے ان کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے - اس سے زبان و ادب کے عجیب و غریب نکات ہاتھ آتے ہیں —

یہ کتاب ۱۸۰۸ ع میں لکھی گئی تھی جب کہ جدید مغربی علم ادب کی پرچھاٹھیں ہماری ادبہات پر نہیں پڑی تھیں اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو مغربی خیالات اور تحقیق و تنقید کی ہوا تک نہیں لگی تھی لیکن سید انشا کی سلامت ذوق اور باریک نظری کی داد دینی پڑی ہے کہ انہوں نے تحقیق و تنقید کا وہ راستہ اختیار کیا کہ ان کے پودا کھے ہوئے مباحث اور طریق تحقیق میں وہی تازگی اور جدت برقرار ہے — لیکن عجیب بات ہے کہ اس قدر اہم کتاب قدردانی اور مقبولیت سے محروم رہی - اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ ہمارا ذوق ادب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا - دوسرا یہ کہ یہ کتاب بلحاظ مطالعہ سہولت پیش نہ تھی - اس میں بعض جدتیں ایسی تھیں کہ ان سے لطف و آسانی کی بجائے الجھن اور دشواری پیش آتی تھی - مثلاً انہوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے حروف کے

نام بھی عجیب فریب رکھتے تھے۔ الف کو وہ اقبال اور ”ب“ کو بخشش لکھتے تھے، علیٰ ہذا۔ الف بے کی سادگی کے مقابلے میں اقبال، بخشش وغیرہ ظاہر ہے کہ کس قدر دشواریاں پیدا کرتے ہوں گے اور قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہوں گے۔

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے ۱۹۱۶ ع میں اس کے غیر ضروری اجزا کو حذف کر کے اور طولانی، غیر واضح اور دقت طلب عنوانات وغیرہ کو بدل کر مرتب کیا تھا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا۔ یہ سہولت بہم پہنچانے کے بعد بھی اس کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس سے ہر شخص بآسانی مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے افادے کو عام کرنے کی فرض سے انجمن نے اس کا ترجمہ کرایا ہے۔ ترجمہ اردو زبان کے نامور اور مستند ادیب و شاعر پلڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے فرمایا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس، پاکیزہ اور صحیح ہے۔ لایق مترجم نے جگہ جگہ حواشی بھی درج کئے ہیں اور متن کتاب میں بھی توضیحی عبارتیں داخل کی ہیں جن کو مصنف کی عبارت سے مٹھوڑ کرنے کے لیے قوسین میں درج کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک بہت تفصیلی فہرست ہے جو اندکس کا حکم رکھتی ہے۔ اس کی مدد سے کتاب کے تمام مطالب و مضامین کا حال بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے اور ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے۔ انجمن نے یہ اقدام شایع کر کے سید انشا کی عالمانہ تحقیقات کو ہر اردو دان کے لیے عام کر دیا ہے۔

نکات الشعرا

تالیف میر تقی میر مطبوعہ و شایع کردہ انجمن ترقی اردو

اورنگ آباد دکن - منکات علاوہ مقدمہ و اشاریہ ۱۸۰ - کاغذ طباعت

و غیرہ عمدہ اور دیدہ زیب - قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے فہر مجلد

ایک روپیہ بارہ آنے —

جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں - یہ اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں ہے اور چونکہ ایک مشہور، مستند اور بالمد پایہ استاد کا لکھا ہوا ہے اس لیے خاص اہمیت و حیثیت رکھتا ہے - اس میں ایک سو چار شاعروں کا تذکرہ ہے - گویہ مختصر ہے لیکن اس میں بہت سی کام کی اور منہد باتیں ملتی ہیں اور ایسے تاریخی اشارے اور ادبی نکات ملتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے - میر صاحب نے بڑی تحقیق سے لکھا ہے اور شعرا کا مہیاری کلام انتخاب کیا ہے اور جگہ جگہ بڑی استادانہ تفلیدیں کی ہیں - یہ تذکرہ عمدہ اشعار کا انتخاب بھی ہے جس سے عام ناظرین لطف اندوز اور میر کے ذوق سے آشنا ہو سکتے ہیں اور شاعروں کے حالات کا مجموعہ بھی جس سے تاریخ ادب کے شائقین مستفید ہو سکتے ہیں - اور چونکہ اس میں میر نے بڑی آزادی اور بے باکی سے شاعروں کے کلام پر تفلید اور رائے زنی کی ہے اس لیے یہ تفلید کا بھی عمدہ نمونہ ہے —

اس تذکرے میں اکثر ان شاعروں کا حال ہے جن سے مصنف ذاتی

ملاقات اور واقفیت رکھتا تھا، اس لیے اس میں اکثر مستند اور محققانہ

چیزیں ملتی ہیں۔ مصنف نے شمالی ہند کے شاعروں کے ساتھ دکنی اور گجراتی شاعروں کو بھی لیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے عزت کی بھاض سے استفادہ کیا ہے۔ کہیں کہیں دکنی شاعروں کے حالات اور اسما وغیرہ میں فرد گزاشتیں نظر آتی ہیں، ان کی تصحیح حواشی میں کر دی گئی ہے، جس سے تذکرہ کا پایہ استناد زیادہ بلند ہو گیا ہے۔

اس سے قبل انجمن ترقیہ اردو نے اس تذکرے کو شایع کیا تھا لیکن پہلے ادیشن میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں۔ یہ ادیشن خاص اہتمام اور صحت کے ساتھ طبع کیا گیا ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمہ بھی ہے جو پہلے ادیشن میں نہ تھا اور آخر میں ایک اشاریہ (انڈکس) ہے جو ہر طرح سہولت بخش ہے۔

(ج)

دیوان تاباں

مطبوعہ وشایع کردہ انجمن ترقیہ اردو اورنگ آباد دکن۔ کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ۔ صفحات ۲۸۰۔ قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے۔

مہر عبدالحق تاباں دہلوی محمد شاہی عہد کے شاعر ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایہام گوی کا زور تھا، لیکن اس کے آخر زمانہ میں ایہام گوی کے خلاف بعض شاعروں نے تحریک شروع کر دی تھی اور شاعری میں سادگی اور اس کی زبان میں اعتدال و توازن پیدا کیا جا رہا تھا۔ تاباں کا کلام اس دور اصلاح کی پیداوار ہے۔ تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہوا ہے گویا محمد شاہی عہد کے اثرات ابھی پورے طور پر زایل نہیں ہوئے تھے۔ یہ پورا دیوان اسی عہد کے اخیر حصے میں تصنیف

ہوا ہے، اس لحاظ سے اس کی زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست لایق داد ہے۔ تاہاں کے کلام میں تخیل کی بالمد پروازی نہیں ہے۔ اس کی شاعری عام عاشقانہ مضامین اور بقول مہر ”گل و بلبل“ کی داستان تک محدود ہے۔ لیکن زبان و بیان کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ مہر نے اپنے زمانے کی شاعرانہ زبان کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے متعلق بہت صحیح رائے دی ہے۔

”زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل، گلستان سخن را نازک
دماغ بلبل، سبک رنگینش، فکرش با گلگون باد بہار طایق
العل بالذل است۔ ہر چند عرصہ سخن او در لفظ ہائے گل
و بلبل تمام است، اما بسہار برنگین می گشت“ —
(ج)

حامد کے سو شعر

حامد علی خاں بی۔ اے۔ جائنٹ ادیٹر رسالہ ہمایوں زیادہ تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا کلام اور ان کے مضامین ہمایوں اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے سو شعر کا انتخاب ادبی دنیا کے مدیر منصور احمد صاحب نے کیا ہے اور شروع میں دس صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے جس میں شاعر کی خصوصیات شاعری سے بحث کی ہے۔ انتخاب اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ کتابت عمدہ، طباعت رنگین ہے اور کاغذ بھی اچھا ہے، تقطیع بھی عام سو شعری انتخاب سے کسی قدر بڑی ہے۔ قیمت چھ آنے۔ ملنے کا پتا: دفتر ہمایوں، ۲۲ - لارنس روڈ - لاہور۔

حضرت احمق کے سواسو شعر

مرتبہ مرزا ابراہیم بیگ صاحب اڈیٹر سرگزشت علی گڑہ
کچھ دنوں سو شعری انتخابات کی گرم بازاری رہی۔ اب سواسو
کا آغاز ہو گیا ہے، مشہور کہاوت ہے سیر کو سواسیر۔ انتخاب کی یہ جدت
مرتب نے شاعر کے تخلص اور اس کے رنگ شاعری کے اعتبار سے بہت خوب
کی ہے۔ اکبر کے بعد طرافت نگاری میں کئی شاعروں نے زور مارا لیکن
اس کو اب تک کوئی نہیں پہنچا۔ حضرت احمق بھی ان طرافت نگار
شاعروں میں ہیں جو اکبر کے رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کا کلام اکثر رسائل
و اخبارات میں شایع ہوتا رہا ہے اس لیے وہ کسی تعارف یا تقریب
کے محتاج نہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ اشعار نہیں ہیں جن میں سیاسیات
پر سختی سے حملے کیے گئے ہیں۔ مرتب نے شروع میں ایک مختصر دیباچہ
لکھا ہے جس میں حضرت احمق کے حالات اور ”احمقیات“ کا ذکر ہے۔
(ج)

(۱) صہبائے ولا - (۲) جوش ولا -

مصنفہ شاہ ابوالحسن محمد مظفر حیدری۔ چھوٹی تقطیع،
صفحات و قیمت علی الترتیب ۱۱، ۲۸ - دیوڑہ آنہ، تین آنے۔
مصلف کے پتے: سی۔ اے۔ وی۔ ہائی سکول الہ آباد سے مل سکتی ہے۔
صہبائے ولا میں وہ چلہ نظمیں ہیں جو نعت وغیرہ میں مصلف نے اٹلاے
سفر حج میں لکھی ہیں۔ جوش ولا دراصل ایک نعتیہ نظم ہے جو عید
میلاد النبی کی ایک محفل میں پڑھی گئی تھی۔ مصلف کو نعت گوئی

میں اچھا خاصا ملکہ ہے۔ جو لوگ نعتیہ کلام سے ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ دو کتابچے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

(ج)

اقاب القاصدین

مصفیٰ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب - صنعتات ۱۷۳ - قیمت ایک

روپیہ چھ آنے علاوہ محصول ڈاک - مصنف کے پتے، نور

منزل، ڈاک خانہ راج پور، دھڑہ دوں سے مل سکتی ہے۔

یہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ”۲۲ سالہ خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ہمالہ کے پہاڑوں میں آخری دن بسر کرنے کا ارادہ کیا اور قریب ساڑھے چار سال سے یہاں مقیم ہوں۔ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد اکثر خیال ہوا کہ وقت گزارنے کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ ضرور ہونا چاہیے اور مشغلہ ایسا ہو جو دلچسپ تو ضرور ہو مگر کچھ مفید بھی ثابت ہو۔“ چنانچہ یہ مجموعہ اس دلچسپ مشغلے کی پھلدار ہے۔ جس کے لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ بچوں کو ہندوستان کی مختلف چیزوں سے باخبر کیا جائے۔ اس میں تقریباً سو پانسو نظمیں ہیں جن کو پانچ مختلف علوانات کے تحت درج کیا گیا ہے۔ (۱) حیوانات اس میں ۷۵ جانوروں کا ذکر ہے۔ (۲) مصنوعات ان کی تعداد ایک سو ایک ہے۔ (۳) نباتات ۱۷۹۔ (۴) پیشہ ور ۱۶۳۔ (۵) متفرق ۸۔

ہمارے ملک کے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے تک مختلف جانوروں، پرندوں، پودوں اور پھولوں وغیرہ کے ناموں سے ناواقف ہوتے ہیں، اور ان کی خصوصیات اور خاص حالات سے بے خبر۔ ہماری

زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو خلاص ہندوستانی چھڑوں پر لکھی گئی ہو۔ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب کو یہ خیال بہت خوب پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ایسی چھڑوں کا بیان خواہ کتنی ہی دلائل اور دلچسپ نظم میں کہیں نہ ہو زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ نظم کی پابندیاں وضاحت و تشریح چاہتی ہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کے لئے اکثر ان چھڑوں کو جو ان کی نظروں سے نہیں گزری ہیں نظم میں بیان کرنا ناقابل فہم نہیں تو سریع الفہم بھی نہیں۔ اگر اس میں تصاویر ہوتیں تو بھی آسانی ہوتی۔ موجودہ صورت میں اس سے صرف لفظی تعریضیں معلوم ہو سکتی ہیں، لیکن اشیا وغیرہ کی اصل حقیقت سے واقفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

(ج)

موقع سخن حصہ اول و دوم

مصلف ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔ منکحات

و تہمت علی الکترتہب ۸۳، ۲۰۰، آتھ آئے، بارہ آئے۔

مصلف کے پتے، پتلہ سٹی ڈاک خانہ بیگم پور محلہ

چوراہا آغا حسینا سے مل سکتی ہے۔

ان دونوں حصوں میں مصلف نے اپنی طبع زاد نظمیں جمع کی ہیں۔

پہلے حصے میں ۳۰ نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں ۸۸۔ ان کے موضوعات

مختلف و متنوع ہیں، لیکن زیادہ تر صوبہ بہار سے متعلق ہیں، ان میں

بھی بیشتر ایسی ہیں جو خاص خاص تقریروں سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً

کسی کے صاحبزادے کی تسمیہ خوانی، تعمیر مکان، کسی خاص غرض کے

لہے چلندہ، کسی کے اضافہ تنخواہ کی التجا، دوستوں یا ذی اثر لوگوں کی اونچے عہدوں پر ترقیاں، کسی طالب علم کا امتیاز سے امتحان پاس کرنا، کسی مسجد کی ترمیم کے لیے عرض داشت اور چلندے کی اپیل، قی پارٹی، وداعی جلسہ، شادی اور دعوتوں کے رقبے، مبارکبادیں، تہنیتیں، کلب کے فوٹو وغیرہ وغیرہ۔

مصنف کی فرض ان مجموعوں سے یہ ہے کہ طلباء کے نصاب میں شریک کیے جائیں، پہلے حصے کو وہ ہائی اسکول کی آٹھویں اور نویں جماعتیں کے لیے موزوں بتاتے ہیں، اور دوسرے حصے کو دسویں (مہتریکولیشن) کے لیے۔ مصنف ایک مشاق اور دیرپا سال شاعر ہیں ان کا بیان ہے کہ ”راقم ۳۵ سال سے اردو کی بقا کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر رہا ہے۔“

مجلوں بنا ہوا ہے جو یہ سرے پاؤں تک لیائی کی شکل کھینچ رہا ہے قلم مہرا“ اس دیرپا تجربے کے مقابلے میں مجال لب کشائی نہیں، تاہم باادب یہ کہنے کی جسارت کی جاتی ہے کہ یہ مجموعے طلباء کی نصابی ضرورتوں کو شاید ہی پورا کریں۔ نظم کے موضوعات بہت وسیع ہیں جن سے طلباء کو اپنی تعلیم کی ابعنائی منزل پر باخبر ہونا لازم ہے۔ اس نصابی مسئلے کا حل اب تک صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ مختلف اساتذہ کے کلام کا انتخاب کیا جائے اور اس طرح طلباء کو ہر استاد کے رنگ سے واقف کرایا جائے۔ اس سے طلباء میں بصورت پیدا ہوتی ہے اور وہ نظم کو سمجھنے اور اس کی اصلی روح سے آشنا ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ کسی ایک شاعر کا کلام پڑھانے سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

سلسبیل

مجموعہ کلام جناب آل احمد صدیقی سرور ایم - اے (عالمگ)
 سلسلہ مطبوعات انجمن اردوے معلیٰ نمبر ۱ کاغذ معمولی -
 کتابت و طباعت اچھی - صفحات ۱۱۲ - قیمت ایک روپیہ -
 ملے کا پتا - درج نہیں -

کسی قوم کے انحطاط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک یہی مشاہدہ کافی ہے کہ
 اس کے افراد میں شعر خوانی اور شعر گوئی میں تمیز باقی نہیں رہتی، یعنی ہر
 شعر خواں شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتا ہے - یہ رجحان ایک خاص قسم کی ذہنیت
 کا پتا دیتا ہے - جہاں ہمارے ملک میں ضبط اولاد اور ضبط نفس کی تحریکیں
 شروع ہو چکی ہیں کاش شعر و ادب میں بھی کسی قسم کا ضابطہ نافذ ہو سکے
 اور کم کردہ راہ شاعر نما حضرات اپنے اصلی دستوں کو پہچان جائیں -
 'نژاد نو' کا ہر شاعر اپنا مجموعہ اس شان کے ساتھ مرتب کرتا ہے کہ
 ورق التقمی ہی اس کی تصویر پر نظر پڑے پھر ایک مرعوب کن مقدمہ اور
 'ہدیہ محبت' ہو - چنانچہ یہ صنعت بھی ان صفات سے خالی نہیں
 ہیں - بقول سرور صاحب ان کا "نظہل کشمیر کی بہاروں میں جوان
 ہوا ہے" - لہذا یہ ہدیہ بھی انہیں بہاروں کے نام ہے - ان نظموں اور
 غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑا 'اے وائے بہارے
 اگر امین صمت بہارے!' نظموں کے علاوہ جن میں سے بیشتر مذاظر کشمیر
 سے متاثر ہو کر لکھی گئیں مولانا محمد علی مرحوم کا ایک مرثیہ اور
 کئی غزلوں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں -

شروع میں رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں
 ایک تعارف تحریر فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "سرور صاحب

اپنے کار ناموں کے اعتبار سے فسانہ عجائب سے کم نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صاحب صدیقی اگر ایک دوسرے کو اپنی تحریریں دکھا لیا کریں تو وہ زیادہ دلچسپ اور شگفتہ ہو جائیں۔ خواجہ صاحب کا پھر ایہ اتنا یک رنگ و ہموار ہے کہ اسے رشید صاحب کا پیچ و خم کسی نہ کسی قدر ملنا چاہیے۔ اور رشید صاحب کے تحریری بھول بہاؤں میں خواجہ صاحب کی سادگی ایک نئی بات پیدا کر دے گی۔

مصورانہ شاعری کے بھی خارجی اور داخلی پہلو ہوتے ہیں۔ یا تو شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گل کاریوں سے چمن بلندی کر دے، پہاڑ کی بلندیوں کو آسمان سے ٹکرا دے، اور دریاؤں میں ایسے بھلور ڈال دے کہ ناظر سمجھے میں آجائے اور سمجھے نہ سکے کہ یہ نظارہ خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔ یا پھر شاعر ان مناظر سے اثر پذیر ہو کر اپنے محسوسات کو یوں بھان کرے کہ سلیے والے پر وہی کھینٹ طاری ہو اور وہ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جائے۔ جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کے کلام میں خارجی منظر کشی کے عمدہ نمونے ملیں گے۔ لیکن پھر نظر نظموں میں شاعر نے اپنے کو آجا کر رکھنے کی اتنی کوشش کی ہے کہ تصویر کہیں نہیں رہی، صرف مصور رہ گیا اور اس کے جذبات میں وہی فرسودہ رومانی کھینٹ ہے جو ہمارے اکثر رومانی نظم نگاروں کا طرز امتیاز ہے۔ ان کی جوانی پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ لادے ہوئے عینک کے وسیلے سے حسن و عشق کی رنگینوں کا جائزہ لے رہی ہے۔ سرور صاحب اپنے ہم عصروں کی طرح اس جوانی کے احساسات کو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں بھی چھپا نہ

سکے - اجنبی ترکہبیں اور ناموزوں بدوشیں جابجا نظر آتی ہیں -

”مرے دل میں بھی ابھریں سی کئی بے ساختہ اُتھیں“ - (صفحہ ۲۷)

لہروں کی بے ساختگی یعنی چہ ؟

حباب احمریں کی شرخیاں فرش زمرد پر

سرا وہ راز جو یوں برملا افشا نظر آیا (صفحہ ۲۸)

دونوں ہی مصرعے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے

سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے -

عروس شعر نے پردہ اُٹھایا دے روشن سے

بڑھے اہل نظر ساغر بکف شاخ نشہیں سے (صفحہ ۴۱)

گویا شاخ نشہیں پر پلچھپوں کی طرح اہل نظر اس ٹاک میں

بیٹھے دھتے ہیں کہ شاعری کی دیوی بے نقاب ہو اور یہ اس کی طرف

پر پھیلا ئیں -

”یا میرے ذوق نظر کی آخری پرواز ہے“ - (صفحہ ۴۷) نظر کی

پرواز بھی ذوق نظر کی پرواز اور وہ بھی آخری پرواز! سلسلہ ناز

پر یہ تازہانہ !

”مگر لبوں پہ یہی ایک دعا نظر آئے“ - (صفحہ ۵۹)

دعا نظر بھی آسکتی ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا -

نظموں میں صرف ایک پرواز خیال اچھی ہے اور اس میں بھی اس

اس قسم کے مصرعوں کی فراوانی ہے ”تمام دیدۂ حیرت بنا ہوا ہوں میں -“

غزلوں پر اصغر گوندوی کا اثر صاف نمایاں ہے اور کہیں کہیں

چکر مراد آبادی کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی ہے - ان دونوں کی

غزلوں پر طبع آزمائی بھی کی گئی ہے اور نتیجہ جس صورت میں

برآمد ہوا وہ ملا خط ہو :

”تارے ’ اچالنے ’ میں میری گرد راہ کر“ (صفحہ ۸۲)

”وہ روشنی ہو رہی ہے دل میں کہ ’ محفل میں جگمگا رہا ہوں“ (صفحہ ۸۷)

”سرور بزم کو اتلا ’ چہکا ’ نہ دوں تو سہی“ (صفحہ ۱۰۱)

”ہزاروں لولوے لالہ لیے بیٹھا“ ہوں محفل میں۔“ ”خرام موج سے“

لولوے تہہ نشیں بہتر۔“

غرض غزلوں سے نظمیں پھر بھی غلیبت ہیں کہ ان گہڑ اور بے چور

ترکھوں کے لیے ان میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکل ہی آتی ہے۔

غزلوں میں وہی چوچلے ملیں گے جنہوں رشید صاحب نے اپنے دیباچے

میں ”شورۂ پشت“ شاعروں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ ان کے عشق کی

داستان ان ابواب میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

پہلا سین: ”ہزاروں لولوے لالا لیے بیٹھا ہوں سیلون میں“۔ (صفحہ ۸۱)

دوسرا سین: ”زیر وزبہ قافلہ صبر و قرار کا“۔ (صفحہ ۹۴)

تیسرا سین: ”پیشانیوں پہ نور حرم لے کے آئے ہیں“۔ (صفحہ ۳)

چوتھا سین: ”اور بڑھتا جا رہا ہے بار سر کو کھا کروں“۔ (صفحہ ۱۰۹)

دراپ سین: ”حضور حسن میں دل باریاب ہونہ سکا“۔ (صفحہ ۸۷)

یہ مختصر سی رویداد ہے ہماری ’شورۂ پشت شاعری‘ کی، جس

کا نمونہ یہ مجموعہ ہے۔

(نا خدا)

خاستان

اثر صہبائی کے کلام کا مجموعہ

صفحات مع مقدمہ و فہرہ - تقریباً ۳۰۰ - کاغذ کتابت و طابعت اچھی۔

تہیت ۲ روپیہ ۸ آنہ ملنے کا پتا - آزاد بک ڈپو، سہالکوت، پنجاب -

جذاب اثر صہبائی پنجاب کے مقبول اور ممتاز نوجوان شاعر ہیں -
خمسٹان ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے - اس میں غزلوں اور رباعیوں
کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی ہیں -

مجموعے کے آغاز میں ”دنہائے ادب کے مایہ ناز ادیب“ (بقول
مصلف) سید سلیمان صاحب ندوی نے جرعہ مئے کے عنوان سے ایک مقدمہ
تحریر فرمایا ہے اور پلذت کہنی صاحب نے بھی اس سلت کی پابندی
کی ہے - سید صاحب نے اس مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ کی
ہے کہ اہل حدیث حضرات شاعر ہوتے ہیں یا نہیں -

مجموعے کا پہلا باب ’تجلیات‘ غزلوں پر مشتمل ہے اور غالباً سب
سے زیادہ طویل ہے - غزل گوئی کی صلف نہایت نازک اور مشکل ہے اور
یوں صلفی اعتبار سے کوئی اس پر عبور حاصل بھی کر لے لیکن خود فراموشی
کا وہ جذبہ کم کو مہسر ہوتا ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے اور جس
کے بغیر غزل بالکل روکھی پھکی رہ جاتی ہے - ہمارا خیال ہے کہ اثر
صاحب کی طبیعت حکمت اور فکر کی طرف زیادہ مائل ہے اور ان میں ایک
خاص قسم کا ضبط ہے - اس لیے اسی صلف میں انہیں جولانی طبع کا زیادہ
موقع ملے گا جو اس قسم کے رجحان کے لیے موزوں ہو - غزل جس قسم
کی صناعتی اور خود فراموشی کی طالب ہے وہ اثر صاحب کو دیتے نہیں
ہوئی - چنانچہ غزلوں میں فی الجملہ بہت کم ایسی ہیں اور ان میں بھی
ایسے اشعار کم ہیں جو دل میں اتر جائیں - ایک طرف ایسی غزل موجود ہے :-

دنہا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنہا عشرت خانہ ہے

اس بزم میں لہکن مہرا بھی ایک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ نے بتخانہ ہے
 ہاں دو ہی سہارے ہیں ان کے - یا موت ہے یا پیمانہ ہے
 ہر شاع جب ایک مستانہ ہے ہر پہول جب ایک پیمانہ ہے
 توبہ! ایسے میں توبہ؟ جب فطرت خود مہفانہ ہے
 کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے ارد مہفانے میں
 کاشانہ ہی مہفانہ ہے مہفانہ ہی کاشانہ ہے

اثر صاحب کی بہترین غزلوں میں سے یہ ایک ہے پھر بھی مقدمہ
 نگار کو بصد تکلف اس کے ہر شعر پر اصلاح دینے کی ضرورت محسوس
 ہوئی - کہیں کہیں ”بخت واڑوں“ (صفحہ ۱۴) جیسی عجیب ترکیبیں
 ملیں گی جو الفاظ کے ترنم کے ساتھ بگل کی آواز کا کام کرتی ہیں -
 اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں کہ سخن
 شناس سوچتے رہ جائیں کہ شاعر کیا کہہ گیا :

جستجوے منزل میں بے قرار و آوارہ
 میں بھی ایک منظر ہوں موجہائے دریا کا
 دھرو محبت کے ہر قدم پہ منزل تھی
 حسن کا تھا آئینہ ذرہ ذرہ صحرا کا

زندگی سرزہ کہ تادم زیست ختم پر آہ آنشیں نہ ہوئی
 آستانے نگاہ سے گزرے مایل بلندی جہوں نہ ہوئی
 کچھ شغل زندگی کے لیے بھی تو چاہیے
 تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

لیکن ایسے اشعار خال خال ہی ہیں -

دوسرا باب بعنوان ’سمن زار‘ نظموں پر مشتمل ہے اور یہاں شاعر

کو اپنے اس نظریۂ شباب کے پھیلانے کا خوب موقع ملا ہے جس کی تشریح وہ پہلے کر چکا ہے :

کیف آفریں ہے یاد جوانی رسوائی و رندی و بت پرستی
چنانچہ یہاں شیب و شباب کی رنگینیاں اہلی پڑتی ہیں - غزلوں
سے کہیں اچھی ہیں ، خصوصاً بہاریہ اور ’’محبت اور موت‘‘ خوب ہیں -
'جام صہبائی' رباعیات کے لیے وقف ہے اور یہ اثر صاحب کا خاص
مہدان ہے - شاید یہ مبالغہ نہیں کہ جگت مومن لال روں اُن جہانی کے
بعد امجد حیدر آبادی اور اثر صہبائی اس اقلیم سخن کے آلہا و دل ہیں -
ہماری شاعری کی بدنصیبی ہے کہ اس کا رکن اول نوحہ خوانی قرار
پاگیا ہے اور ولی دکنی سے لے کر دور حاضر تک کے جس شعر کو دیکھیے
چرخ کج رفتار کو بددعائیں دیتا اور دامن و گریباں کے درپے ہو کر اپنے
افلاس میں زیادتی کرنے پر تلا دھتا ہے - وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی
میں انسان کی تملائیں قدم قدم پر پامال ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل
کا موقع بہت کم ملتا ہے - خصوصاً اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہمارے
نوجوان زیادہ حساس ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ارادوں کی تکمیل
کے تمام راستے بند ہیں اور اس کا رد عمل لامتناہی حزنیت کی صورت
میں ہوگا - اثر صاحب جس افدوہ و ملال کی تاجپہت پی رہے ہیں وہ فطری
نہیں بلکہ ماحولی ہے - امید ہے کہ وہ بہت جلد اس مہلک مرض کو
اپنے دامن سے جھٹک دیں گے اور اس کا آئندہ مجموعہ نوحۂ غم نہیں بلکہ
پیام عمل ہوگا -

کچھ رباعیات درج کی جاتی ہیں جو اثر صاحب کے مخصوص رنگ
میں ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہیں -

صحراے جہاں میں ایک فریاد ہوں میں ظلمات فلک میں برق آباد ہوں میں
جو یارے سکون جاوداں ہوں یعنی ناشاد ہوں بیتاب ہوں بر باد ہوں میں



جو لطف ہے جستجو میں حاصل نہیں لذت جو تگ و دو میں ہے ملزل میں نہیں
وہ منظر زندگی کہ امواج میں ہے کشتی میں نہیں، سکوت ساحل میں نہیں



تاراج خزاں ہوں اور رقصاں ہوں میں گلہائے بہار میں پریشاں ہوں میں
لذات و علم بھی ایک معمہ ہیں اثر خوش رنج میں اور خوشی میں گریاں ہوں میں



ہو جائے وہاں جو مجھ پہ ہستی میری پھر کوئی سنے صدائے مستی میری
معبود ہوں آپ ہی عبادت کس کی؟ ہے بے خبری خدا پرستی میری
خوب کہا —

بہ ایں ہمہ ' شاعر کہیں کہیں جذبات کے تلاطم میں بہہ جاتا اور
ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ مقدمہ نگاروں کے ' مشوروں ' کے باوجود وہ
کانوں کو کھٹکتی ہیں - رہائشات میں فرط بے نیازی سے کبھی کبھی مصرعوں
میں ایسی تکرار ہونے لگتی ہے جو ناگوار معلوم ہوتی ہے :-

" کیوں شکوہ روز گار اے دل اے دل

دنیا تیری ہے میں بھی تیرا، تیرا

مرنا تو میں جانتا ہوں - ہوگا ہوگا "

' راحت کدے ' میں شاعر نے اپنی رفیقہ حیات کی یاد میں جو قطعات
کہے ہیں ان میں سے کئی بہت پر درد ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خلوص
جذبات صحیح صناعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے :

سحر کے روے رنگیں سے نقاب الٹاے جاتے ہیں
 دل محضوں پہ لیکن غم کے بادل چھائے جاتے ہیں
 تمہارے ہجر میں باد صبا ایک آہ غم گئیں ہے
 نہیں تم جلوہ گر ہو پھول بھی مرجھائے جاتے ہیں
 تمہارے غم رہا جلوے عیاں ہیں لالہ زاروں میں
 تمہارے دل نشیں نغمے رواں ہیں آبشاروں میں
 تمہارا روے رنگیں ماہ تاباں میں درخشاں ہے
 تمہاری مسکراہٹ رقص کرتی ہے ستاروں میں

اثر صاحب قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے ہیں
 اور ان کا مستطیل روشن ہے۔ مشق کے ساتھ پختگی آتی جائے گی اور اگر
 ان کے مشاہدے کا دائرہ وسیع ہوگا اور وہ عوام کے دکھ اور اس کے مداوے
 کو سمجھ سکے تو ان کے کلام میں وہ شکستگی ضرور آجائے گی جس کی توقع
 ایک شباب پرور شاعر سے کی جاتی ہے۔

(ناخدا)



(۱) سودیشی اردو (۲) ضروری کہانیاں -

(مصلحہ قاضی عبدالصمد صاحب - کاغذ طباعت و کتابت، فہمیت -

پہلی میں ۳۰ صفحات ہیں اور قیمت چار آنے ہے - دوسری میں

۷۲ صفحات ہیں اور قیمت چھ آنے ہے - ملنے کا پتا - مولوی محمد

ادریس مہر تھی - مکتبہ شرقیہ - دہلی)

دونوں کتابیں اسکول کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی

ہیں اور اس لائق ہیں کہ ہمارے طلبہ انہیں بار بار پڑھیں —

سودیشی اردو سیدانشاکی 'رانی کیتکی کی کہانی' اور ہندی کے مشہور شاعر ہری اودے کی 'تپتہ ہندی کے تہات' کے طرز کی کتاب ہے۔ خوبی یہ ہے کہ فارسی اور عربی کا ایک لفظ نہ ہوتے ہوئے بھی زبان پاکھوہ اور فصیح ہے۔ اگر اس قسم کی کتابیں برابر اشاعت پزیر ہوا کریں تو اس تحریک کو بڑی تقویت ہوگی جو مولویانہ اردو اور پلڈتانه ہندی کی جگہ بول چال کی زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانا چاہتی ہے۔ دوسری کتاب بھی بہت مفید ہے اور اسکی تالیف کا مقصد نہایت مستحسن ہے۔ یہ ہندوستان کے ایسے تاریخی واقعات کا مجموعہ ہے جن سے (۱) اہل ملک میں باہمی محبت اور حب وطن کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ (۲) جن سے اچھا اخلاقی سبق حاصل ہو۔ (۳) جن حکمرانوں کے متعلق بعض اشتعال انگیز واقعات مشہور ہیں ان کے وہ واقعات لکھے جائیں جن سے بدگمانیاں رفع ہوں —

یہ امر کتنا افسوس ناک اور باعث شرم ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں آئے دن ایسی تحریکیں اٹھاتی ہیں جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی جائے اور ایسی تحریروں بکثرت شایع ہوتی ہیں جن میں سے دلوں کی سیاہی کاغذ پر اندلی جاتی اور باہمی ملاقات کی آگ کو ہوا دی جاتی ہے 'وہاں اتحاد و رواداری کا چھلکا برابر خاک ہسٹ رہے اور کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اس خلیج کو پاتلے کی کوشش کریں۔ اس قحط الرجال میں ایسی کوششیں لائق ستائش ہیں —

کہا اچھا ہو کہ ہماری قوم کے نو نہال ان افترا پرداز تاریخوں کو پڑھنے پر مجبور نہ کیے جائیں جو اوائل عمر سے ان کے دلوں میں کھلے و تعصب کے

جذبات پیدا کرتی ہیں - اور اس قسم کی کتابیں ان کے ہاتھ میں ہوں جو
یک جہتی اور قومیت کی روح پھونکیں !
” نا خدا “



منتخب افسانے

مترجمہ سلیم آبادی صاحب - حجم ۵۰۰ صفحات - کاغذ 'کتابت و
طابعات معمولی - قیمت ایک روپیہ - ملے گا پتا
ہلد بک ایجنسی چت رنجن ایونو 'کلکتہ'

مترجم نے مشرق و مغرب کے شہرہ آفاق افسانہ نگاروں کے ۳۸ افسانوں کو
اردو میں منتقل کیا ہے - افسانہ نگاروں یا افسانوں کے انتخاب میں کوئی
خاص التزام ملحوظ نہیں ہے - ترجمے کے متعلق یہ طریقہ اختیار کیا گیا
ہے کہ ” افسانہ نگار کی اسپرٹ کو سمجھ کر اسے اردو کے قالب میں ڈھال
دیا ہے “ - ہمارے خیال میں یہ طریقہ کسی طرح مستحسن نہیں ہے -
جب تک آرٹسٹ کی لغوی اور معنوی خوبیاں برقرار نہ رہیں اس
کے کمال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا - افسانہ ایک unit ہے جس کی
اسپرٹ اگر روح ہے تو پھر ایٹم بھان جسم ہے - ’ قالب میں ڈھالنے ‘ والی
ترکیب سے قصہ ہی قصہ باقی رہ جاتا ہے اور لطف بھان کی تمام نزاکتیں
ضایع ہو جاتی ہیں - ان میں سے کئی افسانے انگریزی میں ہماری نظر
سے گزر چکے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں تامل ہے کہ ترجمہ میں اصل کے
حسن کی ایک جھلک بھی موجود ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تراجم
عربی سے چھن کر اردو میں پہنچے ہیں اور اس صورت میں نگارہں کی
دلکشی کا باقی رہنا محال ہے - ترجمے کی عبارت یک رنگ ہوتے ہوئے بھی
صاف اور سلیس ہے - ایک دو قصوں کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہے مثلاً

شیخ حسن علی تھانہ دار۔ ممکن ہے یہ مترجم کی جدت طبع کے نمونے ہوں۔
 مایح آبادی سے غالباً عبدالرزاق صاحب مایح آبادی کی طرف
 اشارہ ہے جو عربی کی کئی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ مایح آبادی میں
 اردو کے اور بھی ادیب ہوں اس لیے پورا نام نہ ہونے سے شبہ کی
 گنجائش رہ جاتی ہے۔

بہر حال، جو لوگ انگریزی نہیں جانتے انہیں اس کتاب میں
 یورپ کے کامیاب فن کا ایک ہلکا سا عکس مل سکتا ہے۔ ان دوسروں کتاب مہلکی
 ہی نہیں ہے۔ ”ناخدا“



لال قلعہ کی ایک جھلک

مصنفہ۔ خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم دہلوی۔ کتابت و
 طباعت دیدہ زیب۔ حجم ۱۲۵ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔
 مالے کا پتا۔ ساقی بک ڈپو، کھاری باؤلی دہلی۔

فراق مرحوم دہلی کی اس تہذیب و معاشرت کے اٹھلے دار تھے جس کے
 خط و خال انقلاب زمانہ نے بالکل مسخ کر دیے اور اب وہ باتوں خواب معلوم ہوتی
 ہیں۔ ان کے بعد اب کوئی نہیں رہا جو اس خراب آباد کی یاد تازہ کرے۔
 دہلی کی زبان لکھنے میں فراق مرحوم کو ید طولی حاصل تھا اور یہ کتاب
 ان کے مختصر طرز انشاء کا بہترین نمونہ ہے۔ دہلی یہ کتاب شرر کے شاہ کار
 ”گزشتہ لکھنو“ کے جواب میں پیش کر سکتی ہے۔ شاہد احمد صاحب مندر
 ساقی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی کاوش سے یہ مضمون
 لکھوائے اور مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیے ورنہ یہ انمول موتی

ہر نہی بکھرے رہا جاتے۔ قدیم تمدن اور لطف زبان سے شغف رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ باعث مسرت ہوگا۔
”ناخدا“

تایخ و سیر

حیات مسعودی

(نوشتہ مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی - صفحات

۱۶۱ قیمت ایک روپیہ چار آنے)

سالار مسعود غازی (عرف بالے مہاں) کا نام جس قدر مشہور اور زبان زد خلایق ہے اسی قدر ان کے اصل حالات و واقعات تاریکی میں ہیں۔ مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی نے جہاں تک ان کی دسترس تھی مختلف تاریخوں، کتبوں، زبانی روایتوں وغیرہ سے تحقیق کر کے ان کی تاریخ مرتب کی ہے۔ مسعود غازی کے حالات میں صرف ایک ہی کتاب مرآۃ مسعودی ہے، جس میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو ساقط الاعتبار ہیں۔ اگرچہ مولف کتاب ہڈانے اپنی تاریخ کی بہت کچھ بنیاد اسی پر رکھی ہے لیکن انہوں نے تحقیق و تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان تمام قدیم و جدید تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جن میں مسعود غازی کا ذرا سا بھی حوالہ تھا۔ بعض کتابیں جو دستاویز نہیں ہوئیں اور جن کا نام صرف دوسری تاریخوں میں ضمیمہ

آگیا ہے، اس میں مجبوری تھی۔ موجودہ حالات میں قابل مولف کی سعی و محنت لائق تحسین ہے۔

تنی کوٹ محسن

(مولفہ مولوی محمد امین صاحب زبیری - صفحات ۳۰۸ + ۲۵)

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنے، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے) -

اس کتاب میں نواب محسن الملک سید مہدی علی مرحوم کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ لکھنے والے مولوی محمد امین صاحب ہیں جن کو کچھ دنوں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ رہنے کی عزت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ محمد امین صاحب کے تعلق کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب کہ نواب صاحب حیدرآباد سے رخصت ہو کر بمبئی میں قیام فرما تھے۔ لیکن چونکہ خود محمد امین صاحب کو زمانہ دراز تک ایک اسلامی ریاست سے تعلق رہا اس لیے وہ ریاستوں کے معاملات کو خوب سمجھتے ہیں اور انہیں حیدرآباد کے حالات و معاملات کے سمجھنے میں ذرہ بھی دقت نہیں۔ حیدرآباد کے بعد علی گڑھ کالج کا دور شروع ہوتا ہے اور یہیں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کالج کے حالات بھی لائق مولف نے بہت تحقیق سے جمع کیے ہیں یہ گویا اس وقت کے کالج کی صحیح تاریخ ہے۔

اس سے قبل محمد امین صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے لیے بھی نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھی تھی۔ لیکن اب کے انہیں اتفاق سے اور کچھ نواب مسعود جنگ بھادر کی سعی سے نیا مسودہ

ہاتھ لگا ہے جس سے یہ سہرت مکمل ہو گئی ہے۔ آخر میں بعض قسم سے بھی اضافہ کئے گئے ہیں اور بعض انگریزی تحریریں اور خطوط جو اعلیٰ درجے کے انگریزوں نے خاص معاملات پر نواب صاحب کو لکھے تھے بحسن چھاپ دیے ہیں۔ ان میں لارڈ قنن کا خط پڑھنے کے قابل ہے۔

نواب صاحب میں بعض ظاہری اور باطنی ایسی خرابیاں تھیں جو اب شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ چونکہ وہ مختلف حیثیتوں کے جامع تھے۔ اُن کا تعلق ملک اور خصوصاً مسلمانوں کی زندگی اور بہبودی سے تھا اس لیے اُن کی زندگی بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ مولوی محمد امین صاحب نے اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دیا ہے۔



انقلاب فرانس

مصلفہ باری صاحب - صفحات ۱۰۷ - قیمت درج نہیں - کتابت و

طباعت اچھی - ملنے کا پتا - اردو بک اسٹال لوہاری گھٹ - لاہور -

انقلاب فرانس تاریخ عالم کا نہایت اہم واقعہ ہے اور سنہ ۱۷۸۹ ع

مصر جدید کی آفرینش کی تاریخ کہی جاسکتی ہے - آج دنیا میں مساوات

اخوت اور آزادی کے جو پرچم لہرا رہے ہیں اس کی ابتدا اول اول وہیں

سے ہوئی - زیر نظر کتاب میں مصلف نے پہلے تو نشاۃ ثانیہ سے لے کر لوئی

پانزدہم کے عہد حکومت تک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا ہے - بعد ازاں

استعداد کا خاکہ پیش کر کے امکانات انقلاب پر بحث کی ہے - اس ضمن میں

انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا صحیح ہو یا غلط لیکن ہم ان کی انقلاب کی

تعریف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ بادی الظور میں انقلاب

اور بغاوت میں کوئی امتیاز نہیں سمجھتے درآن حالیکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے۔ کروپائکن اپنی تاریخ انقلاب فرانس میں اس تاریخی دوش (Process) کی یوں تشریح کرتا ہے: شہروں اور دیہاتوں کی بے پناہ بغاوتوں سے بھی انقلاب کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے۔ وہ خوفناک سے خوفناک جماعتی لڑائیوں یا حکومت کی تبدیلیوں سے زیادہ دور رس ہے۔ انقلاب نام ہے چشمِ زدن میں ان اداروں کے نیست و نابود ہو جانے کا جو صدیوں سے قائم تھے اور جن کی بلیادوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑے سورما رفاد مر بھی لڑتے تھے۔ انقلاب نام ہے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی ایوانوں کے زمین دوز ہو جانے کا۔ انقلاب تعلقات انسانی اور سماجی اداروں کی قدیم بلیادوں کو تھس تھس کر کے نظامِ زندگی کا ایک نیا ڈھانچا کھوا کرتا ہے۔ پھر اس کے اصول رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلنے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لیے تمدنی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کی نئی شاہراہیں کھول دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے انقلاب فرانس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔

مصنف یہ بتلانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ انقلاب کی تحریک کس ماحول میں نشوونما پا رہی تھی۔ لیکن انقلاب کی قیادت کن ہاتھوں میں تھی اس کے سپاہی کون تھے اس کے مطالبات کیا تھے اور وہ کھوں نہ پورے ہوئے۔ ان اہم سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔

یہ فرانس کا سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب - (Bourgeois democratic Revolution) تھا۔ یعنی یہ سامنتی شکنجوں سے آزاد ہونے کے لیے حرفتی سرمایہ داری کی کامیاب سعی تھی۔ ہر حکومت کا دارو مدار کسی خاص طبقے کے اقتصادی مفاد پر ہوتا ہے اور اس کے استوار ہونے کی ضمانت اس طبقے کے فروغ پر ہے۔ جب کوئی نیا طبقہ اپنی تاریخی فرائض کو پورا کرنا

چاہتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت وقت کو ایسی تشکیل دے کہ وہ اس کے ارادوں میں ہارچ نہ ہو۔ فرانس میں مشینوں کے رواج اور دور حرفت کے آغاز کے بعد یہ ناگزیر تھا کہ فرسودہ نظام حکومت بدل جائے تاکہ اس کی پوش یا افتادہ پایندیاں متوسط طبقے کی راہ میں حایل نہ ہوں۔ اس مہم میں وہ صرف اس وقت فتکیاب ہوتا ہے جب کہ عوام اس کے دوش بدوش استبداد سے لڑیں۔ جب ان کی امداد سے متوسط طبقے نے سالمیت سے نجات حاصل کی تو مساوات، اخوت اور آزادی کے معنی بدل گئے۔ پھر سرمایہ داروں میں ان ارکان ثلاثہ کے مطلب یہ سمجھے جانے لگے کہ آزادی ہو مگر ظلم کرنے کی۔ اخوت ہو لیکن صرف ظالموں میں۔ اور مساوات ضرور ہو لیکن عالم بالا میں۔ لیکن یہ بھی ایک ناگزیر نشان راہ تھا کیونکہ اس زمانے میں وہ شتراکی انقلاب ممکن ہی نہ تھا جس کے سرگرم موئید باری صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ مارکس اور لیٹن نے اپنی کتابوں میں جابجا اور خصوصاً ”پیرس کمیون“ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ ایک بسیط مقالہ کا حاجت مند ہے اور ہم صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتے ہیں کہ اس کتاب کے حدود کو دیکھتے ہوئے اس میں معلومات کا نہیں تو دلچسپی کا کافی مراد موجود ہے۔ طرز تحریر خطابانہ ہوتے ہوئے بھی دلکشن ہے۔ کتابیات میں حسب ذیل کتابوں کا اندراج ضروری تھا۔

(۱) انقلاب فرانس از ہالیدت روز (۲) انقلاب فرانس از مہتلن (۳) انقلاب فرانس از مالیت (۴) انقلاب فرانس از کروپاٹکن (۵) انقلاب فرانس میشلے (۶) انقلاب فرانس از اولارد (۷) انقلاب فرانس از کارلائل —

متفرقات

اردو پوائٹری میں اداس صوبہ متونسط و برادر کا درسی سلسلہ

(عطار چند کپور ایڈٹڈ سنز بک سلیرز ایڈٹڈ پبلشرز لاہور)

اس سلسلے میں اردو کا قاعدہ اور پہلی چار کتابیں شامل ہیں۔ یہ سب کتابیں عمدہ کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہیں۔ قاعدے میں ابھی اصلاح کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ موجودہ صورت میں بچوں کے لیے کوئی سہولت نہیں پای جاتی۔ اعراب کے لگانے میں بھی کوئی خاص اصول مد نظر نہیں رکھا گیا۔ باقی چار کتابیں تعلیمی اور ادبی لحاظ سے بہت مناسب اور معقول ہیں۔ زبان ایسی رکھی گئی ہے جو اس صوبے کے بچوں کے لیے فہر مانوس نہیں۔ بعض اسباق ایسے داخل کیے گئے ہیں جن کا تعلق خاص صوبہ برادر سے ہے اور یہ اس سلسلے کے لیے ضروری تھا۔ علاوہ ادبی اور اخلاقی مضامین کے عام معلومات کے مضامین بھی کافی تعداد میں ہیں۔ موقع سے عکسی اور رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ خاں صاحب خواجہ لطیف احمد صاحب بی۔ اے نے جن کی تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزری ہے، اس سلسلے کو مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف میں خواجہ صاحب نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔

اُردو کے جدید رسالے

انیس

(ادیٹر شرار بی - اے صاحب - سالانہ قیمت - دو روپے آٹھ آنے -

ایلیچ پور ' برار)

یہ ماہانہ رسالہ ایلیچ پور برار سے شایع ہوتا ہے - مضامین مختلف قسم کے اور دلچسپ ہوتے ہیں - اس علاقے میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی - اہل برار کو اس اردو رسالے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے ' وہاں ابھی اردو کا چرچا ہے اور اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے ہر طرح کی سعی درکار ہے -

صبح امید

(ادیٹر مدن کوپال متل صاحب بی - اے - سالانہ قیمت

تین روپے - مقام لدھیانہ)

یہ ماہانہ رسالہ جو ابھی لدھیانہ سے نکلتا شروع ہوا ہے ' ہونہار معلوم ہوتا ہے - سرورق پر "علمی ادبی اور تعلیمی" رسالہ لکھا ہے اور اس مقصد کے نبھانے کے لیے قابل ادیٹر نے ملحد اور دلچسپ دونوں قسم کے مضامین جمع کیے ہیں -

اوقاتِ ملیگیزیں

(ایڈیٹر سعید محمد خان صاحب بھوپالی - کراؤن سائز اردو کے ۲ اور انگریزی

کے ۴ صفحات - کاغذ طباعت و کتابت اچھی - سالانہ قیمت - ۱۲ روپے)

سعید محمد خان صاحب پہلے بھی یہ اخبار نکالتے تھے اور اب علی گڑھ

اور وہاں کی جمعیت کی خدمت کے ارادے سے از سر نو اس کی اشاعت

شروع کی ہے۔ پیش نظر نمبر اس جریدہ کا (experimental) یعنی تجرباتی

نمبر ہے گویا یہ ایک 'محاسن' ہے جس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہے کہ

اتلے خریدار فراہم ہوتے ہیں یا نہیں جو اسے کفیل بالذات بنا دیں۔ اگر ایسا

ہو تو فیہا ورنہ احتمال اس کا ہے کہ ایک "Longing tearful adieu"

'پر حسرت اور اشک فشان الوداع' کے ساتھ وہ ہم سے رخصت ہو جائے گا۔

تاہم وہ اخباری برادری کے لیے ایک نہا پیمانہ چھوڑ جائے گا جس کے

ذریعے وہ اپنی مختصر سی تہیلی کا جائزہ لے سکے گی —

اگر اخبار کا مہوار آئندہ بھی وہی رہے گا جو اس نمبر کا ہے تو ہم ابھی

سے مایوس ہو چکے۔ ادارہ کی انگریزی میں پوپ اور ڈرائیونگ کا اسلوب

اختیار کیا گیا ہے۔ یہ برا نہیں ہے کہ جہاں اردو میں اب بھی طلسم ہوش

رہا اور فسانہ عجائب کی پیروی کرنے والے حضرات موجود ہیں کیوں نہ

انگریزی کا وہ دور زندہ کیا جائے جب ایک ایک جملے میں سو سو بل اور ہر

ہر بل میں ہزاروں پہنچتے تھے —

انگریزی کے چار صفحات میں سے تیرہ صفحہ اُن شقوں کے لیے وقف ہے جو

بعض حکام نے ایڈیٹر صاحب کے خطوط کے جواب میں ارسال کی تھیں۔ یہ علی گڑھ

کی سنت دیرینہ ہے جس کے متعلق کچھ کہنا سوئے ادب سمجھا جائے گا —

شعبہ اردو ایک قصیدہ سے شروع ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کی تعریف میں ہے۔ پھر کچھ خطوط اور 'کیلنڈرے پن' کی باتیں ہیں۔ ایک دو رخی تصویر ہے جس میں سے ایک طرف کچھ کُمام علیگ صاحبان کا گروپ ہے اور دوسری طرف ایک کارٹون ہے۔

اگر واقعاً یہ جریدہ علی گڑھ کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے تو اس کا پھر ایسے زیادہ متین اور سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اسے ان بنیادی مسائل کو پیش کرنا چاہیے جن پر علی گڑھ کی موجودہ سمات اور آئندہ حیات کا دار و مدار ہے۔

(نا خدا)

کھ

— — —

ہمایوں کا روسی ادب نمبر

مئی سنہ ۳۵ ع۔ مرتبہ بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)

حجم - معمولی نمبروں سے کچھ زیادہ —

روسی ادب سے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کی روز افزوں دلچسپی اس ذہلیت کا پرتو ہے جو نظام زندگی کے انتشار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ بے کاری اور افلاس کی گراں باری ادب کو رومانی فضا سے نکال کر حقیقت نگاری کی طرف آنے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔

اس لیے جب ہم نے سنا کہ پنجاب کا ممتاز ماہ نامہ 'ہمایوں' ایک روسی ادب نمبر نکال رہا ہے تو ہمیں خوشی ہوئی اور ہم اس کی اشاعت کے منتظر رہے۔ لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ادارہ نے اس کی ترتیب میں کاوش سے کام نہیں لیا۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں

کہ پورے روسی ادب کا احاطہ ایک آدھ سو صفحات کے رسالے میں کھسے کہا جاسکتا ہے۔ طالسٹائی، دستوویسکی، گورکی یا کسی بھی قابل ذکر ادیب کے تعارف کے لیے اتنا بڑا نمبر مشکل سے کافی ہوتا۔ چاہیے یہ تھا کہ روسی ادب کے ہر دور کا ایک مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا اور ہمیں یقین تھا کہ پیش نظر رسالہ میں کم از کم دور قدیم اور دور جدید پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہوگی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ روسی ادب پر کوئی تلخیصی مضمون نہیں ہے اور جو ایک 'طائرانہ نگاہ' ہے بھی تو اس کی حیثیت ادیبوں کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے گوشوارہ سے زیادہ نہیں! پھر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس ادبی نمبر میں 'بولشویک روس کا پس منظر'، 'لینن خدا کے حضور میں' اور 'روسی تاریخ کے مشہور سلیں' کی اشاعت کا کیا موقع و محل تھا، بنا بریں، 'بولشویک روس کا پس منظر جس مطالعے اور تحقیق کا محتاج ہوگا اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔

یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نمبر پورے روسی ادب کے لیے وقف ہے یا جدید روسی ادب کے لیے۔ اگر کلاسیک ادب کی مثالیں دینا منظور تھیں تو دستوویسکی یا پیشکن کو کہوں کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر طرزِ جدید کو نمایاں کرنا تھا تو گواکی، 'رومیانف'، بیہل یا ایرن برگ کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے مثالوں کے انتخاب میں بھی خوش ذوقی سے کام نہیں لیا گیا۔

مختصر یہ کہ اس نمبر کی ترتیب جلدی میں کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل درجے قلم برداشتہ ہوئے ہیں اور وہ بھی ایک ہی قلم سے۔ اس قلم کی کل نشانی ملاحظہ ہو:

”جنگ کی ستم آفرینوں کی یاد“

اور اس کے ہر ایک صید بسمل کا تصور‘

وابستہ کر دیتا ہے مہرا رشتہ ہمدردی‘

مرتے ہوئے نوجوان دوست اور پیاری بیوی سے زیادہ اہم ہستی کے ساتھ۔“

ایک تو ترجمہ در ترجمہ اور پھر یہ الجھی ہوئی تصویر — ستم

بالاے ستم ہے —

رسالے کے آخر میں ایک دلچسپ فروگزاشت ملے گی۔ ایک نظم اور

ایک اشتہار ساتھ ساتھ چھپے ہیں — جن میں سے نظم کا عنوان ہے

’عشق انوکھی ریت ہے پیارے‘ جواب برآمد ’صرف پاہوں کے لیے‘!

مضامین اور اشتہارات ایک صفحے پر نہ چھاپے جائیں تو اچھا ہو —

امید ہے کہ ادارہ ہمایوں اپنے آئندہ فرانسیسی ادب نمبر میں

ایسی خامیوں کا اعادہ نہ ہونے دے گا —

”نا خدا“

کچی

